بیرم خاں

(تاریخی ناول)

حسین انور

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاهور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز۔ لاہور

قیمت : نو روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

ادبی مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور

فہرست

باب ۱ : جشنِ ہمایونی ۵

باب ۲ : جہاں بجتے ہیں نقارے، وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں ۱۹

باب ۳ : بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است ۳۳

باب ۴ : افتخار مرزا اور صفدر خاں ۴۵

باب ۵ : عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں ۵۷

باب ۶ : محبّت کی خاموش چنگاریاں ہیں ۷۳

باب ۷ : شیرشاہ سوری کا عروج ۸۵

باب ۸ : بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر ۱۱۶

باب ۹ : بیرم خاں کی سیاسی بصیرت ۱۲۵

باب ۱۰ : غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا ۱۴۵

باب ۱۱ : وہ کوئی جا رہا ہے شبِ غم گزار کے ۱۶۹

باب ۱۲ : شہنشاہ ہمایوں کی بہار اور بنگال پر فوج کشی ۱۷۶

باب ۱۳ : بیرم خاں اور ابوالقاسم کی داستانِ محبّت ۲۰۸

باب ۱۴ : صفدر خاں کی وفات ۲۳۲

باب ۱۵ : جمال خاں کی شرارت ۲۴۳

باب ۱۶ : بیرم خاں کی مونگیر میں گرفتاری ۲۶۵

باب ۱۷ : جنگ چونسہ ۲۸۶
باب ۱۸ : بیرم خاں کی قید سے رہائی ۳۰۷
باب ۱۹ : جمال خاں کی بے قراری ۳۲۸
باب ۲۰ : آگرہ میں ایک مرد بزرگ کی آمد ۳۳۷
باب ۲۱ : ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ۳۵۴
باب ۲۲ : ہمایوں کی سندھ میں صحرا گردی ۳۶۷
باب ۲۳ : نغمۂ شادی ۳۸۰
باب ۲۴ : بیرم خاں، ہمایوں کے حضور میں ۳۹۲

باب ۱

جشنِ ہمایونی

آگرہ، کیف و مستی میں ڈوبا ہُوا ہے۔ مسرت اور شادمانی ہر طرف اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ دریائے جمنا کے نیلگوں پانی کی موجوں سے بادِ صبا کے نرم و نازک جھونکے شوخیاں کر رہے ہیں۔ "ہوا میں شراب کی تاثیر" ہے اور بادہ پیمائی میں بادہ نوشی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

شہر میں جگہ جگہ خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ آگرہ "لطف خرام ساقی" سے "جنت نگاہ" ذوق صدائے چنگ سے فردوس گوش بنا ہُوا ہے۔ کوچہ و بازار اسی طرح آراستہ ہیں جیسے کسی گل اندام حسینہ نے عروس کا جوڑا پہن لیا ہے۔ عام گزرگاہوں، بازاروں، چوراہوں پر آدمیوں کا ٹھٹھ لگا ہُوا ہے۔ بہت سے لوگ۔ کوچہ و بازار کی آرائش میں مشغول ہیں۔ رئیس۔ امیر۔ فقیر ہر طبقہ اور گروہ کے لوگ حسبِ حیثیت جشن منانے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ شہر میں چراغاں کا انتظام کیا گیا ہے۔

افتخار مرزا، ایک نہایت خوبصورت گھوڑے پر سوار، شہر کے ان نظاروں سے دل بہلاتا ہُوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے۔ اس کے چلنے کے انداز اور چہرہ و لباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں دُور سے آ رہا ہے اور ابھی ابھی

شہر آگرہ میں داخل ہُوا ہے! لیکن اس کے باوجود وہ شہر کی سجاوٹ اور آراستگی سے مطلق متاثر یا حیران نہیں۔ بلکہ دیکھنے والے اس کے جوان و شاداب چہرے پر مسرت اور شادمانی کی لہروں کو دیکھ کر یہ بخُوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اس جشن کی وجہ انعقاد سے اچھی طرح واقف ہے۔ افتخار مرزا کا رُخ۔ شاہی محلّات کی جانب ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔ اِک موج رنگ و نُور نظر آتی ہے اور کیف و مستی کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ شاہی محلات کی آراستگی کا عالم ہی کچھ اور ہے۔ دیواروں پر سنہرا پانی چڑھایا گیا ہے! اعلیٰ درجہ کے منقّش جھاڑ و فانوس اور خوش رنگ ہانڈیاں لگی ہُوئی ہیں دیواروں پر حسین کنول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ بہترین تصویریں آویزاں ہیں۔ تصویریں کیا ہیں۔ گویا حورانِ جنّت کی عکسی شبیہیں ہیں۔ شاہی دولت سرا کے زرق برق کمروں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے آکر مشام جان کو معطّر کر رہے ہیں ستونوں سے بہتی ہُوئی خُوش رنگ بیلوں کی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا مہکی ہُوئی ہے۔ گلدانوں میں قرینے سے لگے ہُوئے گلدستے عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ ہر محل کے آگے۔ ایک پائیں باغ ہے جس میں سنگِ مرمر کے حوض بنے ہُوئے ہیں اور جس میں سونے اور چاندی کے فوارے نصب ہیں —— پانی ان فواروں سے اُچھل اُچھل کر اس تمام فضا کو رنگین تر بنا رہا ہے۔

افتخار مرزا شاہی محلّات سے گزرتا ہُوا "طلسم" کے پاس پہنچا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ شہزادہ ہمایوں جو ایک دن کے بعد محمد نصیرالدین ہمایوں شہنشاہ غازی ہونے والے تھے۔ وہ اس وقت اسی طلسم میں مقیم تھے —— پھاٹک

تک پہنچتے ہی خدام نے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑلی۔ افتخار مرزا گھوڑے سے نیچے اُترا اور گھوڑے کو سائیس کے حوالے کر دیا گیا۔ خود افتخار مرزا خادموں کی معیت میں ایک انتہائی شان دار اور مکلف کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اُس نے جلد اپنا سفری لباس اتارا۔ درباری لباس زیب تن کیا اور شہزادہ عالی وقار کی قدم بوسی کے لیے تیار ہوگیا۔ افتخار مرزا شاہی خدمت گاروں کے جلو میں آگے بڑھ رہا تھا۔ سامنے اس کو ایک بڑا ہشت پہلو کمرہ نظر آیا۔ اُس کے چاروں طرف زردوزی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس طلسم کے مغرب کی جانب دیوانِ خاص، مشرق میں باغ، جنوب کی سمت باغ مثمن کلاں اور شمال میں باغ مثمن خورد واقع ہیں۔ ان تینوں عمارتوں میں بالاخانے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک کو "خانۂ دوست" دوسرے کو "خانۂ سعادت" اور تیسرے کو "خانۂ مراد" کہتے ہیں۔

شہزادہ ہمایوں بڑے کمرے میں تشریف فرما ہیں۔ افتخار مرزا کمرے میں داخل ہوا کمرے کی سجاوٹ اور آرائش صاحبِ مکان کی بلند شخصیت کا پتہ دے رہی تھی۔ کمرے میں ایک مرصع تخت بچھا ہوا تھا۔ اس کے اُوپر نیچے زردوزی پردے پڑے تھے کہ نگاہ ان پر نہ ٹھیرتی تھی۔ تمام کمرے میں نہایت نفیس، گدگدے اور اعلیٰ درجے کے قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ سامنے دیواروں پر تصویریں اور کنول سجے ہوئے تھے۔ نہایت بیش قیمت ساز و سامان سے تمام کمرہ مزین تھا قالینوں پر کارچوبی مخمل کی مسندیں اور سنہرے بیل بوٹوں کے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سارا کمرہ شیشہ آلات کی چمک سے جگمگا رہا تھا اور فضا خوشبویات سے مہکی ہوئی تھی۔

شہزادہ ہمایوں اسی مکلف کمرے میں ایک مرصع تخت پر بیٹھے تھے۔ اُن کی

داہنی جانب بیرم خاں تھے۔ جیسے ہی افتخار مرزا کی نظر شہزادہ ہمایوں پر پڑی۔ وہ تعظیماً جُھک گیا۔ اور کورنش بجا لایا۔ شہزادے نے حسین و خوب رو گانے والیوں کی طرف دیکھا زندگی مستی نغمگی کا سیلاب رُک گیا۔ شہزادہ ہمایوں نے افتخار مرزا کو اپنے پاس بائیں جانب تخت پر بٹھا لیا اور یوں مخاطب ہُوا۔

شہزادہ ہمایوں : افتخار مرزا! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔
ہم سوچ رہے تھے کہ اگر تم وقت پر نہ آسکے تو ہم جشن کے اس مبارک موقع پر اپنے ایک اچھے ساتھی کی محبّت سے محروم رہیں گے!

افتخار مرزا - شہزادہ محترم! میں ہمیشہ اپنی قسمت پر ناز کروں گا جس نے مجھ کو آپ کے دامن سے وابستہ کر دیا۔ آپ کی غلامی، میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ جس کو آپ جیسا مربی اور مہربان مل جائے، اس کو اور کیا چاہیے؟ میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا وہ اِنھیں قدموں کی بدولت ہے۔ شہزادۂ عالم! آپ نے مجھے بتایا کہ مصیبت میں ہمّت و استقلال سے کس طرح کام لیا جاتا ہے؟ دشمن پر قابو پانے کے بعد اس کو کس طرح معاف کر دیا جاتا ہے؟ شرافت کس کو کہتے ہیں؟ ہمدردی کا مفہوم کیا ہے؟ انسانیت کا بلند مقام کیا ہے؟ اگر میں تمام عمر بوعلی سینا اور ارسطو کو پڑھتا رہتا تب بھی علم اخلاق کے وہ نکتے میری سمجھ میں نہ آتے۔ جو آپ کی ہمراہی میں مجھ پر منکشف ہو گئے۔
شہزادہ عالم! میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ اس جشن کے موقع پر حضور کی خدمت عالی میں حاضر ہو گیا۔ کتنی خوش نصیب ہیں یہ آنکھیں۔ جو حضور کے سر مبارک پر حکومت ہندوستان کا چمکتا اور دمکتا ہُوا تاج دیکھیں گی۔ کتنی ہی خُوش قسمت ہیں یہ

نگاہیں، جو حضور کو عالمِ شہزادگی سے لباسِ شہنشاہی میں جلوہ گر دیکھیں گی۔ کتنا خوش قسمت ہے یہ دِل، جو حضور کی خوشی میں مسرور ہوگا۔ کتنی خوش نصیب ہے یہ زبان جو حضور کی تعریف و توصیف کرے گی اور کتنے خوش نصیب ہیں یہ ہاتھ جو شہنشاہ ہمایوں غازی کی نصرت کریں گے۔ اور یہ کان جو حضور کی زبان مبارک سے احکاماتِ شاہی سُنیں گے۔ اور کتنے قسمت والے ہیں یہ لب جو ہمیشہ حضور کی سلامتی و کامرانی کی دُعائیں مانگتے رہیں گے۔

شہزادہ ہمایوں : بیرم خاں! تم نے دیکھا۔ افتخار کو ہم سے کس درجہ اُنس ہے۔ اور وہ کس طرح ہماری خوشی کو اپنی خوشی بنائے ہوئے ہے!

بیرم خاں : جی ہاں۔ جہاں پناہ۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ سب آپ کی جاذبِ نظر شخصیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے —— آپ انسانیت کے مقام بلند پر فائز ہیں۔ آپ کے مراحمِ خسروانہ نے ہر دل کو اپنا بندۂ بے دام بنا رکھا ہے۔ آپ کی وسیع النظری۔ خوش خلقی اور لُطف و عنایت نے ہر دل کو مسخر کر لیا ہے۔

شہزادہ ہمایوں : بیرم خاں! تم اور افتخار مرزا۔ دونوں ہمارے خاتمِ دل کے بہترین نگینے ہو۔ تمھاری قدر و قیمت ہم جانتے ہیں۔

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! یہ سید مہدی خواجہ نے کیا ہنگامہ مچا دیا تھا؟

شہزادہ ہمایوں : رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

افتخار مرزا : خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ اُس کے شر سے محفوظ رہے۔

شہزادہ ہمایوں : ہم سنبھل سے اسی لیے اتنی جلد آگرہ پہنچ گئے کیونکہ ہم کو

بڑی متوحش خبریں مل رہی تھیں۔

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! اس فتنہ کا سرغنہ کون تھا؟

شہزادہ ہمایوں : اگر ہم تم کو اُس کا نام بتا دیں تو تم یقیناً انگشت بدنداں رہ جاؤگے!

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! ہم نمک خواروں کا یہ فرض ہے کہ ایسے سرکش اور مفسد عناصر سے باخبر رہیں، جو ہمارے ولی نعمت کے درپئے آزار ہیں۔

شہزادہ ہمایوں : افتخار مرزا! یہاں وہی "سعدی از دست خویشتن فریاد" والا مسئلہ ہے۔ وہ بھی کوئی غیر نہیں۔ بلکہ اپنا ہی ہے۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے مضطرب ہو۔ اچھا سُنو وہ خواجہ خلیفہ ہیں!

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ کیا یہ وہی خواجہ خلیفہ ہیں، جو فردوس مکانی حضرت جلال الدین محمد بابر کے دست راست اور معتمد خاص تھے۔ کیا یہ وہی خواجہ خلیفہ ہیں جنھوں نے فردوس مکانی کے شانہ بہ شانہ رہ کر ہندوستان میں سلطنتِ مُغلیہ کی بُنیاد ڈالی اور حکومت کو مستحکم کیا۔ کیا یہ وہی خواجہ خلیفہ ہیں جو ایک اچھے رفیق اور ہمدرد کی طرح مصیبت و آرام، خُوشی و غم، رزم و بزم غرض کہ ہر اچھے اور بُرے حالات میں سائے کی طرح فردوس مکانی کے ساتھ رہے؛ کیا فردوس مکانی نے ان کو وزیر اعظم سلطنتِ مُغلیہ نہیں بنایا؛ کیا فردوس مکانی کو ان پر پُورا اعتماد نہ تھا؛ کیا مرتے وقت تک فردوس مکانی ان پر جان و دل سے فدا نہ تھے؛ کیا شہزادہ عالی وقار نے کبھی اُن کی خاطر شکنی کی؛ پھر کیا بات تھی کہ وہ شخص جس کی رگوں میں سلطنتِ مُغلیہ کی بہبُودی اور بھلائی کا خُون دوڑ رہا تھا وہ

ایک دم تخت بابری کو اس کے وارث حقیقی سے محروم کرنے پر آمادہ ہو گیا اور بابر کے چشم و چراغ سے چشم پوشی کرنے لگا؟

بیرم خاں : شہزادۂ مکرم! اس کو اس مرد بزرگ کی شومئی قسمت کے علاوہ اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ وہ بڑے نکتہ رس، دُور بین اور زیرک انسان ہیں۔

شہزادہ ہمایوں : بیرم خاں! لالچ اور خود غرضی بعض اوقات انسان سے ایسے کام کرا لیتی ہے جس کا شان و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی حال خواجہ خلیفہ کا ہُوا۔

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! خاکسار اس اجمال کی تفصیل چاہتا ہے!

شہزادہ ہمایوں : افتخار مرزا! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا، حضرت جنت مکانی کے ہم رکاب رہے۔ میدانِ جنگ شہنشاہ بابر کا گھر تھا۔ جہاں اُن کو بڑا سکون ملتا تھا۔ تلواروں سے کھیلنا، جنگ کے شعلوں میں گھرے رہنا، گھوڑے کی پشت پر کئی کئی دِن تک بیٹھے رہنا اور بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانا یہی ان کا شعار تھا۔ میں اُس دلیر اور نڈر باپ کا بیٹا ہوں۔ فردوس مکانی نے مجھے تربیت دی ہے۔ وہ شروع ہی سے مجھ پر دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ مہربان تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی جنگ میں بھی میں جنت مکانی کے شانہ بہ شانہ افغانوں اور لودھیوں سے لڑتا رہا۔ اس کے بعد شہنشاہ بابر نے مجھے اور مہمات پر بھیجا۔ کالنجر میں میں نے جو کامیابی حاصل کی اس سے کون واقف نہیں۔ لیکن ایک واقعہ ایسا گزرا جس پر جنت مکانی مجھ سے ناراض ہو گئے۔ مجھے شہنشاہ نے قندھار کا گورنر بنا کر

بھیجا تھا۔ میں بغیر شہنشاہ بابر کو مطلع کیے قندھار سے آگرہ چلا آیا۔ اس پر شہنشاہ بابر برہم ہُوئے۔ لیکن اُن کا غصّہ جلد اُتر گیا اور انھوں نے میرے قصور کو معاف کردیا اور مجھے سنبھل کا حاکم بنادیا۔ شاید اسی واقعے سے خواجہ خلیفہ نے یہ غلط اندازہ لگایا کہ میں شہنشاہِ ہند بننے کے لائق نہیں اور اسی بنا پر انھوں نے مجھے تخت و تاج سے محرُوم کرنے کی سازش کی۔

بیرم خاں : اگر خواجہ خلیفہ کی شخصیت اس سازش میں شریک تھی تو وہ کامیاب کیوں نہ ہو سکی۔

شہزادہ ہمایوں : بیرم خاں! خواجہ خلیفہ نے اس میں اصُولی غلطی کی اگر وہ مجھ کو شہنشاہ کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہتے تھے تو شہزادہ ہندال، شہزادہ کامران مرزا اور شہزادہ عسکری مرزا میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیتے۔ لیکن انھوں نے نسل بابری کو الگ کر دیا اور ان کے مقابلے میں سید مہدی خواجہ کو لا کھڑا کر دیا۔ لیکن ہماری خُوش قسمتی یا خود سید مہدی خواجہ کی بدنصیبی کہ وہ خود اس معیار پر پُورا نہ اُتر سکا۔ اور جن ہاتھوں نے اس کو سلطنتِ مُغلیہ کا تاج و تخت عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا وہی ہاتھ اس کو طوق و سلاسل میں باندھنے کے موجب بن گئے۔

افتخار مرزا : شہزادۂ عالم! ذرا اس کی وضاحت کر دیجیے۔

شہزادہ ہمایوں : افتخار مرزا! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ حضرت فردوس مکانی عرصے سے بیمار تھے۔ اور جب تک وہ تندرست رہے، ملک کے اندرُونی حالات کے پیشِ نظر اُن کو اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ ملک کے نظم و نسق کو سنبھال سکیں۔

اس لیے انھوں نے ملک کے اہم امور کو خواجہ خلیفہ کے سپرد کر دیا۔ اس طرح خواجہ خلیفہ کی قوت اور قدرت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ قوت، اہلیت اور اقتدار میں اپنے آپ کو خود شہنشاہ کا ہم پلہ خیال کرنے لگا۔ اس کے سر میں غرور سما گیا کہ جب یہ حکومت میرے ہی دم قدم سے قائم ہے تو شہنشاہ بابر کی آنکھیں بند ہونے کے بعد سلطنتِ مُغلیہ کو کسی ایسے شخص کے حوالے کیوں نہ کر دیا جائے جو میرے چشم و ابرو کے اشارے پر رقص کر سکے۔ اس کے لیے سید مہدی خواجہ سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ مہدی خواجہ غرور کا پُتلا اور نہایت بد دماغ آدمی تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ خواجہ خلیفہ نے اپنے حلقے کے چند ایرانی اور ترکی امرا اور منصب داروں کو یہ اشارہ دیا کہ مہدی خواجہ مستقبل قریب میں شہنشاہ دہلی بن جائے گا۔

بیرم خاں: شہزادۂ عالم! پھر یہ مہدی خواجہ قید کیسے ہو گیا؟

شہزادہ ہمایوں: یہ اور بھی دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک عرصے تک خواجہ خلیفہ اور مہدی خواجہ ملتے رہے۔ مہدی خواجہ کو اب یقین ہو گیا کہ بابر کی آنکھ بند ہوتے ہی اُس کو تختِ حکومت پر بٹھا دیا جائے گا۔ وہ دیر تک حکومت کے نقشے بناتا اور اپنے آپ کو آزاد حکمران سمجھتا تھا۔ ایک دن خواجہ خلیفہ نے سید مہدی خواجہ سے کہا "میں تم کو سلطنتِ مُغلیہ اس لیے سپرد کر رہا ہوں کہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم امورِ مملکت میں دخل نہ دینا بلکہ اپنے کام سے کام رکھنا جب تک میں زندہ ہوں، تم کو کسی قسم کی کوئی فکر اور تردد نہ ہونا چاہیے" سید مہدی خواجہ چونکہ خواجہ خلیفہ کی وجہ سے بادشاہ بن رہا تھا اس لیے یہ کڑوے گھونٹ پی گیا لیکن

اُسی وقت شہنشاہ بابر کا ایک قاصد آیا اور کہا کہ فردوس مکانی نے خواجہ خلیفہ کو یاد فرمایا ہے۔ سید مہدی خواجہ، خواجہ خلیفہ کو دروازے تک چھوڑنے آیا۔ دونوں آگے آگے جا رہے تھے اس کے پیچھے خواجہ خلیفہ کا ایک معتمد خاص بھی تھا جو خاص ادب سے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ خواجہ خلیفہ رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ پوری طرح سے آنکھوں سے اوجھل نہ ہُوا تھا کہ مہدی خواجہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اُس نے اُونچی آواز میں کہا:

"او ذلیل بڈھے! گویا تو اس طرح میرے اُوپر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت مصلحت یہی تھی کہ میں خاموش رہا۔ میں ذرا بادشاہ ہو جاؤں تو تجھ کو تیری اس جسارت کا مزا چکھاؤں گا۔"

جب وہ یہ بات کہہ کر اور اپنے دل کا غبار نکال کر واپس مُڑا تو اس کو خواجہ خلیفہ کا معتمد سامنے کھڑا ہُوا نظر آیا۔ اُس نے قہر بھری آنکھ معتمد پر ڈالی اور اپنی تلوار پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ معتمد بھی بڑا عیّار تھا۔ فوراً سید مہدی خواجہ کے پاؤں پر گر پڑا اور کہا:

"سید صاحب! میں آپ کو جہاں پناہ سمجھتا ہوں۔ شہنشاہ کا راز خدا کا راز ہوتا ہے۔ مجھ پر اعتماد کیجیے ورنہ ابھی اپنی تلوار سے قتل کر دیجیے۔"

سید مہدی خواجہ کا کاسہ غرور سے بھر گیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے لیے 'شہنشاہ' اور 'جہاں پناہ' کے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے وہ خواجہ خلیفہ کے معتمد سے خوش ہو گیا۔ اس کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور یقین دلایا کہ بادشاہ ہونے پر وہ اس کو مالا مال کر دے گا۔ معتمد یہاں سے بچتے ہی سیدھا خواجہ خلیفہ

کے پاس گیا اور رو رو کر تمام واقعہ بیان کیا اور کہا "آپ جس شخص پہ اتنا بڑا احسان کر رہے ہیں، وہ اتنا کم ظرف ہے کہ آپ ہی پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے!"

اس پر خواجہ خلیفہ نے منہ پیٹ لیا اور کہا "میں نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا ہوں۔ افسوس میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں نے ہمایوں مرزا کے مقابل میں ایک ایسے ذلیل انسان کو لا کھڑا کر دیا۔ میں نے عمر بھر سلطنتِ مغلیہ کو اپنے خونِ دل سے سیراب کیا، لیکن آخری وقت چہرے پر جو سیاہی لگنی تھی وہ لگ چکی"

معتمد : ولی نعمت! شہنشاہ بابر بیمار ہیں۔ شہزادے یہاں سے دُور ہیں۔ سید مہدی خواجہ روز بروز اپنی طاقت بڑھا رہا ہے۔ اس لیے اس کے برسرِ اقتدار آجانے کے امکانات قوی ہیں۔ حضور مناسب یہی ہے کہ آپ اس فتنے کا سر کچل دیں۔ ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ہمایوں کو طلب کریں اور حق دار کو اُس کا حق دے دیں۔ ابھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ فتنہ بڑھ گیا، تو پھر ہم سب مل کر بھی اس کو ختم نہیں کر سکتے!

خواجہ خلیفہ نے اپنے معتمد کی بات مان لی۔ خواجہ خلیفہ کو اپنی حماقت پر سخت افسوس ہوا۔ انھوں نے جس کو گوہر سمجھا تھا، وہ پتھر سے بھی کم حقیقت نکلا۔ اُس نے فوراً اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ اور پُرانی وفاداری پر لوٹ آیا۔ ہم کو اس نے فوراً سنبھل سے بُلا بھیجا۔ اور سید مہدی خواجہ کو نظر بند کر دیا۔

بیرم : شہزادۂ عالم! یہ سب منجانب اللہ ہے۔ وہی ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ اُس کی مشیت یہی تھی کہ آپ اس ملک کے فرماں روا بنیں۔ یہ حقیقت ہے ؎

دُشمن اگر قویست نگہباں قوی تر است

افتخار مرزا : بے شک اللہ نے اپنا بڑا فضل کیا ورنہ اگر سید مہدی خواجہ حماقت نہ کرتا تو خدا معلوم اس سازش کا کیا انجام ہوتا۔

شہزادہ ہمایوں : ہاں۔ ہم سب کو اُسی کا شکر ادا کرنا چاہیے جو خالقِ بلند و پست ہے۔ اُس نے ملک کو عظیم فتنہ و فساد سے بچا لیا۔ خیر چھوڑو اس قصے کو بیرم خاں۔ ہم تم سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں۔

بیرم خاں : شہزادۂ عالم! یہ آپ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ آپ حکم دیں۔ بندہ ہر ممکن خدمت کے لیے تیار ہے۔ میری حیات کا اس سے بہتر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ وہ حضور کے کچھ کام آسکے!

شہزادہ ہمایوں : بیرم خاں! کل اہلِ آگرہ جشن منائیں گے۔ شہر میں چراغاں ہوگا۔ توپیں سر ہوں گی۔ ہمارے نام کا خطبہ اور سکّہ جاری ہوگا۔ دربارِ عام ہوگا۔ خلعت اور انعامات تقسیم ہوں گے۔ نذریں گزرانی جائیں گی۔ خلقت کا اژدہام ہوگا۔ ہماری سلامتی کی دُعائیں مانگی جائیں گی۔ ہر شخص خُوش ہوگا۔ لیکن ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم یہ عظیم ذِمّہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھا بھی سکیں گے یا نہیں؟!!

بیرم خاں : شہزادۂ عالم! جب خُدا نے آپ کو اس تاج و تخت کے لیے منتخب کیا ہے تو وہی آپ کو وہ عزم و ارادہ بھی عطا کرے گا اور وہی امورِ مملکت میں آپ کی مدد اور رہنمائی کرے گا۔ مگر حضور ابھی مجھے کوئی حکم دے رہے تھے!

شہزادہ ہمایوں : ہاں بیرم خاں! کل کے بعد ہماری ذِمّہ داریاں بہت بڑھ جائیں گی۔ کل سے مخلوقِ خدا کی خدمت ہمارا شعار ہوگا۔ بندگانِ خدا کے

ساتھ عدل و انصاف کرنا، ملک کو بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنا، ملک میں امن و امان قائم رکھنا، یہ ایسے مسائل ہیں جن میں پھنس کر انسان خود کو بھول جاتا ہے!

آج ہماری شہزادگی کا آخری دن ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ وقت فکرِ فردا سے بے نیاز ہو کر گزاریں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بیرم خاں سے کچھ سنیں۔

بیرم خاں: شہزادۂ عالم کی عزّت افزائی کا شکریہ!

تھوڑی دیر میں تمام فضا نغموں سے بھر گئی۔ بیرم خاں کی سُریلی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ بیرم خاں گا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری مرتبہ اپنا کمال دکھا رہا ہے۔ شہزادہ ہمایوں اور افتخار بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے۔ بیرم خاں نے حافظ کی یہ غزل چھیڑ دی:

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دورِ شاہ ہمایون است مے دلیر بنوش
شد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگِ جنگ بگوئیم آں حکایت ہا
کہ از شنیدنِ آں دیگِ سینہ میزد جوش
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش

بیرم خاں کی آواز اور حافظ کی غزل، بزم میں کہرام مچ گیا۔ مرحبا اور

احسنت کی آوازوں سے تمام محل گونج گیا۔ شہزادہ ہمایوں نے خود بہت تعریف کی اور یہ رنگینی و مستی کا سیلاب حسن وعشق کی دل کش وادیوں میں چلا گیا۔

باب ۲

جہاں بجتے ہیں نقّارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

آگرہ کی ایک نواحی بستی میں دُور تک کچے پکے مکانات کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ہر شخص اس کو ایک نظر دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہاں شہر کی وہ غریب آبادی رہتی ہے جس کے پاس شہر آگرہ میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے اور بہت نیچے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ مکانات زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جس پر پنڈول وغیرہ پوت دیا گیا ہے۔ چھتیں بہت نیچی ہیں اور کہیں کہیں پھونس کے چھپّر بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں سڑکیں وغیرہ برائے نام ہیں۔ گلیاں بہت گندی اور مختصر ہیں۔ ہر جگہ کوڑے کرکٹ کا انبار لگا ہوا ہے۔ جگہ جگہ، گھر کے باہر بھینسیں وغیرہ بندھی ہوئی ہیں۔ بستی میں کئی جگہ پکے کنوئیں بنے ہوئے ہیں۔ راستے ناہموار ہیں اور جگہ جگہ پر گڑھے نظر آتے ہیں جس میں برساتی پانی جمع ہو کر گندگی کو اور بڑھا رہا ہے!

اس بستی کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا کچا مکان بنا ہوا ہے۔ مکان میں صرف دو کمرے ہیں۔ یہ مٹی بھی جگہ جگہ سے اُکھڑ گئی ہے اور دیواریں جگہ جگہ غار سے بن گئے ہیں۔ کمرے کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مفلسی اور فاقہ کشی منہ کھولے کھڑی ہے۔ ایک کمرے میں ایک بانس کی چارپائی پر ایک

خوش رنگ مگر ادھیڑ عمر کی عورت موت و حیات کی کش مکش میں مُبتلا ہے۔ اور ایک تیرہ سال کی لڑکی جو حسن و جمال کا نادر نمونہ ہے اُس کے پاس سر جھکائے بیٹھی ہُوئی ہے۔ لڑکی کے چہرے پر گہرے فکر کے آثار ہیں۔ وہ سوچ رہی ہے "یہ کیا انقلاب ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں ایک شان دار مکان میں رہتی تھی۔ گھر پر ہاتھی جھُومتے تھے۔ سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ گھر میں کنیزوں، باندیوں اصیلوں کی ریل پیل تھی۔ لیکن اچانک یہ کیا ہوگیا۔ وہ سب مال و دولت کیوں ضبط ہوگیا۔ ابّا حضور کیوں روپوش ہوگئے ——— ہم یہاں کیوں بے بسی، مُفلسی اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سب مُغلوں کی نحوست ہے۔ مُغلوں نے صرف ابراہیم لودھی ہی کو شکست نہ دی، بلکہ ہم سب کو حیات کی بازی میں مات دے دی۔ ہر افغان اور لودھی خاندان پر اس کا اثر ہُوا۔ لاکھوں لوگ ہماری طرح دانے دانے کو محتاج ہوگئے اور جو پہلے مفلس اور مفلوک الحال تھے، آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں ان کمبخت مُغلوں نے ہندوستان کی سرزمین کو اپنے ناپاک وجُود سے بھر دیا۔ اُنھوں نے ہماری جائدادیں ضبط کیں اور ہم کو گھر سے بے گھر کر دیا۔

یہ مُغل بڑے ظالم ہیں۔ اگر مجھے کوئی مُغل مل جائے تو میں اُس کی بوٹیاں چیل اور کوّوں کو کھلا دوں! ان مغلوں نے اپنے شہنشاہ ہمایوں کا کیسا شاندار استقبال کیا اور کیسے دھوم دھام سے ان کا جشن منایا جا رہا ہے۔ احمد فیل بان کہتا تھا کہ شہنشاہ ہمایوں نے ان تین دن میں اتنی دولت تقسیم کی کہ ہر فقیر کو غنی کر دیا۔ کمبخت خود بھی جھولی بھر کر اشرفیاں لایا ہے۔

تب ہی ایسی بکواس کرتا ہے۔ ورنہ ہمارے گھر میں تو ایک شاہ کُنجی بھی نہ آسکی۔ کیا ہم اس بادشاہ کی رعیت نہیں؟ کیا ہم اس شہر کے رہنے والے نہیں؟ کیا ہم کسی مسرت و خُوشی کے مستحق نہیں؟ یہ سوچتے سوچتے اس کا دماغ اپنی بیمار اور ضعیف ماں کی جانب پھر گیا۔ یہ کیا انصاف ہے کہ باہر روپے کی بارش ہو اور ہم یہاں دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ تمام شہر میں لنگر جاری ہے۔ کھانے کی ہزاروں لاکھوں دیگیں تقسیم کی جارہی ہیں۔ لیکن میری غریب ماں کب سے بغیر دوا اور غذا بیہوش پڑی ہے۔ شہر میں چراغاں کا اہتمام ہے اور ہمارے یہاں روشنی کرنے کے لیے ایک شمع بھی نہیں۔ خدا معلوم ابا حضور کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ ہم کو ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے نجات کیوں نہیں دلاتے۔ کمرے میں دھندلکا طاری تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ چراغ کی مدھم لَو تھرتھرا رہی تھی۔ اچانک مریضہ نے اپنی نحیف آواز میں پکارا۔

مریضہ : بیٹی ناہید! ذرا میرے پاس آ۔

ناہید : امی جان! میں آپ ہی کے پاس بیٹھی ہُوں۔

مریضہ : بیٹی میرے سینے سے لگ جا۔ بیٹی اب میں اس دُنیا میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکوں گی۔ میرا سانس رُک رہا ہے اور دم گھٹا جارہا ہے۔

ناہید : امی جان! خدا کے لیے ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیے۔ مجھے رونا آرہا ہے۔

مریضہ : بیٹی ناہید! میرا وقتِ آخر آگیا ہے۔ میں جارہی ہوں۔ یہ سفر سفرِ آخر ہے۔ میں جہاں جارہی ہوں۔ وہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ بیٹی میں

چند منٹ کی مہمان ہوں۔ بیٹی! مجھے یہی فکر ہے۔ کہ اس مفلسی، تنہائی اور فاقہ کشی میں میرے مرنے کے بعد تیرے دل پر کیا گزرے گی۔ مریضہ نے رونا شروع کر دیا اور ناہید بھی سسکیاں لینے لگی۔ مریضہ نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ بیٹی! میری یہ باتیں غور سے سُنو۔ تمھارے باپ صفدر خاں، مُغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کی تدبیروں میں لگے ہُوئے ہیں۔ بیٹی میں نے یہ دُکھ درد، تکلیفیں اور اذیتیں اس لیے برداشت کیں کہ شاید تمھارے باپ پٹھانوں کے عہدِ رفتہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ پٹھانوں کو بابر کی موت نے ایک آخری موقع دیا ہے۔ اگر وہ شہنشاہ ہمایوں سے بھی ہار گئے تو پانی پت کے میدان میں پٹھانوں کی عظمت کا غروب شدہ آفتاب پھر کبھی طلوع نہ ہو سکے گا۔

ناہید: امی جان! آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہی ہیں۔ میں اس خوفناک تنہائی میں اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں گی۔

مریضہ: بیٹی صبر کرو۔ دیکھو۔ اگر تم نے کوئی ایسا کام کیا تو میری رُوح کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ بیٹی میں تجھے خدا کے سپرد کرتی ہوں جو پتھر کے اندر کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ بیٹی! خدا تیرا نگہبان ہے۔ دیکھو گھبرانا نہیں۔ اپنے باپ کا انتظار کرنا۔ یہ کہتے کہتے مریضہ کی حالت متغیر ہو گئی، اُس کا منکا ڈھل گیا اور آنکھیں پھر گئیں اور چند منٹ کی نزاعی کش مکش کے بعد وہ اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی!

ناہید تڑپ کر اپنی ماں کی لاش پر گر پڑی اور روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ کون تھا جو اُسے سمجھاتا، کون تھا جو اُسے ڈھارس دیتا، کون تھا

جو کہ اُس شکستہ دل کو تسلی و تشفی دیتا؛ رات مہیب سے مہیب تر ہوتی گئی۔ ناہید کبھی بیہوش ہوتی اور کبھی ہوش میں آ کر پھر چیخیں مارنے لگتی۔ اُس نے اپنے بال نوچ لیے اور کئی مرتبہ اپنا سر پٹی سے دے مارا۔ رات گزرتی رہی اور ناہید کی چیخیں، ہچکیوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔

شہنشاہ ہمایوں کے جشنِ ہمایونی کا آج تیسرا دن تھا۔ لوگ اپنے دل کی مرادوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ لباس فاخرہ پہنے۔ جوق در جوق چلے جارہے تھے اور تو اور اس غریب بستی میں بھی کافی چہل پہل تھی۔ لوگوں نے اپنے چھوٹے سے بازار کو آراستہ کیا تھا۔ ملازمینِ سرکار مثلاً فیل بان۔ سپاہی۔ اصطبل کے لوگ رات ہی سے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اہلِ آگرہ کے لیے یہ کتنی مبارک صبح تھی۔ ہر گھر میں خُوشی و مسرت ناچ رہی تھی۔ نقاروں اور نفیریوں کے شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ راستے سپاہیوں، امرا، منصب داروں کے زرق برق لباسوں سے بھرے ہُوئے تھے۔ جگہ جگہ خوشبوؤں اور کپڑے کے تھانوں سے دکانوں کو سجایا گیا تھا۔ ہر طرف خُوشی ہی خُوشی مسرت ہی مسرت تھی۔ کھانے تقسیم ہو رہے تھے۔ جاگیریں، خلعت، منصب، ملازمتیں مل رہی تھیں۔ زر و جواہر لُٹائے جا رہے تھے۔

لیکن ناہید! مجسّم غم بنی ہُوئی تنہا اپنی ماں کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ یہاں اجنبی لوگوں میں تھی۔ صبح اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ در و دیوار سے غم کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ رات سے اُس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہ گئی تھی اُس کو یہ فکر تھی کہ وہ تنہا زندگی کا سفر کس طرح طے کرے گی۔ ماں کی

لاش کو کس طرح سپردِ قبر کرے گی۔ کون ایک لاوارث لاش کو اُٹھائے گا۔ کون غسل و کفن دے گا۔ اُس کی نفرت، مُغلوں کے خلاف ہر طرح بڑھ رہی تھی۔ یہ سب مُغلوں کا قصور تھا کہ وہ اس خوفناک عالم میں زندگی گزارنے پر مجبُور تھی۔ اس بستی کے سب نوجوان اور بوڑھے بچّے جشن دیکھنے گئے تھے صرف چند ضعیف اور بیمار اپنے اپنے گھروں میں پڑے اپنے آپ کو کوس رہے تھے کہ وہ اس جشن کے موقع پر شہر کی بہار نہ دیکھ سکے!

کسی صورت سے اس واقعہ کی اِطلاع اکبری بیگم کو ہو گئی۔ اکبری ناہید کی خوبصورتی اور خوش گفتاری سے بہت خُوش تھی اور اکثر اس کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ اکبری کا باپ شاہی فیل بان تھا اور اس کے گھر سے کچھ فاصلہ پر رہتا تھا۔ اکبری بیگم یہ وحشت ناک خبر سُنتے ہی دوڑی ہُوئی آئی۔ اُس نے ناہید کو جس عالم میں دیکھا۔ اُس کا دل بھر آیا۔ اُس نے ناہید کو گلے لگایا اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

ناہید کا دل بھی بھر آیا۔ اس کے آنسو بھر جاری ہو گئے۔ بڑی دیر تک وہ اپنی سہیلی کے ساتھ روتی رہی اس کے بعد اکبری نے کہا۔

اکبری بیگم : بہن۔ تم نے رات ہی مجھے کیوں نہ بُلوا لیا۔ کوئی اتنا بڑا صدمہ خود برداشت نہیں کر سکتا۔

ناہید نے ایک حسرت ناک نظر اپنی سہیلی پر ڈالی اور اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے میں مشغُول ہو گئیں۔

اکبری : آج جشنِ ہمایونی کا تیسرا دن ہے۔ ساری دکانیں بند ہیں۔ آج

شہنشاہ ہمایوں دربار عام کریں گے۔ بڑے سخی کا دربار ہے۔ دیکھیے کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ آج شام تک تو کسی بھی طرح ان کو سپرد لحد نہیں کیا جاسکتا! دربار عام آج چار بجے برخاست ہوگا اور شہنشاہ ہمایوں اس کے بعد محل سرا میں تشریف لے جائیں گے۔ مرد چار بجے کے بعد ہی شہر سے پلٹیں گے۔ جب تک میں اوپر کا کام کرتی ہوں۔

ناہید : اکبری۔ تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جس کی وجہ سے میں تمام عمر تمھاری ممنونِ احسان رہوں گی!

اکبری : ناہید یہ تو انسانی فرض ہے۔ میں نے تم پر کون سا احسان کیا ہے۔ تم خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔

اکبری نے محلہ کی چند عورتوں کو جمع کیا اور ناہید کی ماں کو غسل و کفن دے کر جنازہ تیار کر دیا گیا۔ شام کو جب لوگ جشن سے خوشی خوشی واپس آئے تو انھوں نے اس بے بس، بے وطن کو اسی بستی کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کر دیا۔

اس کے بعد اکبری نے ناہید کو کچھ کھلا پلا کر اور سمجھا بجھا کر چلی گئی۔ اور حسرت نصیب ناہید کے چہرے پر آنسوؤں کے قطرے پھر رقص کرنے لگے!

اکبری کے جاتے ہی خیالات ناہید کو پھر کسی اور ہی دُنیا میں لے گئے۔ اس کی سمجھ میں یہ حکومتوں کا چکّر نہ آتا تھا۔ آخر لودھیوں یا پٹھانوں نے مغلوں کا کیا بگاڑا تھا۔ آخر ہم نے بابر کے ساتھ کیا بُرا سلوک کیا تھا کہ وہ کابل و قندھار سے یلغار کرتا ہُوا آگرہ تک آگیا اور آناً فاناً ایک حکومت ختم کر کے دُوسری حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اُف' یہ کیا رفتار زمانہ ہے۔ کل

تک جن کے اقتدار اور اقبال کی قسمیں کھائی جاتی تھیں آج گدائے بے نوا کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور کل تک جن کو فرغانہ کی ایک ذرا سی حکومت حاصل نہ ہو سکی آج ہندوستان کے شہنشاہ بنے ہوئے ہیں۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ اس بابر کو اپنی قوّت اپنے لشکر اور اپنی حکومت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن یہ تمام خدم وحشم اور شان وشوکت۔ زر وجواہر اور سپاہیوں کے پرے کے پرے۔ جاں بازوں اور جان نثاروں کے گروہ اس کو موت کے منہ سے نہ بچا سکے۔ اور وہ اس ہندوستان کی سرزمین پر جس کو اس نے بے شمار اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کر کے فتح کیا تھا، ۵ سال سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

اگر بابر ۵ سال پہلے مرجاتا تو کیا ہوتا۔ شاید پانی پت کی جنگ کبھی نہ ہوتی اس کا گھر نہ اُجڑتا۔ اُس کی ماں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان نہ دیتی۔

مگر بابر اتنا بُرا نہ تھا۔ لیکن یہ ہمایوں تو سخت نامبارک ثابت ہُوا۔ اُس کے جشن کے موقع پر عالم بے بسی میں اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ہاں وہ اپنے باپ کو اس واقعہ کی کس طرح اطلاع دے۔ اور اس مصیبت سے اپنے آپ کو کیسے نکالے؟

آبا حضور بھی بڑے ضدّی آدمی ہیں۔ شہنشاہ بابر نے سریر آرائے مملکت ہوتے ہی عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ جو بھی دربار میں پہنچ گیا اس کو معافی مل گئی! جاگیر قائم رہی خلعت اور منصب کا اضافہ ہُوا۔ نوکری بحال رہی۔ مگر آبا حضور نے کہا کہ وہ مُغلوں کو ہندوستان سے نکال کر دم لیں گے وہ

کسی اور کے قدم سرزمینِ ہند پر نہ جمنے دیں گے اور کبھی اطاعت نہ کریں گے!

اور اس کے بعد وہ بہت سے گروہوں کے ساتھ مل کر مغلِ اعظم کو ہندوستان سے نکالنے کی جدوجہد کرتے رہے اور اب بھی اسی کام میں مشغول ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔ کیونکہ اب بابر جیسا دلیر اور بہادر سپاہی کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کی کامیابی اور فتح وظفر کی قیمت ہم کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ والدہ صاحبہ اسی انتظار میں مر گئیں۔ لیکن ان کو والد صاحب کا آخری دیدار بھی میسّر نہ ہو سکا۔ اور میں بھی شاید اُن کی یاد اور انتظار میں سر ٹپک ٹپک کر مر جاؤں گی!

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی نے اُس کی پُشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اب جو اُس نے غور سے دیکھا تو جمال خاں اُس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

ناہید : جمال تم

جمال : ہاں ناہید، میں ہی ہوں۔

ناہید : مگر دروازہ تو بند تھا۔ تم اندر کیسے آئے۔

جمال : کمند لگا کر آیا ہوں۔

ناہید : گھر میں کمند لگا کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔

جمال : اس لیے کہ کسی کو میری آمد کی اطلاع نہ ہو۔

ناہید : پھر تم کیوں آئے ہو؟

جمال : میں تم کو اور پھوپھی کو لینے آیا ہوں۔

ناہید : جمال۔ تم بہت دیر میں آئے۔ تمھاری پھوپھی۔ ابّا حضور کو یاد کرتے کرتے وہاں چلی گئیں جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا ہے۔ جمال! ابّا حضور کہاں ہیں۔ ہائے میں اُن کو یہ خبر کیسے سُناؤں۔ ہائے ایک بے ماں کی بچّی بغیر باپ کے کس طرح تنہائی میں زندگی گزار سکتی ہے۔ یہ کہہ کر ناہید نے رونا شروع کر دیا۔ جمال بھی اس خبرِ غم اثر کو سُن کر رونے لگا۔

جمال ناہید کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ جمال اور ناہید ایک ساتھ پلے اور بڑھے تھے۔ جمال ناہید کو اپنی محبوبہ اور ہونے والی بیوی سمجھتا تھا۔ لیکن ناہید کو اس سے ہمیشہ کی چڑ تھی۔ وہ جمال کو صرف ایک بھائی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی تھی۔ جمال بڑا رنگین مزاج اور کاہل شخص تھا۔ اس لیے ناہید اس کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتی تھی۔ جمال اور ناہید برسوں ایک ساتھ رہے۔ لیکن جمال کو کبھی اتنی جرات نہ ہُوئی کہ وہ کھُل کر اس سے اپنا حالِ دل کہہ سکتا۔

لیکن آج ناہید کی حالت بہت ابتر تھی۔ اُس کو مایوسیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اُس کا سب سے بڑا سرمایہ اور سہارا اُس کی ماں تھی۔ وہ بھی اس سے رُوٹھ کر جا چکی تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سُرخ ہوگئی تھیں۔ اور اُس کے پپوٹے سوج گئے تھے جس سے اُس کی آنکھیں شراب چھلکی پڑ رہی تھی۔ اُس کے بال بُری طرح اُلجھے ہُوئے تھے اور وہ سخت نڈھال ہو رہی تھی۔ جمال کو دیکھ کر اُس کا غم از سرِ نو تازہ ہوگیا تھا اور آنسو طوفانی کیفیت کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

جمال اُس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اُس کا غم غلط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

جمال : ناہید۔ خدا کے لیے صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کو درست رکھتا ہے !

ناہید : جمال، میں کیسے صبر کروں۔ ہائے امی آخری وقت تک ابا حضور کو یاد کرتے کرتے رخصت ہو گئیں۔ ہائے تم اس وقت لینے آئے۔ جب وہ یہاں سے بہت دُور جا چکی ہیں۔ کاش تم کچھ دن پہلے آجاتے تو امی جان ابا حضور کو دیکھ لیتیں اور میرا ہاتھ ابا حضور کے ہاتھ میں دے دیتیں۔ اُف اُن کی رُوح کو میری تنہائی کا کتنا صدمہ ہوگا۔ جمال ابا حضور کہاں ہیں ؟

جمال : بس یہ سمجھ لو کہ تم سے زیادہ دُور نہیں۔ لیکن وہ آنے سے قاصر ہیں۔ اُنھوں نے تم کو بُلایا ہے۔

ناہید : کیوں ؟—

جمال : (آہستہ سے کان میں) آپ کے والد صاحب کی ان تھک کوششوں سے افغان قوم ایک مرتبہ پھر ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی ہے۔ اب ہماری تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ اور اس کثیر جماعت سے ہم مُغلیہ فوج کی صفوں کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔ ہم چند ہفتے میں اس قابل ہو جائیں گے کہ سلطنتِ مُغلیہ سے ایک زور دار ٹکر لے سکیں اور اگر خدا کی مدد شاملِ حال رہی تو انشاءاللہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے۔

ناہید کے غم زدہ چہرے پر اس خبر سے پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ جمال یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ پھر مجھے تم کہاں لیے جا رہے ہو۔

جمال : کیمپ میں۔

ناہید : نہیں جمال۔ میں کیمپ میں نہیں جاؤں گی۔

جمال : کیوں — ؟

ناہید : ابھی تو میری ماں کا کفن بھی مَیلا نہیں ہُوا ہے۔ میں اُن کی قبر چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ دوسرے مجھے اس جنگ و جدال سے نفرت ہے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان آخر انسان کے درپئے آزار کیوں ہے۔ ہم کیوں ایک دوسرے کے خُون کے پیاسے ہیں۔ کیا یہ دُنیا اور اس کی بہاریں فنا ہو جانے والی چیزیں نہیں — کیا یہ دُنیا دائمی ہے۔ کیا یہاں کی فتح و شکست مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ جب یہاں کسی چیز کو ثبات نہیں تو چند دن کی مسرت کے لیے دائمی مصیبت مول لینا میرے خیال میں بڑے خسارے کا سودا ہے۔ کیا فوجی باجوں، تلواروں کی جھنکاروں اور قتل و غارت گری سے یہ بہتر نہیں کہ محبت کی گھٹائیں اُٹھیں۔ خلوص کے بادل برسیں اور ہر بنی نوع انسان کو اپنی آغوش میں لے لیں۔ خیر جمال تم سمجھتے ہو گے کہ میں ایک عورت ہوں اور اسی طرح بہادری کی بجائے بزدلی کا جواز قائم کر رہی ہوں۔ اچھا ان باتوں کو جانے دو۔

جمال : اگر کسی کو ذرّہ برابر بھی شُبہ ہو گیا تو تم کو قید کر لیا جائے گا۔

ناہید : جمال، میں قید ہونے کو تیار ہوں۔ کیونکہ وہ اسیری میدانِ کارزار کی گرم بازاری اور اس مکان کی سرد مہری دونوں سے اچھی ہوگی۔

جمال : ناہید۔ میری اچھی ناہید، ضد نہ کرو۔ اس طرح تم شدتِ غم والم سے اپنے آپ کو ہلاک کر لوگی۔ تم کو یہ تو سوچنا چاہیے کہ تمھارا وجود تمھارے اپنے لیے نہیں تو کسی دُوسرے کے لیے نہایت قیمتی ہو سکتا ہے۔

ناہید : جمال بہکنے کی کوشش نہ کرو۔ جاؤ آبا حضور کو یہ پیغام پہنچا دو کہ مَیں اپنی ماں کی وصیت پر عمل کروں گی انھوں نے بھی مرتے وقت تک آپ کا انتظار کیا۔ مَیں بھی انتظار کروں گی اور جب آپ کی فوجیں مظفر ومنصور آگرہ میں داخل ہوں گی تو میں آپ کی پیشوائی کروں گی۔ میں عقیدت کا ہار آپ کے گلے میں ڈالوں گی۔ جب تک آپ جنگ کے شعلوں میں گھرے ہُوئے ہیں مجھے مادرِ مہربان کی قبر سے جُدا نہ کیجیے۔ آپ کی فرقت میں بھی اب مجھے بڑا سہارا ہے۔

جمال نے دیکھا کہ ناہید کی آنکھوں میں دریائے خُون موج زن ہے۔ وہ بے تاب ہوگیا اور کہا۔ ناہید تم بہت بلند ہو۔ میں اب تم کو ساتھ لے چلنے کے لیے مجبور نہ کروں گا۔ اچھا۔ اب اجازت دو۔ لو۔ یہ ایک تھیلی اشرفیوں کی ہے۔ اس کو اپنے کام میں لانا۔

ناہید : جمال۔ یہ سنہرے سکّے میرے لیے بے کار ہیں۔ ہاں تم ایک دن پہلے کیوں نہ آگئے۔ جب میں ان سنہرے سکّوں سے اپنی ماں کا علاج نہ کرا سکی۔ اُن کو غذا نہ پہنچا سکی۔ اُن کے غسل وکفن کا انتظام نہ کر سکی۔ تو اب

میں ان کو لے کر کیا کروں گی۔؟

جمالؔ: نہیں ناہید اس کو اپنے پاس رکھو اور ہمارا انتظار کرو۔

جمال اور ناہید اس قسم کی باتوں میں مشغول رہے اور تھوڑی دیر کے بعد جمال جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

اور ناہید پھر مغموم ہو گئی!

باب ۳

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ اُست

جون پور کے قریب دریائے سیلنی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ اس کا پانی مومن کے دل کی طرح صاف اور آئینہ کی طرح شفاف ہے۔ یہ دریا کہیں دُور سے پہاڑوں سے آنکھ مچولی کرتا ہُوا چلا آ رہا ہے۔ اور خدا معلوم کتنی منزلوں کو طے کرتا ہُوا، مقام درّہ کے پاس اپنے آپ کو وادی کی پہنائیوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ پہلے یہ ایک معمولی سا چشمہ تھا۔ جس کو پہاڑ کی بلند چٹانوں نے چاروں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ لیکن جب وادی نے اس کو پناہ دی تو یہی آب جو اُچھل کر بے کراں ہو گئی۔ اب حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ یہ مقام بڑا دل کش اور نظر افروز ہے۔ سامنے دو رویہ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے اور بیچ میں یہ دریا اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ یہ دریا ایسا چمک رہا ہے گویا عروسِ فطرت کی مانگ میں افشاں بھر دی گئی ہے! یہ دریا آج بھی اپنی محشر خرامی سے اہلِ دل کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ آج بھی یہ صاحبانِ نظر کو اپنی جانب متوجہ کر رہا اور یہ پیغام دے رہا ہے کہ انسان فانی ہے۔ دُنیا کی ہر چیز ختم ہو جانے والی ہے۔ ہر شے

کو ایک نہ ایک دن فنا ہونا ہے۔ میں کب سے بہہ رہا ہوں۔ میں نے کتنے طلوع و غروب دیکھے ہیں۔ کتنی مرتبہ ستاروں کو چمکتے اور غروب ہوتے دیکھا ہے۔ آج پھر میرے دونوں کناروں پر دو انسانی لشکر آ کر جمع ہو گئے ہیں۔ یہ انسان ضعیف البیان ہے۔ یہ اپنی حقیقت تک سے بے خبر ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو اپنے وجود پر کتنا ناز ہے۔ یہ اپنے آپ کو کتنا عقلمند تصوّر کرتا ہے۔ انسان نے دوسرے انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں تمام مخلوقات سے زیادہ ترقی کی۔

دریائے سینی کے ایک کنارے پر شہنشاہ ہند نصیر الدین محمد ہمایوں کی فوجیں پڑی ہوئی ہیں دوسری جانب محمود خاں ولد سکندر لودھی ہیں اور بایزید کی سپاہ خیمے ڈالے پڑی ہے اس طرح اس خاموش اور حسین وادی میں کچھ عرصہ کے لیے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ دونوں جانب حد نظر تک خیمے ہی خیمے نظر آ رہے ہیں۔ ہر طرف چہل پہل ہو رہی ہے۔ ہر لشکر کے ساتھ بازار اور دوسری چیزیں ہیں یہ سلسلہ کئی میل تک چلا گیا ہے۔

مغل فوج ایک فاتح فوج ہے۔ اس کا عالم ہی کچھ اور ہے۔ ہر چیز کی افراط، ہر شے کی فراوانی، ہر خیمے میں زندگی، ہر چہرہ پر شادابی غرض ہر سپاہی مطمئن نظر آتا ہے۔ اور جوش شجاعت اور غرور میں اکڑ اکڑ کر چل رہا ہے! فوجی کیمپ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک کارچوبی خیمہ نصب ہے۔ یہ خیمہ اتنی بلندی پر واقع ہے کہ لشکر میں ہر مقام

سے صاف نظر آتا ہے۔ اس کے پاس ہی شاہی جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہے جس کا پھریرا اُڑ کر سطوت ہمایوں کا پتہ دے رہا ہے۔ یہی شاہی خیمے کی پہچان ہے۔ یہ خیمہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں کئی ہزار آدمی بیک وقت آسکتے ہیں۔

اس خیمے میں یہ خوبی ہے کہ اس کو دربار عام، دربار خاص نشست گاہ اور شاہی محل سرا وغیرہ میں بہ آسانی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ خیمہ دودھ کی طرح سپید ہے۔ اور اس میں نہایت خوش نما ریشم کی ڈوریاں بندھی ہوئی ہیں۔ خیموں کی میخوں پر چاندی کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ خیمے میں ایران و کشمیر کے نہایت نرم و گدگدے نظر فریب قالینوں کا فرش ہے۔ چاروں طرف اطلس و دیبا کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اعلیٰ درجہ کی مسندیں لگی ہوئی ہیں۔ خیمے کے باہر سینکڑوں خوب رو سپاہی سفید وردیاں پہنے، شمشیر ہاتھ میں لیے پہرہ دے رہے ہیں۔ شاہی خیمے کے دونوں جانب شہزادوں، امرا، جاگیردار اور فوج کے دوسرے اعلیٰ افسروں کے خیمے نصب ہیں۔ جو اپنی شان و شوکت سے اپنی حیثیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ ان خیموں کے بعد بازار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس بازار کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کا ایک سرا بڑے بڑے امرا۔ اور وزرا۔ کی جانب ہے اور دوسرا سرا سپاہیوں کے خیموں میں دُور تک چلا گیا ہے ان بازاروں نے صحیح معنی میں جنگل کو منگل بنا دیا ہے۔ دُنیا کی ہر چیز۔ سامان اسلحہ، قالین، پردے، گھوڑے، ہاتھی سے لے کر جواہرات تک مل سکتے ہیں۔

دوسرے لشکر میں بھی اسی قسم کا سامان ہے لیکن جو اطمینان اور خوشی

مغلوں کے چہرے پر ہے اس کا دوسرے کیمپ میں کوئی پتہ ونشان نہیں۔ رات کا وقت ہے۔ شہنشاہ ہمایوں اپنے زرنگار خیمے میں جلوہ فگن ہیں۔ سامنے تردی بیگ، مغل بیگ، بیرم خاں، افتخار مرزا، اور دوسرے امراء بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب لوگ نظر جھکاتے ہوئے بیٹھے ہیں۔ دفعتاً شہنشاہ ہمایوں کی آواز فضا میں گونجی۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار مرزا، ہم نے تم کو کچھ ہدایات دی تھیں، کہو تم کیا خبر لائے ؟

افتخار مرزا : جہاں پناہ۔ فدوی نے خود اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ اور میں اپنی روداد گوشِ ہمایوں تک پہنچانے کا مشتاق ہوں !

شہنشاہ ہمایوں : اجازت ہے !

افتخار مرزا : عالم پناہ ! حضور کے حکم کے بموجب خاکسار نے پٹھانوں کا بھیس بدلا اور محمود خاں لودھی کی فوج میں گھس گیا۔ میں رفتہ رفتہ محمود خاں لودھی کے خیمے کے قریب پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہاں میری ملاقات ایک اپنے محلّہ کے پٹھان سے ہوگئی۔ اُس نے مجھے پہچان لیا۔ لیکن میں نے سونے چاندی سے جلد ہی اُس کا منہ بند کر دیا اور اُس کو اپنا راز دار بنا کر محمود خاں لودھی کے پہرہ کے ملازمین کی صف میں جا کر خیمے کے اندر کھڑا ہوگیا۔ حسنِ اتفاق سے وہاں بھی اسی وقت یہی مسئلہ درپیش تھا۔ تمام بڑے بڑے عہدہ دار اور منصب دار جمع تھے۔ میں بھی ایک ننگی تلوار لے کر محمود خاں لودھی کے پسِ پُشت کھڑا ہوگیا تھوڑی دیر میں باقاعدہ مجلس شروع ہوئی۔ سب

سے پہلے محمود خاں نے تقریر کی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں سمجھا تھا کہ ہمایوں ابھی ناسمجھ ہیں۔ وہ بابر کی طرح مستعد اور موقع شناس نہیں۔ اس لیے وہ ہماری فوج کشی کی خبر سُن کر اپنی فوج کو ہمارے مقابلہ کے لیے روانہ کر دیں گے اور ہم اس پر اپنی ترکیبوں سے بہ آسانی غلبہ پالیں گے۔ لیکن شہزادے کے متعلق ہم نے جو رائے قائم کی وہ غلط نکلی۔ ہمایوں بذات خود میدان میں آگئے۔ ابھی اُن کے جشن کو چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ انھوں نے فوج کی کمان خود سنبھال لی۔ اب ہم کو کامیابی کی صرف ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس جنگ کو جی بھر کر طول دیا جائے حکومتِ مغلیہ ایک پھوڑے کی طرح پک رہی ہے۔ ہر طرف لوگ مغلوں کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور محاذ بنا رہے ہیں۔ شیر خاں بہار میں اپنی قوت اور اقتدار بڑھا رہا ہے۔ سلطان بہادر گجرات سے اور بادشاہ بنگال سے مغلیہ سلطنت پر فوج کشی کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ خود بابر کے لختِ جگر یعنی مرزا ہندال کامران اور مرزا عسکری وغیرہ ہمایوں کی تخت نشینی سے مطمئن نہیں۔ ان میں عنقریب خانہ جنگی ہونے والی ہے۔ اگر ہم بادشاہ کی توجہ کو اپنی طرف رکھیں تو دُوسری طاقتوں کو اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔ اور اس طرح ہم سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ آسانی سے منتشر کر دیں گے!

شہنشاہ ہمایوں اور تمام درباری سانس روکے ہوئے افتخار مرزا کی تقریر سُن رہے تھے۔ جب افتخار مرزا نے اپنی تقریر ختم کی تو شہنشاہ ہمایوں

نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں: افتخار مرزا۔ تم نے وہ کام کیا جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ تم نے دشمن کی شہ رگ پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہم تمھاری اس خدمت سے بہت خوش ہوئے۔ اور تم کو ایک اسپ مرصع اور ایک منقش تلوار انعام میں دیتے ہیں۔

افتخار مرزا نے جھک کر تسلیم کی۔ اور اپنے مقام پر بیٹھ گیا۔

شہنشاہ ہمایوں: حضرات جو کچھ افتخار مرزا نے کہا۔ آپ سب نے سُن لیا ہوگا۔ بے شک ہم اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہ دیتے اور اپنے کسی بھی جاں باز سپاہی کو بھیج سکتے تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ ہمارے تخت نشین ہوتے ہی یہ پہلی بڑی بغاوت ہے۔ اس لیے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ ہم اس مہم کو اپنے ہاتھ سے بطورِ خاص سر کریں۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو دوسرے باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اب اس سلسلہ میں آپ صاحبان کی کیا رائے ہے؟

بیرم خاں: جہاں پناہ نے جو کچھ فرمایا وہ درست ہے۔ دشمن تاخیر سے کام لینا چاہتا ہے اس لیے ہم کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس مہم کو جلد از جلد ختم کر دیں۔

شہنشاہ ہمایوں: تمھارا خیال درست ہے۔ تردی بیگ تم کیا کہتے ہو۔

تردی بیگ: نہایت مناسب ہے۔ عالم پناہ

شہنشاہ ہمایوں: مگر ابھی تو دریائے مہینی کو پار کرنے کا سوال باقی ہے۔

بندو بیگ تمہارا کیا خیال ہے ؟

بندو بیگ : جہاں پناہ ظاہر ہے دشمن دریا کو پار نہیں کرے گا کیونکہ اس کا مقصد جنگ کو کسی بہانہ سے طول دینا ہے۔ اس لیے دریا ہم کو پار کرنا ہوگا!

بیرم خاں : ہاں۔ اگر کسی صورت سے دریا کا پایاب معلوم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ سامنے سے دریا پار کرکے ہم اپنی فوج کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ میں اس گرد و نواح میں کچھ عرصہ رہ چکا ہوں اگر حضور حکم دیں تو میں دریا کا پایاب معلوم کرنے کی کوشش کروں۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں۔ تم نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ ہم تم کو اجازت دیتے ہیں کہ یہ کام جلد از جلد کرنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد شہنشاہ نے دُعا پڑھی اور تمام امراء اُٹھ کر چلے گئے۔ صرف شہنشاہ ہمایوں اور بیرم خاں رہ گئے!

بیرم خاں : ظلِّ سبحانی! مجھے کچھ مزاجِ ہمایونی برہم نظر آرہا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : ہاں بیرم خاں۔ ہمارا سفینۂ دل غم والم کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہے۔ افتخار مرزا کی اطلاعات نے ہم کو بہت متاثر کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم نے اپنے دوسرے بھائیوں پر لطف پر لطف اور عنایت پر عنایت کی۔ ہم نے قندھار و کابل کامران کے سپرد کر دیا۔ لیکن انھوں نے ہماری اس پیش کش کا کیا جواب دیا۔ کامران نے میری تخت نشینی کی خبر سنتے ہی سب سے پہلے مبارکباد پیش کرنے کے بہانے کابل سے پنجاب پر فوج کشی کی اور وہاں کے حاکم کو فریب دے کر پورے پنجاب اور اور سرحد پر قبضہ کرلیا۔

اور اس تمام دیدہ دلیری کے بعد بڑے آرام سے ہم سے درخواست کی کہ ہم اپنے قتل کے محضر پر خود ہی دستخط کر دیں۔ ہم ان کی فوج کشی کو دوستی سمجھیں۔ ان کو اس علاقہ کا فرمان عطا کریں۔ گویا وہ ان کا پیدائشی حق تھا۔ گویا انھوں نے جو کچھ کیا وہ جائز و حق بجانب تھا۔ بیرم خاں ہم نے سوچا کہ ملک میں دشمنوں کی کمی نہیں۔ اس لیے اپنی تلوار کی پیاس اپنے بھائیوں کے خون سے کیوں بجھائی جائے۔ دوسرے جنت مکانی کے الفاظ ان کی سفارش کو آجاتے ہیں۔ ورنہ ہم ان آستین کے سانپوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

بیرم خاں : جی ہاں۔ عالم پناہ۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کی ایک بہترین دلیل ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی نظیر آج کی خود غرض دُنیا میں ممکن نہیں۔ آپ نے اس سرد مہری اور ناحق شناسی کے تیر کو جس طرح مسکرا کر اپنے دل میں پیوست کر لیا اس کا جواب ممکن نہیں۔ اگر شہزادہ کامران حضور کے قدموں پر اپنی جان نثار کرتے اور حضور شہزادہ عالم پر اس طرح انعام و اکرام کی بارش کرتے تب بھی حضور کا کرم ہوتا چہ جائیکہ حضور نے کانٹوں کے بدلے پھول۔ اینٹوں کے جواب میں زر و جواہر اور بغاوت و فوج کشی کے بدلے میں ملک عطا کیا۔ کاش آپ کی شرافت اور بلند خیالی ان کی آنکھوں کے پردے کو اُٹھا دے اور وہ حضور کے ہم خیال ہو جائیں۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں۔ تمھارا یہ نتیجہ غلط ہے۔ ہم نے کامران پر یہ عنایتیں اس لیے نہیں کیں کہ وہ فتنہ و فساد سے باز رہے گا۔ کیونکہ ہم تم کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ اپنی شرارت سے کبھی باز نہ آئے گا۔ وہ ضرور ہماری

راہ میں کانٹے بوئے گا وہ ضرور بغاوت کرے گا۔ ہم نے صرف جنت مکانی بابر کی وصیّت کو پورا کیا۔ ہم اپنے بھائیوں کو پھولوں اور زر و جواہر میں تولنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب ہم کو تیروں، خنجروں اور سنانوں میں تولنا چاہتے ہیں۔ ہائے سعدی نے خوب کہا ہے :

ہر کس از دست غیر نالہ کند

سعدی از دست خویشتن فریاد

بیرم خاں : عالم پناہ۔ جب قادرِ مطلق اپنے کسی نیک بندے کا امتحان لیتا ہے۔ تو اس کو طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حضور کا رنج بیشک ایک بڑا رنج ہے لیکن حضور اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو حضور کو حضرت یوسف کا واقعہ ملے گا۔ کیا "برادرانِ یوسف" نے حضرت یوسف علیہ السلام کی جان لینے کی پُوری کوشش نہ کی۔ کیا ان کو اندھے کنوئیں میں نہیں ڈالا گیا۔ لیکن خدا نے اُن کے بھائیوں کے ضرر سے محفوظ رکھا جس خدا نے حضرت یوسف کی مدد کی۔ وہی خدا آپ کی مدد کرے گا۔ وہاں اس نے یوسف کے درجات کو بلند کیا۔ یہاں وہ آپ کو ثبات و استقلال اور صبر کی دولت عطا کرے گا۔ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لیکن جہاں پناہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ حضور اپنے بھائیوں سے ہوشیار رہیں جب دشمن یہ سوچ رہا ہے کہ اگر سلطنتِ مُغلیہ میں اضمحلال واقع ہُوا تو اس کا باعث شہزادوں کی فوج کشی اور خانہ جنگی ہوگی تو ہم کس طرح ان حقائق سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں : نہیں بیرم خاں - ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی زندگی میں جنت مکانی کی کاوشوں سے حاصل کی ہوئی حکومت ہندوستان کو کمزور نہ ہونے دیں گے اور نہ شہزادوں پر کوئی سختی کریں گے خدا ان کو نیک ہدایت دے۔ مجھے ان سے بے پناہ محبت ہے۔ بیرم خاں کوئی شخص کس طرح اپنے دل میں چھری چبھو سکتا ہے۔

بیرم خاں : آپ نے جو کچھ کہا اس کی قدر صاحبان دل ہی کر سکتے ہیں۔ آپ کے جذبات کتنے پاکیزہ اور کتنے بلند ہیں — آپ نے جو کچھ کیا اس کا اجر آپ کو بارگاہِ رب العزت سے ضرور ملے گا۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

شہنشاہ ہمایوں : اجازت ہے۔

بیرم خاں : اگر شہزادہ کامران نے حسب عادت سرکشی و بغاوت اختیار کی اور مرزا ہندال و مرزا عسکری کو اپنے ساتھ ملا لیا تو ہم اس فتنہ کو بغیر شمشیر کے کس طرح ختم کر سکیں گے۔

شہنشاہ : ہم ایسی صورت حال کو ممکن خیال نہیں کرتے۔ لیکن اگر اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا تو ہم کو حالات کی روشنی میں اس کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور پھر جو سب کی رائے ہوگی وہی کیا جائے گا۔

بیرم خاں : جہاں پناہ اس نمک خوار کی رائے ناقص میں اس فتنہ کا ابھی سے سر کچل دینا چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے اس کا سدباب ہو سکے اور ہم ایک محاذ سے مطمئن ہو کر آرام سے دوسرے دشمنوں سے مقابلہ کر سکیں۔ اور اگر

حضور کسی اور سے لشکر کشی میں مشغول ہو گئے اور بیچ میں یہ فتنہ کھڑا ہو گیا تو یہ ہمارے لیے بے اندازہ مصیبتوں کا باعث بن جائے گا۔ اور شاید اس وقت اس پر قابو پانا ممکن نہ ہو۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں ہم سب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس مقام پر ہم اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں۔ محبت کی کمندوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں کو جکڑ رکھا ہے ہائے سعدی نے شاید اس موقع کے لیے کہا تھا ؎

بیاکہ ماسپر انداختیم اگر جنگ است

بیرم خاں : حضور میری گستاخی کو معاف فرمائیں گے یہ حکومت مغلیہ کی بہی خواہی کا جذبہ ہے کہ بعض اوقات میں وہ باتیں بھی کہہ جاتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں کہ مزاج ہمایونی پر گراں گزریں گی۔!

ہمایوں : بیرم خاں، ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ تم دوسرے امراء اور منصب داروں کی طرح صرف ہماری خوشامد کے پہلو نہیں تلاش کرتے ہو بلکہ موقع اور محل کی رعایت سے تم جس بات کو مناسب سمجھتے ہو کہتے ہو اس وجہ سے ہمارے دل میں تمھارا بہت احترام ہے اور ہم تمھاری رائے کو بے لوث اور وقیع سمجھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسان دماغ کی منزل یا عقل کی منزل سے آگے نکل جاتا ہے اور دل کی دُنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو۔

عقل بہ حیلہ می بُرد۔ عشق برد کشاں کشاں

عشق یا دل کی منزل انساں کو کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ اس وقت

وہ خیالات سے جذبات میں آجاتا ہے۔ وہاں اس کے سامنے صرف ایک کام کی تکمیل کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اچھا بیرم خاں اب تم جا سکتے ہو۔

شہنشاہ اُٹھے اور محل سرا میں چلے گئے!

باب ۴

افتخار مرزا اور صفدر خاں

دریائے سینی کے کنارے مُغلوں اور افغانوں کے درمیان جو معرکہ ہُوا وہ بھی ہزاروں دوسرے معرکوں کی طرح طوفان کی طرح اُٹھا اور آندھی کی طرح ختم ہوگیا۔ اب وہ صرف ایک تاریخی واقعہ تھا مغلوں نے دریا کا پایاب دریافت کر لیا اس کے بعد شہنشاہ ہمایوں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ لوگ اپنے اپنے خیموں کو اسی عالم میں لگا رہنے دیں اور پایاب کے ذریعہ دریا کو پار کر جائیں۔ مغلیہ سپاہ نے رات کی تاریکی میں دریا کو پار کر لیا اور صبح کو پٹھانوں اور لودھیوں کو معلوم ہُوا کہ شاہی لشکر مقابلہ کے لیے ان کے سامنے صفیں جمائے تیار کھڑا ہے۔ ابھی محمود خاں لودھی فوج کے اس اچانک اقدام سے ہوش میں بھی نہ آئے تھے کہ مغل تیر اندازوں نے فوج مخالف پر تیروں کی بارش کی۔ یہ گویا جنگ شروع کرنے کا اعلان تھا۔ دونوں طرف سے نقاروں پر چوٹ پڑی اور ذرا دیر میں تلواریں خُون برسانے لگیں، زمین دشت لالہ زار ہوگئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے تمام میدان گونجنے لگا۔ فوجی صفیں موجوں کی طرح اِدھر سے اُدھر ہوگئیں ناگاہ شہنشاہ ہمایوں کی فوج سے ایک تیر جا کر محمود خاں لودھی کے لگا۔ وہ زین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی تمام لشکر میں بد دلی پھیل گئی اور لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

بڑے لشکر میں یہ بڑی دشواری ہوتی ہے کہ جب ایک مرتبہ لشکر میں بے چینی پیدا ہوجائے تو اس کو روکنا محال ہوجاتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے سپاہیوں کو غیرت دلائی مگر بھاگنے والوں نے پلٹ کر نہ دیکھا اور سراسیمہ و پریشان اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مغلیہ سپاہ نے ان کا تعاقب کیا اور ہزاروں سپاہیوں کو قتل کردیا۔ ابھی آفتاب نے اپنا دن بھر کا سفر تمام نہ کیا تھا کہ یہ خونیں ورق تمام ہوگیا۔ شہنشاہ ہمایوں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور لشکر والے اپنے مقتولوں کو سپرد قبر کرنے میں مشغول ہوگئے۔

دُنیا کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہتی، بلکہ قدم قدم پر انقلابات کا شکار رہتی ہے۔ ابھی شادی ابھی غم۔ انسان کیسے کیسے محل بناتا ہے لیکن ذرا دیر میں خاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ یہ نظام کائنات اسی بلندی و پستی اور عروج و زوال کا دوسرا نام ہے۔ صبح ہوتی ہے تو خسرو خاور اپنی شعاعوں کے نیزے ہاتھ میں لے کر بصد خدم و حشم و جاہ و جلال دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔ لیکن اس کا یہ عروج دوپہر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوجاتا ہے شام تک وہ ایک شکست خوردہ شہنشاہ کی طرح مغرب میں جاکر روپوش ہوجاتا ہے۔ یہی حال چاند کا ہے۔ چاند اپنی دل کشی اور جاذبیت سے ساری دُنیا کی نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ کائنات پر ایک چادر نور ڈال دیتا ہے۔ لیکن اس کا کمال ہی اُس کا زوال ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گھٹنے لگتا ہے۔ اور گھٹتے گھٹتے بالکل معدوم ہوجاتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ تارے چمک چمک کر دُنیا کو روشن کرتے ہیں اور پھر کہیں دُور سیاہی

کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ قطرہ دریا میں مل کر دریا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو فنا کر لیتا ہے۔ دریا اپنے آپ کو سمندر کے سپرد کر دیتا ہے۔ سمندر اس قطرہ کو جو اس نے دریا کی شکل میں لیا تھا۔ پھر ابر محیط اور ابر باراں میں تبدیل کر دیتی ہے اور پھر یہی قطرہ اپنی حقیقی منزل سمندر کی جانب روانہ ہو جاتا ہے یہی عروج و زوال کی کیفیتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ شہنشاہ ہمایوں خوش تھا کہ اس نے اپنے دشمن پر فتح پائی۔ اس نے جشنِ عام کا اعلان کر دیا۔ وہی فوجی خیمے جو کئی ہفتے سے ویران پڑے تھے اور جن میں اُمید و بیم اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ آج فتح وظفر کے پیغامبر تھے۔ آج مسرت و شادمانی اُن خیموں کے گرد طلایا کر رہی تھی۔

ایک دوسرا لشکر بھی تھا۔ اُس کا بادشاہ مر چکا تھا۔ خیمے اُجڑ گئے تھے۔ مکین مر چکے تھے۔ گھوڑے، ہاتھی، نوکر چاکر، خیمے، ساز و سامان، روپیہ پیسہ، سب شاہی کیمپ والے لوٹ چکے تھے۔ اب وہاں چند ٹوٹی ہوئی قناتیں اور چند ٹوٹی ہوئی چیزیں تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی کبھی کچھ انسانوں نے بسیرا کیا تھا۔ لیکن آج ان میں سے کچھ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور کچھ جنگل اور بیابانوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ کچھ شہنشاہ ہمایوں کی فوج میں اسیر تھے۔

ایک کیمپ آباد تھا۔ دوسرا کیمپ اُجڑ رہا تھا۔ ایک جگہ جشن کے سامان تھے۔ دوسرے کیمپ میں موت اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ ایک کیمپ میں حیات تھی۔ دوسرے کیمپ میں موت۔ ایک کیمپ آباد تھا۔ دوسرا برباد۔

ایک جگہ زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ تھی تو دوسرے کیمپ میں موت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ پہرا دے رہی تھی۔ لاشیں میدان میں بکھری پڑی تھیں۔ رات نے اُن لرزہ خیز مناظر پر سیاہ لبادہ ڈال دیا تھا۔ وہی پہاڑ، وہی دریا، وہی سبزہ، وہی کہسار جو چاندنی راتوں اور دن کی روشنی میں دل کو سرور اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ اس وقت انسان کے دل میں عجیب عجیب وسوسے اور واہمے پیدا کر رہے ہیں۔ یہی کوہسار اب ناچتے ہوئے بڑے بڑے بھوت نظر آتے ہیں اور سرو کے پیڑ پر کسی بھوت کے سایہ کا گمان ہوتا ہے۔

ایسے ہی خوفناک اور ڈراؤنے عالم میں ایک سوار مقتل کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ مقتل میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اسی جانب رواں ہے۔ اچانک اس کو کسی کے زور زور سے کراہنے کی آواز آئی یہ سوار پہلے اس آواز کو صرف ایک خیال اور واہمہ سمجھا کیونکہ مقتل میں مردے پڑے تھے اور مردے بولا نہیں کرتے لیکن جب اس نے پے درپے کراہنے کی آواز سُنی۔ تو خوف کی جگہ اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اُس نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی غریب زندہ ہو اور مجھ کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ شاید خدا نے مجھے اس وقت اس طرف اس لیے بھیجا ہے کہ میں ایک بنی نوع انسان کے کام آؤں اور اس کی جان بچاؤں۔ مگر دشمن سے یہ ہمدردی کیوں؟

نہیں یہ اب دشمن نہیں مجروح ہے۔ دشمنی اسی وقت تک تھی جب

تک ہم ایک دوسرے کے حریف تھے - اب ایک فاتح ہے۔ دوسرا مفتوح۔ ایک صحت مند ہے دوسرا زخمی۔ انسانیت اور شرافت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بیکس اور مجبور کی مدد کی جائے۔ یہ سوچتا ہُوا یہ سوار اسی سمت روانہ ہُوا جدھر سے یہ اندوہ ناک آواز آ رہی تھی۔ آواز کے پاس پہنچ کر وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اُس نے جیب سے چقماق نکالا۔ ایک شعلہ سا فضا میں بلند ہُوا سوار نے جلدی سے ایک مومی شمع روشن کی اور اپنے سامنے کا جائزہ لیا۔ اس نے جو دردناک منظر دیکھا وہ اُس کو تڑپانے کے لیے کافی تھا۔ اس وقت وہ ایک سپاہی نہ تھا۔ بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے انسان کی بہیمانہ کرامات دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے چند لاشیں نہبت بُری حالت میں پڑی ہُوئی تھیں اور ایک شخص دو لاشوں کے درمیان پڑا ہُوا کراہ رہا تھا۔ سوار نے فوراً اس سپاہی کو ان لاشوں سے الگ کیا اور وہاں سے کچھ فاصلہ پر ایک صاف سے قطعہ زمین پر لٹا دیا اور اس کی نبض دیکھنے لگا۔

سپاہی کی نبض ابھی چل رہی تھی۔ جسم گرم تھا اور قلب کی رفتار گو بہت سُست تھی۔ لیکن وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا تھا کہ اس کے جسم میں ابھی جان باقی ہے۔ بظاہر اس کے جسم پر کسی شدید زخم کا نشان نہ تھا۔

اسی نے مریض کے خود کو بہ مشکل تمام اس کے سر سے الگ کیا اور زرہ اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ زرہ بہت زیادہ تنگ تھی۔ اب سوار

کے لیے یہ اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہ تھا کہ اس زخمی کی اتنی بُری حالت کیوں ہے۔ اُس نے اپنی تلوار سے زرہ کی کڑیوں کو بہ مشکل تمام کاٹا اور بہ دقت اس کو اُس کے جسم سے الگ کیا۔ اب یہ شخص کراہتے کراہتے بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ سوار نے اپنے فتراک سے پانی کی چھاگل نکالی اور پانی کے چند چھینٹے زخمی کے چہرے پر مارے۔ اس کے بعد اس نے تھوڑا سا پانی زخمی سپاہی کے منہ میں ڈال دیا۔

ان پانی کے چند قطروں نے آب حیات کا کام کیا۔ زخمی سپاہی نے آنکھیں کھول دیں لیکن آنکھیں کھولتے ہی اُس نے ایک مغل سردار کو قتل گاہ میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا اور یہ اندازہ لگایا کہ یہ مغل سردار اس کو زندہ سمجھ کر قتل کرنے کے ارادے سے رُک گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے ایک سرد آہ کی اور بیہوش ہوگیا۔ مغل سردار نے اس ماحول میں زیادہ دیر رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی پُشت سے زین جُدا کیا۔ اپنا صافہ کھولا اور گھوڑے کی پُشت پر زخمی سپاہی کو باندھ کر خیمہ گاہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

کیمپ میں پہنچتے ہی نوکروں نے چاروں طرف سے اپنے آقا کو گھیر لیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے زخمی کو گھوڑے کی پیٹھ سے اُتارا اور ایک آرام دہ مقام پر اُس کو لے جاکر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر میں طبیب بھی آگیا۔ اُس نے زخمی کے تمام کپڑے اُتار ڈالے۔ دیکھا تو جسم پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ جن سے خُون چھن رہا تھا۔ لیکن کوئی مہلک زخم نہ تھا۔

طبیب نے فوراً چند پٹیاں باندھیں۔ عرق مریض کے حلق میں ڈالا اور چلا گیا۔

چند خوبصورت کنیزیں مریض کے اردگرد جمع ہو گئیں۔ اتنی دیر میں مریض نے کروٹ لی اور "ناہید" "ناہید" کہہ کر کراہنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت شان دار خیمے میں ایک نہایت آرام دہ بستر پر لیٹا ہُوا ہے۔ سامنے گل دانوں میں طرح طرح کے پھُول سجے ہُوئے ہیں تمام کمرہ خوشبویات سے مہکا ہُوا ہے۔ دروازوں پر اطلس و دیبا کے پردے پڑے ہُوئے ہیں۔ سامنے چند نہایت حسین لڑکیاں بیٹھی ہُوئی ہیں زخمی سپاہی نے خیال کیا کہ وہ مر چکا ہے اور جنت میں پہنچ گیا ہے اور یہ حوریں اس کی خدمت پر مامور کی گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں اس کو اپنی تکلیف کا احساس ہُوا تو اُس نے خیال کیا کہ وہ ابھی تک زخمی ہے اور وہ یہ تمام عیش عشرت اور راحت و آرام کی خواب میں سیر کر رہا ہے۔ اس لیے اُس نے ڈر کی وجہ سے آنکھیں نہ کھولیں کہ کہیں لاشوں کا قرب اور میدانِ قتال کا پُرہول سنّاٹا اُس کو پھر لرزہ براندام نہ کر دے۔

وہ ابھی انھیں خیالات میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس کو کسی کے آنے کی چاپ محسوس ہُوئی پھر آنے والے نے کسی سے پوچھا۔

مرد : کیوں نرگس مریض کا کیا حال ہے؟

نرگس : حکیم صاحب نے کہا ہے کہ اب یہ خطرہ کی حدود سے باہر نکل آئے ہیں۔ اور چند دن آرام کرنے کے بعد بالکل تندرست ہو جائیں

گے۔

مرد : کیا مریض ہوش میں آیا۔

نرگس : جی ہاں حضور۔ انھوں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں دو تین مرتبہ "ناہید" کہہ کر آواز دی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔

مرد : اچھا ہم خود ان کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر یہ مغل سردار مریض کے سرہانے بیٹھ گیا۔ زخمی سپاہی اب یہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کوئی رحم دل انسان اس کو لاشوں میں سے نکال لایا ہے اور اس کی خاطر داری کر رہا ہے۔ اچانک ایک آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

زخمی سپاہی آنکھیں کھولو!

مریض نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک مغل سردار اُس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

زخمی سپاہی : آپ کون ہیں اور مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں میں کہاں ہوں۔ خدا کے لیے جلد بتائیے کہ میں کہاں ہوں —!

مغل سردار : میرے محترم بزرگ۔ گھبرائیے نہیں۔ آپ اب بالکل اچھے ہیں۔ آپ میرے خیمے میں ہیں اگر آپ کو کوئی تکلیف ہے تو بتائیے۔ میں انشاءاللہ اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

زخمی : میں یہاں کیسے آیا۔

مغل سردار : محترم بزرگ۔ میں اتفاق سے کسی کام سے میدانِ جنگ

کی طرف سے گزر رہا تھا کہ میرے کانوں میں آپ کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ چند لاشوں میں دبے ہوئے پڑے تھے۔ میں نے آپ کو وہاں سے نکالا اور دیکھا تو آپ میں زندگی کے نشانات پائے جاتے تھے میں نے آپ کی زندگی بچانا اپنا انسانی فرض سمجھا اور میدانِ جنگ سے آپ کو یہاں اُٹھا لایا طبیب ابھی آپ کو دیکھ کر گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کچھ دنوں میں بالکل تندرست ہو جائیں گے!

زخمی سپاہی : آپ کا نام؟

مرد : افتخار مرزا

زخمی سپاہی : آپ مغل ہیں۔

افتخار : جی ہاں۔

زخمی سپاہی : آپ ہمایوں کی فوج میں کسی بلند منصب پر فائز ہیں۔

افتخار مرزا : جی ہاں۔ میں پنج ہزاری ہوں۔

زخمی سپاہی : میری آپ سے ایک معمولی سی درخواست ہے

افتخار مرزا : فرمائیے۔ میں انشاء اللہ اس کو ضرور پُورا کروں گا۔

زخمی سپاہی : میری سب سے بڑی تمنّا اور آرزو یہی ہے کہ آپ مجھے قتل کر کے قتل گاہ میں ڈال دیجیے۔

افتخار مرزا : یہ کیوں؟

زخمی سپاہی : کیونکہ میں ان حالات میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

افتخار مرزا : محترم آپ کن حالات میں زندہ رہنا نہیں چاہتے؟

زخمی سپاہی : میرے محسن اب مجھے آپ سے ہر بات کھُل کر کہنا پڑے گی۔ میرا نام صفدر خاں ہے۔ میں ابراہیم لودھی کے عہد حکومت میں منصب پنج ہزاری پر فائز تھا۔ میرا ایک خوبصورت سا گھر تھا جس میں میری بیوی اور لاڈلی بچی رہتی تھی۔ نوکر، چاکر غلام کنیزوں وغیرہ کی کثرت تھی۔ لیکن بابر نے میری اس خوبصورت اور پُرسکون دُنیا کو اُجاڑ دیا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ بابر چند مہینے رہ کر کابل یا قندھار واپس چلا جائے گا اور پٹھانوں کو اُن کا کھویا ہُوا وقار پھر مل جائے گا۔ اس لیے میں نے اور افغانوں کی طرح بابر کی اطاعت کرنا قبول نہ کیا۔ میں کسی کا نمک خوار رہ کر اُس کی نمک حرامی نہیں کر سکتا تھا اسی لیے میں نے سلطنتِ مغلیہ کو ٹھوکر مار دی اور خود شاہ بنگال کے پاس چلا گیا۔ بابر نے میری جاگیر اور مکانات ضبط کر لیے اور میری بیوی اور بچّی کو آگرہ کی ایک نواحی بستی میں فقیروں کی طرح زندگی بسر کرنا پڑی۔ میں اب بھی محمود خاں اور بایزید کے ساتھ مل کر مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ میرا ایمان تھا کہ مغل پٹھانوں سے زیادہ دلیر اور بہادر نہیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ مغلوں نے پانی پت کی لڑائی میں لودھیوں کو ہرا دیا۔ اگر اب مقابلہ ہُوا تو ہم یقیناً مغلوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے یہ آخری کوشش کی۔ بابر کی موت اور کامران کی حرکتوں سے ہم کو بہت تقویت پہنچی۔ لیکن شاید قسمت ابھی ہم کو غلام رکھنا چاہتی تھی۔ میرے محسن

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ایک وہ شخص جس کی گزشتہ زندگی کا ہر لمحہ مغلوں کے خلاف منصوبے بنانے میں گزرا وہ یہ بات کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں ایک مغل سردار کا مرہونِ منت رہے۔ اس لیے میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ مجھے قتل کر دیں اور مجھے میرے ساتھیوں کے پاس ڈال دیں جہاں وہ آزادی اور اطمینان کی گہری نیند سو رہے ہیں۔

افتخار مرزا : محترم صفدر خاں۔ میں آپ کی اس پُر جوش: بے باک، اور بصیرت افروز گفتگو سے بہت خُوش ہُوا۔ واقعی آپ ایک سچے" محب وطن، قوم کے سچے وفادار ایک بلند شخصیّت اور کردار کے مالک ہیں۔ آپ واقعی آزادئی کامل پر جان دیتے ہیں۔ میں آپ پر یہ بات ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر مغل ایسے جو ہر قابل کی قدر کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ جیسے انسان کو اپنے حفظ وامان میں رکھا اور آپ کو زندہ رہنے کا موقع دیا آپ یقین رکھیے کہ آپ کی آزادی کا کوئی سودا نہ کیا جائے گا۔ آپ سے اس کے بدلے میں کوئی شے طلب نہیں کی جائے گی۔ صحت مند ہونے کے بعد آپ کو جہاں آپ چاہیں جانے کی کامل آزادی ہوگی۔ آپ کے ان نفیس جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے گی آپ کو زندہ رہنا پڑے گا۔ اپنے لیے، اپنی قوم کے لیے اور اپنی" ناہید" کے لیے۔

صفدر خاں : ہاں، ہاں، ناہید۔ میری اچھی بیٹی ناہید۔ ہاں۔ میں اس کے لیے زندہ رہوں گا۔ حکومت کی ہوس نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنی ناہید کو ہندوستان میں ہوتے ہُوتے ۵ سال سے نہیں دیکھا۔ اب تو وہ ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہو گی۔

ہائے خدا معلوم ان دونوں نے یہ دن کس طرح گزارے ہوں گے۔ ناہید تیرا باپ سخت خود غرض انسان ہے۔ اس نے اپنی شہرت، نام اور عزت کی خاطر تجھ جیسی معصوم اور پاکیزہ رُوح کو صدمہ پہنچایا۔ ناہید اب میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔ اب میں باقی عمر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں گا۔

ناہید میں نے سُنا ہے کہ تمھاری ماں صغرا خانم میرا انتظار کرتے کرتے آخر تھک کر سو گئیں۔ اُف۔ میں اس وفا کی دیوی کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ ہائے میں کتنا ظالم ہوں۔ صفدر خاں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو گئی لیکن افتخار مرزا نے ان کو بڑا دلاسہ دیا اور ایک کنیز کو ان کی خدمت پر مامور کر کے خود بھی آرام کرنے چلا گیا۔

باب ۵

عقل بہ حیلہ می بُرد، عشق بُرد کشاں کشاں

محمود خاں لودھی کو شکست دینے کے بعد شہنشاہ ہمایوں نے بہار کا رُخ کیا جس پر شیر شاہ سوری نے قبضہ کر لیا تھا اور مغلوں کے لیے مستقل خطرہ بنتا چلا جا رہا تھا۔ جب شیر شاہ کو شہنشاہ ہمایوں کی فوج کشی کا علم ہُوا تو وہ قلعہ کو اپنے بیٹے جلال خاں کے سپُرد کر کے خود بنگال چلا گیا۔ لشکر ہمایونی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شیر شاہ نے یہ دیکھ کر کہ قلعہ ایک دو دن میں فتح ہو جائے گا شہنشاہ ہمایوں سے صُلح کر لی اور اظہار اطاعت کے طور پر اپنے بیٹے قطب خان کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

اس طرح شہنشاہ ہمایوں فتح و ظفر کے شادیانے بجاتے ہُوئے آگرہ کی جانب روانہ ہُوئے۔ صفدر خان بھی اسی لشکر میں تھا۔ اس کا اپنا لشکر تباہ ہو چکا تھا۔ مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کا دِل کش خواب پریشان ہو چکا تھا اور ہندوستان پر دوبارہ پٹھانوں کی حکومت ——— آرزوؤں کے شیش محل کی طرح چکنا چُور ہو چکا تھا۔ افتخار مرزا اس دُنیا میں اس کا تنہا ساتھی تھا جس نے اس کو موت کے منہ سے

چھین لیا تھا اور اس کو بڑے عزت و احترام سے اپنے کیمپ میں رکھے ہوئے تھا اور اُس کی بیٹی "ناہید" کی تلاش و تجسس میں کئی قاصد روانہ کر چکا تھا۔ صفدر خاں کے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل تھا۔ جب کوئی قاصد ناہید کی تلاش میں جاتا تو صفدر خاں رات دن بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے لیکن جب وہ آکر یہ بتاتا کہ آگرہ میں ناہید کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ تو اس کا دل ڈوب جاتا اور بیٹی سے ملنے کے حسین خواب۔ ذرا دیر میں ختم ہو جاتے۔ اس کا بے اختیار یہی جی چاہتا کہ وہ اپنی شمع حیات کو گل کرے اور اس دُنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر پھرنے لگتے جب وہ ایک چھوٹے سے خاندان کا فرد تھا۔ ایک چھوٹے سے قافلہ کا قافلہ سالار تھا۔ اس کے گھر کے در و دیوار تک کو اس سے محبت اور اُنس تھا۔ اُس کی بیوی تھی۔ بچی تھی، وہ بیوی جو وفا کی پُتلی اور حسن و خوبصورتی کا مجسّمہ تھی اور وہ ناہید جو اس کے کلیجے کا ٹکڑا اور جگر کی ٹھنڈک تھی۔ ان کرب زا حالات میں ایک افتخار مرزا ہی وہ شخص تھا جو صفدر خاں سے گھنٹوں باتیں کرتا اور اس کے غم غلط کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

شاہی لشکر منزل بہ منزل بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ فوج جنگلوں، بیابانوں، چٹیل میدانوں اور کوہساروں کو پار کرتی ہوئی آگرہ سے دس میل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوئی۔ آج ہر سپاہی کا چہرہ ایک غیر معمولی مسرت کی وجہ سے گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا تھا۔ ہر شخص خوش تھا کہ وہ مظفر و منصور اپنے گھر واپس جا رہا ہے اور شہر آگرہ اور اُن کے درمیان ایک منزل رہ

گئی ہے۔ کل بجائے اس چٹیل میدان کے شہر آگرہ میں قیام ہوگا۔ آگرہ کے حسین باغات۔ کشادہ سڑکیں، بلند مکانات اور خوبصورت بازاروں سے لطف اُٹھانے کا موقع ملے گا۔ اور بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل کر کتنی مسرت ہوگی۔

لیکن اس قافلہ میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو نہ سلطنت مغلیہ کی فتح سے کوئی مسرت تھی اور نہ شہر آگرہ میں واپس لوٹنے کا خیال ہی اُس کے دل میں کوئی خوشی کی لہر پیدا کر سکا۔ یہ غریب صفدر خاں تھا جس نے سب کچھ کھولینے کے باوجود کچھ بھی نہ پایا تھا اور مغلوں سے شدید نفرت اور دشمنی کے باوجود اُن کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پُورے کر رہا تھا۔ صفدر خاں اسی طرح سر جھکائے اداس و غمگیں اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ افتخار مرزا اُس کے خیمے میں داخل ہُوا۔

افتخار مرزا : کہیے محترم کیسے مزاج ہیں؟

صفدر خاں : انسان کو ہر حال میں اپنے پالنے والے کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں تمہارا کتنا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے موت کے منہ سے نکالا، لیکن کاش تم نے مجھے مر جانے دیا ہوتا تو میں اس روز روز کے عذاب سے نجات پا جاتا۔

افتخار مرزا : قبلہ۔ اس خدا نے آپ کو حیات نو عطا فرمائی ہے۔ اُس کی اس میں کوئی ضرور مصلحت ہوگی۔ کیونکہ اُس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ ممکن ہے ناہید زندہ ہو اور اس کی سرپرستی کے لیے قدرت آپ کو زندہ

رکھنا چاہتی ہو۔ اس لیے انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ صبر و شکر سے کام لینا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک قاصد کے آنے کی اطلاع ملی۔ افتخار مرزا نے اُس کو خیمے میں طلب کیا اور پوچھا :

افتخار مرزا : کہو۔ ناہید کا کچھ پتہ چلا ؟

قاصد : جی ہاں بہت تحقیق و تلاش کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ناہید کی والدہ کی وفات کے بعد اُس نے وہ گھر تنہائی کے خیال سے چھوڑ دیا اور کسی سہیلی کے پاس چلی گئی ہے، جو دہیں کہیں رہتی ہے۔ یہ سُنتے ہی صفدر خاں نے قاصد سے ہزاروں سوالات کرنا شروع کر دیے۔ اور اُس کی بیتابی میں اور اضافہ ہو گیا —— صفدر خاں نے قاصد سے خود کچھ مزید سوالات کیے اور اُس کو رخصت کر دیا۔

اچانک یہ خبر تمام کیمپ میں بجلی کی طرح پھیل گئی کہ شہنشاہ ہمایوں کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی ہے۔ اس لیے شہنشاہ مکرم کی طبیعت ٹھیک ہونے تک شاہی لشکر اسی مقام پر خیمہ زن رہے گا۔ اس خبر کا یوں تو ہر سپاہی پر بُرا اثر ہُوا لیکن صفدر خاں کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ افتخار مرزا کو جب شہنشاہ ہمایوں کی طبیعت کی ناسازی کا علم ہُوا تو وہ فوراً بارگاہ سلطانی میں حاضر ہُوا۔ اور شہنشاہ ذی وقار کی مزاج پُرسی کے بعد فوجی لباس پہن کر شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

افتخار مرزا گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا چلا جا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا

کہ اگر آگرے میں ناہید کا پتہ نہ چلا تو کیا ہوگا۔ صفدر خاں کے صبر کی طنابیں ٹوٹ جائیں گی اور اس کے لیے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہ ہوگا۔ شام کے وقت وہ آگرہ کے قریب پہنچ گیا۔ اب اُس کو شہر کی مسجدوں کے بلند مینارے اور شاہی محلات نظر آرہے تھے۔ وہ شہر میں داخل ہُوا۔ آگرہ میں زندگی پُورے شباب پر تھی۔ بازار سجے ہُوئے تھے۔ اور لوگ خرید و فروخت میں مشغُول تھے۔ لیکن افتخار مرزا اپنے مقصد کے پیشِ نظر آگے بڑھتا ہی رہا۔ وہ سیدھا اپنے محل کی جانب روانہ ہُوا۔ محل میں پہنچتے ہی اُس نے اپنا سفری لباس اُتارا اور سادہ لباس پہن کر ناہید کی تلاش میں نکل گیا۔

وہ بڑی دیر تک بے مقصد اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں وہ ایک لڑکی کے متعلق کس سے پوچھے اور اس شہر غدارہ میں اس کا کیونکر پتہ چلائے۔ ممکن ہے ناہید مغلوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر کسی اور غیر معروف مقام پر چلی گئی ہو۔ ایسی حالت میں کیا مجھ کو خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ نہیں اس طرح دو زندگیاں تباہ و برباد ہوجائیں گی۔ اُس نے اُمّید کے دامن کو نہ چھوڑا اور لوگوں سے پوچھتے پوچھتے اس نواحی بستی میں آگیا جہاں ناہید اپنی ماں کے ہمراہ رہا کرتی تھی۔

سب سے پہلے اس نے اس پرانے گھر کا پتہ چلایا۔ اُس نے اس شکستہ مکان پر جاکر زنجیر ہلائی۔ تھوڑی دیر میں ایک سیاہ رنگ کا انسان جس کے چہرے پر غربت کے نشانات ہویدا تھے۔ گھر سے نکلا۔ جب مالک مکان نے ایک معزز آدمی کو دیکھا تو بڑا متعجب ہُوا۔ اُس نے

بڑھ کر افتخار مرزا کو سلام کیا۔ افتخار مرزا نے کہا۔ میں تم سے کچھ معلومات حاصل کرنے آیا ہوں تو اگر تم نے میرے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا تو میں بھی تم کو انعام واکرام سے سرفراز کردوں گا۔

مرد : حضور آپ ہمارے آقا ہیں۔ ہم آپ کی رعیت ہیں۔ ہم آپ سے کوئی غلط بات کہہ سکتے ہیں ؟

افتخار مرزا : تم کب سے اس مکان میں رہتے ہو ؟

مرد : حضور۔ میں چھ مہینے سے اس مکان میں آگیا ہوں۔

افتخار مرزا : اس سے پہلے اس مکان میں کون رہتا تھا۔

مرد : حضور یہ میرا مکان ہے۔ میں نے ۸ر آنہ مہینہ پر اس کو کرایہ پر دے دیا تھا۔

افتخار مرزا : کیا تم کرایہ دار کا نام بتا سکتے ہو ؟

مرد : حضور ان کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا۔ اور نہ میں نے کبھی کسی مرد کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھا۔ اس مکان میں شروع سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک ان کی لڑکی رہتی تھی۔ یہ لوگ کچھ عجب پُر اسرار سے تھے۔ نہ اُن کا کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ میں نے اُن کو کسی سے ملتے جُلتے دیکھا۔ دونوں ماں بیٹیاں تنہا زندگی کے دن گزار رہی تھیں۔

افتخار مرزا : تو تم نے اُن کو گھر سے نکال دیا ؟

مرد : نہیں حضور میرے دل میں ان دونوں کی بڑی اِجّت تھی۔ وہ بڑے اچھے لوگ تھے۔ خود فاقہ کرتے۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ مجھے کرایہ وقت پر مل جاتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اُن کی مدد کرنی چاہی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ میں نے

کئی مرتبہ کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ مکان چھوڑنے پر آمادہ ہو گئیں۔ اس طرح چار دفعہ مجھ کو مجبور ہو جانا پڑا۔

افتخار مرزا : اچھا پھر کیا ہوا؟

مرد : ایک دن اس لڑکی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ محلے والوں نے اُس کا غسل و کفن کیا۔ اُس کے چند دن کے بعد میرے پاس اطلاع آئی کہ مکان خالی ہے۔ وہ لڑکی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ چلی گئی ہے۔

افتخار مرزا : کیا تم اس سہیلی کا نام و پتہ بتا سکتے ہو۔

مرد : نہیں حضور۔ بھلا میں یہ سب کچھ کیسے جان سکتا ہوں۔ افتخار مرزا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سونے کے سکّے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے اور کہا :

بھائی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائیں۔

مرد سونے کے پانچ سکّے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کبھی وہ اس سخی کو دیکھتا اور کبھی ان چمکتے ہوئے سکّوں کو دیکھتا۔ بالآخر اُس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

مرد : میرے آقا۔ میں اس طرح آپ کو اکیلا نہ جانے دوں گا۔ آپ جہاں بھی جائیں۔ مجھے اپنے ساتھ رکھیں آپ اس بستی سے ناواقف ہیں بھلا آپ کو کیسے پتہ چلے گا۔ یہاں راستے بھی نہیں ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ راستے غیر ہموار ہیں۔ یہاں میرے ایک دوست رہتے ہیں۔ وہ اس بستی کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں۔ شاید ان کو یہ معلوم ہو کہ ناہید بی بی کس گھر میں ہیں۔ کیونکہ اُن کی لڑکی، کبھی کبھی ناہید کے گھر آیا کرتی تھی۔

افتخار مرزا : یہ تو تم نے بڑی اچھی بات بتائی —— چلو اُس فیل بان کے یہاں چلیں :

دونوں تنگ و تاریک گلیوں اور غلاظت کے انباروں کو پار کرتے چلے جا رہے تھے دونوں خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے۔ آخر بہت سے گندے چھوٹے چھوٹے نالے پھاندے اور کئی گلیوں میں گھومنے اور مڑنے کے بعد وہ ایک کچے مکان کے دروازے پر جا کر ٹھیر گئے۔ مرد نے جمّا کہہ کر آواز دی۔ آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کا انسان باہر نکل کر آیا اور اُس نے پہلے افتخار مرزا اور پھر اس مرد سے مصافحہ کیا۔ دوڑ کر گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھولا اور ایک جگہ کو صاف کر کے ایک مسند بچھائی اور اس کو بڑے خلوص سے افتخار مرزا کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ افتخار مرزا نے شروع سے لے کر آخر تک ناہید کی تلاش کی روداد جمّا کو سنائی اور نہایت پُردرد انداز میں کہا۔ اب تک جو میں نے جدو جہد کی معلومات بہم پہنچائی وہ یہی ہیں کہ شاید وہ لڑکی جس کا نام ناہید تھا مر چکی ہے۔ اب میں آپ کو آخری سہارا سمجھ کر آیا ہوں۔ اگر آپ اس سلسلہ میں کسی بات سے باخبر ہوں تو براہ کرم مجھے بتا دیجیے۔ اگر وہ نہ ملی تو کئی زندگیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔

افتخار مرزا کی مؤثر گفتگو کا بوڑھے پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے کہا۔

جمّا : حضور کو خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ناہید زندہ ہے اور وہ آپ کو ضرور ملے گی۔ یہ کہہ کر بوڑھا گھر کے اندر چلا گیا اور اکبری کو بلا کر کہا کہ ناہید کی تلاش میں کوئی بڑا معزز لڑکا آیا ہے۔ اکبری دوڑی دوڑی ناہید کے پاس آ گئی اور اس کو اتنا گدگدایا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ اس کو خوب نوچنے اور کاٹنے

کے بعد اکبری نے اس کو افتخار مرزا کی آمد کی خبر دی اور شکوہ شروع کر دیا۔

اکبری : ناہید تو بڑی حرّافہ ہے۔ بلکہ شیطان کی خالہ۔

ناہید : یہ تم اپنے خطاب مجھ پر کیوں صرف کر رہی ہو؟

اکبری : مذاق چھوڑو۔ بتاؤ تم نے مجھے اپنے دل کا حال اب تک کیوں نہیں بتایا؟

ناہید : میرے دل کی تم کو خبر ہے۔ خدا معلوم تم آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔

اکبری : ہاں شراب عشق تم نے پی ہے اور بہک میں رہی ہوں۔

ناہید : کیسی شراب عشق۔ یہ تم کو آج کیا ہو گیا ہے؟

اکبری : اچھا تم نہ بتاؤ گی تو سنو۔ تم نے اپنی برق پاش نگاہوں سے کسی کے خرمن دل کو جلا دیا ہے۔ تم نے اپنی تیر نظر سے کسی کے دل کو چھلنی کر دیا ہے۔ تمھارے جمال جہاں آرا نے کسی کو تمھارا والہ و شیدا بنا دیا ہے۔ وہ غریب ساری دُنیا میں ہائے ناہید — ہائے ناہید کے نعرے لگا رہا ہے۔ اور آج کسی طرح آپا حضور کے پاس آ گیا۔ وہ آپا حضور سے تمھارا پتہ پوچھ رہا ہے۔ کیوں اب آیا تمھاری سمجھ میں!

ناہید : اچھا۔ تو وہ دیوانہ۔ یہاں بھی آ پہنچا۔

اکبری : وہ تمھارا دیوانہ کون ہے؟

ناہید : اُس کا نام جمال خاں ہے۔ میرا رشتہ کا بھائی ہوتا ہے۔ وہ بھائی سے زیادہ عاشق بننے کی مشق کیا کرتے تھے۔ مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ وہ نہایت احمق ہے۔

اکبری : ہاں جی۔ محبت کرنے والے احمق ہی ہوا کرتے ہیں۔ نہ وہ احمق ہے نہ تم

احمق تو میں ہوں، کہ اب تک اس ذات شریف سے تعارف حاصل نہ کر سکی۔

ناہید : تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی مصیبتوں سے کب اتنی فرصت ملی کہ میں کسی سے عشق کرتی۔ یہ کام تو بے فکرے لوگوں کے ہیں کہ حسن وعشق کی دُنیا میں سیر کریں۔ یہاں غمِ دوراں ہی کیا کم ہے کہ غمِ عشق کو اور اپنے ساتھ باندھ لیں۔

اکبری : تم لاکھ باتیں بناؤ۔ مگر میں ایسے چکموں میں آنے والی نہیں۔ میں تو تمھارے جمال کی زیارت کے لیے جا رہی ہوں۔ یہ کہہ کر اکبری بیٹھک کے پاس کھسک کر آ گئی اور دروازے کی دراز میں آنکھ لگا کر کھڑی ہو گئی! افتخار مرزا کے یہ الفاظ اس نے سُنے۔

بھائی جیجا۔ اگر آپ نے ناہید کو ڈھونڈ نکالا تو آپ مجھ پر وہ احسانِ عظیم کریں گے جس کے لیے میں آپ کا زندگی بھر ممنون و مشکور ہوں گا۔

اکبری دوڑ کر ناہید کے پاس آئی اور اُس کو زبردستی گھسیٹ کر دروازہ پر لے گئی اور اس کا سر دراز میں کرتے ہوئے بولی۔ لو دیکھ لو اپنے جمال کو، بیچارہ تمھارے عشق میں مرا جاتا ہے!

ناہید نے ایک نظر ڈالی۔ سامنے ایک دوسرا مرد بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا قد متوسط اور بہت اچھا تھا۔ رنگ صاف تھا۔ چہرہ سے شرافت اور بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔ ناہید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کون شخص ہے۔ یہ کس لیے میری تلاش میں سرگرداں و پریشان ہے۔ میں نے تو اُس کو آج تک دیکھا بھی نہیں۔ اس نے مجھ کو کیسے اور کہاں دیکھ لیا۔ بہرحال آدمی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ ناہید کا دل خود بخود افتخار مرزا کی طرف کھنچنے لگا۔

اکبری : ناہید کے چٹکی لے کر، تم کو تو اس جمال سے نفرت تھی اب کیوں دیکھے جا

رہی ہو۔

ناہید : نہیں۔ یہ جمال نہیں کوئی اور ہے۔

اکبری : یہ جمال نہیں جلال ہوگا۔

ناہید : کوئی بھی ہو۔ مگر میں اس کو نہیں جانتی۔

اکبری : پھر وہ تم کو کیوں تلاش کر رہا ہے ؟

ناہید : وہ شاید کسی اور ناہید کی تلاش میں ہوگا۔

ادھر جما کہہ رہا تھا۔ حضور دو دلوں کا ملانا دُنیا میں سب سے بڑا کام سمجھتا ہوں۔ ناہید زندہ ہے وہ اسی گھر میں موجود ہے۔ وہ بڑی پیاری بچّی ہے۔ میں اُس کو اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں ابھی اس کو آپ کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔

افتخار مرزا پر یہ سُن کر شادئ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جو مسرت کسی نابینا کو اچانک اُس کی بینائی لوٹ آنے پر ہوتی ہے۔ یا کسی گم کردہ راہ ور کو راہ پر آجانے سے ہوتی ہے۔ وہی حال افتخار مرزا کا ہُوا۔ اُس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا اُس کے چہرے پر تبسّم رقص کرنے لگا۔ اُس کے دل کی کلی کھلی کھل گئی۔ اُس نے بڑھ کر بوڑھے کے ہاتھوں کو زبردستی پکڑ لیا اور ان کو کئی مرتبہ چوما اور کہا۔ میں آپ کے اس احسان کا کوئی بدلہ دے کر اس کو سستا کرنا نہیں چاہتا۔ کاش اس کا کوئی نعم البدل ممکن ہوتا۔ میرے پاس صرف یہ سونے کے کچھ سکّے ہیں۔ میں یہ اپنے محسن کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا اور اگر زندگی میں مَیں کبھی آپ کے کسی کام آگیا۔ تو اس کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا۔

جمّا: حضور میں نے یہ کسی اجر کے لیے کام نہیں کیا۔ بلکہ اس لیے کہ اس سے میری ناہید کو آرام ملے گا۔ وہ کتنی عزیز ہے مجھ کو۔ یہ کہہ کر جمّا اُٹھ کر مکان کے اندر کی طرف بڑھا اکبری اور ناہید دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جمّا نے آتے ہی کہا۔

"بیٹی ناہید تمھارے والد کے ایک دوست آئے ہیں وہ تم کو تمھارے والد صاحب کے کچھ حالات بتانا چاہتے ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو اُن سے بات چیت کر لو۔"

یہ بات سُنتے ہی ناہید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہزاروں خدشے اور لاکھوں وسوسے اُس کے معصوم ذہن میں گھومنے لگے۔ وہ اب وادیٔ عشق سے دُور چلی گئی تھی۔ اور اُس کے دل میں ایک بیٹی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اُس نے بوڑھے جمّا سے کہا:

چاچا۔ مجھے ان سے گفتگو کرنے کی اجازت دے دیجیے۔
میں اَبّا حضور کے واقعات سُننے کے لیے بے تاب ہوں۔

اور افتخار مرزا بھی اس خُوش خبری سے ہوش میں نہ آیا تھا کہ ناہید غارت گر عقل و ہوش بن کر اُس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ افتخار مرزا گھبرا کر اس کے استقبال کو کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک نظر ناہید کے جوان چہرے پر ڈالی۔ اس وقت ناہید کی نگاہیں بھی اُٹھیں۔ دونوں نگاہیں ٹکرائیں، اور محبت کا ایک دوسرے کو ابدی پیغام دیتی ہُوئی اپنے اپنے مقام پر واپس لوٹ گئیں۔

افتخار مرزا نے اپنی زندگی میں ہزاروں خوبصورت اور حسین عورتیں دیکھی تھیں۔ لیکن خدا معلوم ناہید کے چہرے میں وہ کیا خاص جاذبیت اور کشش تھی کہ وہ چند

منٹ صرف اُس کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ ناہید کا چہرہ گلاب کے تازہ پھول کی طرح کھلا ہُوا تھا۔ اس کا جسم سڈول اور اعضا متناسب تھے۔ افتخار نے دیکھا کہ ایک لعل بے بہا کیچڑ میں پڑا ہُوا ہے اور اپنے وجُود کا اعلان کر رہا ہے۔ ناہید نے آتے ہی کمرے کی فضا کو یکسر بدل دیا۔ وہ بڑی دیر تک اُس کو عالمِ محویت میں دیکھتا رہا آخر ناہید نے جو اس نوجوان کی بے خودی سے دل میں نہایت مسرور تھی، سکوت توڑا۔

ناہید : تشریف رکھیے !

افتخار مرزا کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ کچھ نادم سا ہُوا اور نگاہیں نیچی کر کے بیٹھ گیا۔ ناہید بھی اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

ناہید : کہیے۔ آبا حضور کہاں ہیں ؟

افتخار مرزا : جی ہاں آپ کے والد بزرگوار صفدر خاں صاحب زندہ ہیں۔ لیکن تندرست نہیں !

ناہید : خدا کے لیے اس کی وضاحت کیجیے۔

افتخار مرزا نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بتائے۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ مغل اور وہ مغلوں کے کیمپ میں مقیم ہیں۔ کیونکہ وہ صفدر خاں کی باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ ناہید بھی مغلوں سے نفرت کرتی ہے۔

افتخار مرزا، صفدر خاں کی داستانِ حیات کے اوراق اُلٹ رہے تھے اور ناہید کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ افتخار مرزا کہہ رہے تھے۔ تمھارے والد کی آخری کوشش بھی ناکام گئی۔ ان کے ساتھی بچھڑ گئے، اُن کے دوست مارے گئے۔ افغانوں کو شدید قسم کی شکست ہُوئی۔ خود صفدر خاں کو میں نے اتفاق سے لاشوں کے درمیان

سے الگ کیا۔ اُن کا علاج کیا۔ باہر کے تمام زخم مندمل ہوگئے۔ لیکن اُن کے سینے میں جو بیٹی کی جُدائی اور تنہائی کا زخم تھا وہ نہ بھر سکا۔ اور یہ زخم اُن کو بُری طرح تڑپا رہا ہے۔ وہ اپنی ناہید کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں اُن کے زخم دل کو مرہم کی تلاش میں نکلا۔

ناہید رو رہی تھی۔ افتخار مرزا صفدر خاں کی باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ صفدر خاں اپنی حیات کی بازی ہار چکے ہیں۔ دُنیا میں اُن کے لیے اب کوئی دل کشی نہیں۔ اُن کے دل سے زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوگئی۔ اور ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کریں۔ میں نے کئی قاصد آپ کی تلاش میں روانہ کیے۔ لیکن آپ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ جب اُن کو آپ کی گم شدگی اور نقل مکانی کا حال معلوم ہوا تو زندہ رہنے کی خواہش ان کے دل سے رُخصت ہوگئی۔ اب آپ اور صرف آپ ان میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑا سکتی ہیں اور میرے یہاں آنے کا بھی یہی سبب تھا۔

دروازے کے پیچھے بڑھا جمّا اور اکبری بھی صفدر خاں کی زندگی کے حالات سُن رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔

آخر میں افتخار مرزا نے کہا۔ شاہی لشکر ایک ہفتہ کے اندر اندر شہر میں داخل ہوجائے گا۔ اس کے بعد میں آکر آپ کو شہر لے جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ زندہ و سلامت ہیں۔

ناہید : افتخار صاحب۔ آپ صرف میرے آبا حضور ہی کے محسن نہیں۔ بلکہ میرے بھی محسن ہیں۔ آپ نے مجھے اتنی بڑی دولت دے دی جس کو میں دُنیاوی روپیہ پیسہ سے نہیں خرید سکتی تھی۔ میں آبا حضور کو رو چکی تھی۔ مجھ کو جتنی اطلاعات ملیں وہ

سب یہی تھیں کہ آبا حضور شہید ہو گئے۔

اور اسی لیے میں نے اس گھر میں اپنی عزت و ناموس کو محفوظ دیکھ کر رہنا گوارا کر لیا۔ آپ نے میرے والد صاحب کو موت کے منہ سے بچایا اور مجھے یہ پیغام سُنا کر حیاتِ تازہ بخش دی۔ میں بھی اپنی زندگی سے بیزار تھی —— زندگی میرے لیے ہجوم درد و الم کے علاوہ کچھ نہ تھی۔

اب تک میں ایک بے مقصد اور بیکار زندگی گزار رہی تھی۔ آپ نے مجھے ایک زندگی کا مقصد دیا کہ میں اپنے بیمار اور ضعیف باپ کی خدمت کروں۔ اب تک میں اپنے آپ کو یتیم سمجھتی تھی —— اب خدا کا شکر ہے کہ میرے باپ کا سایہ میرے سر پر موجود ہے۔ آپ نے بتایا کہ میرے والد میری جُدائی سے بے حد پریشان ہیں۔ میں اب جلد از جلد ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہوں۔ افتخار صاحب جہاں آپ نے مجھ پر اور آبا حضور پر اتنے احسانات کیے مجھ پر ایک احسان اور کر دیجیے اور وہ یہ ہے کہ مجھے جلد از جلد والد صاحب سے ملا دیجیے۔ میں اب ایک لمحہ انتظار نہیں کر سکتی۔

افتخار مرزا : مجھے اس میں کیا اعتراض ہے۔ میں صبح پالکی بھیج دوں گا۔ اور ہم کل صبح اپنا سفر شروع کر دیں گے!

ناہید : افتخار صاحب آپ مجھے اپنے ہمراہ گھوڑے پر چلنے کی اجازت دیجیے۔ میں گھوڑے پر سواری کر سکتی ہوں اور وقتِ ضرورت اپنے دفاع میں تلوار بھی چلا سکتی ہوں۔

اتنی دیر میں تجا بھی مکان سے کمرے میں داخل ہوئے ناہید دوڑ کر اُن کے

قدموں سے لپٹ گئی اور کہا۔

ناہید : ابّا جانی۔ ابّا حضور زندہ ہیں۔ وہ بیمار ہیں وہ مجھے دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ مجھے جانے دیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے مایوس ہو کر اپنی زندگی ختم کرلیں اور میں باپ جیسی نعمت کو پاکر اپنی نادانی سے اپنے ہاتھ سے کھودوں۔

جمّا : بیٹی۔ میں کہیں تم کو تمھارے باپ سے ملنے سے روک سکتا ہوں۔ میں خود تمھارے ساتھ چلتا ـــــ لیکن بڑھاپے کی وجہ سے مجبور ہوں خدا تمھارے باپ کا سایہ ہمیشہ تمھارے سر پر رکھے!

باب ۶

محبّت کی خاموش چنگاریاں

تاروں کی قندیلیں روشن ہو چکی تھیں۔ چاند آج اپنی تمام رعنائیوں اور ضوفشانیوں کے ساتھ محوِ خرام تھا۔ چاندنی نے تمام فضا پُرنور کی چادر ڈال دی تھی۔ ذرّے چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایسے عالم میں دو سوار اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں لیے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ کچھ دُور جانے کے بعد مرد نے سکوت توڑا۔

افتخار : ناہید، دیکھو موسم کتنا اچھا ہے۔ یہ چاند، یہ ستارے، یہ ہواؤں کی خنکی، یہ مناظر اور یہ آفاقی سماں ہم کو کسی چیز کی دعوت دے رہا ہے۔

ناہید : گویا۔ فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے۔

افتخار مرزا : اس کا پہلا مصرعہ تو تم ہو ناہید۔

ناہید : اچھا ایسا ہی سمجھ لیجیے!

افتخار مرزا : ناہید دیکھو۔ فطرت اپنی تمام حسن و رنگینی کے ساتھ اس بے بصیرت انسان کو دعوتِ فکر دے رہی ہے۔ اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے مادّیت پرست اور زر و جواہر میں غرق رہنے والے انسان آنکھیں کھول اور

دیکھ کہ تیری یہ مصنوعی مسرت کتنی قلیل ہے۔ یہ سب باتیں عارضی ہیں۔ تیرے تفریح کے طریقوں میں کوئی ثبات نہیں۔ مجھے دیکھو۔ میں نے تیرے لیے کیسے کیسے رنگ و نور کے سامان مہیا کیے ہیں۔ میں روز صبح کو تیرے لیے دامنِ شفق سے لالے کے پھول چُن کر لاتی ہوں۔ شبنم سے پھولوں کا نرم و نازک منہ دھلاتی ہوئی میں عروس شب کی مانگ کو ہمیشہ چمکتے ہوئے ستاروں سے بھرتی ہوں چاند کی کشتی کو آسمان کے نیلگوں پانی میں کھیتی ہوں —— سبزہ سے زمین پر مخمل کا فرش بچھاتی ہوں۔ کیا یہ تمام چیزیں تیری مسرت کے لیے کافی نہیں۔ ہائے کیا موسم ہے۔ کیا وقت ہے۔ کیا سماں ہے۔ کیا خاموشی ہے ؟

ناہید : جی ہاں افتخار صاحب میں آپ سے متفق ہوں فطرت نے اپنی گلکاریوں کے جو حسین باغ لگائے ہیں اُس سے انسان کبھی سیر نہیں ہو سکتا اور خصوصاً جب آپ جیسے باذاق شخص کا ساتھ ہو۔ فطرت بے نقاب ہو۔ پھر تو بے اختیار فطرت کی رعنائیوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے !

افتخار مرزا : نہیں ناہید۔ یوں نہ کہو اس فطرت کا سب سے مکمل سب سے خوش نما اور سب سے شگفتہ پھول تو تم ہو، تم نہ ہوتیں تو یہ ہوا خنک ہوتی لیکن اس میں شراب کی تاثیر نہ ہوتی۔ تم نہ ہوتیں تو شب ماہتاب پھیکی ہوتی تم رنگ بن کر چھا گئی ہو۔ اس کائنات کی اصلی رونق اور بہار تو تمھارے دم سے ہے۔ اس میخانۂ حیات میں ساری مستی تمھاری وجہ سے ہے۔ تم نے میرے دل میں آج ایک نئی لذت، نئی خلش اور نئی کیفیت پیدا کر دی۔ خدا کرے یہ راستہ یونہی چلتا رہے۔ ہمارا سفرِ حیات بھی یوں ہی رواں رہے۔ ہم اسی

طرح چلتے رہیں کتنی حسین ہے یہ رات اور کتنا مبارک ہے یہ سفر جس میں مجھ کو ایک ایسا ہم سفر ملا۔ جس نے میری کائناتِ دل کو جگمگا دیا۔

ناہید : میرے محسن۔ میں تو ایک بدنصیب عورت ہوں۔ میرے دل کو کبھی رنج و الم سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ کوئی اور نقش بھی قبول کرتا۔ آج پہلی مرتبہ یہ کسی کی طرف کھنچ رہا ہے۔ آپ نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے۔ ورنہ میں آنسوؤں کی پژمردہ ہوں۔ مجھے آج معلوم ہُوا کہ زندگی میں خُوشی بھی ہے۔ فطرت بھی مسکرا سکتی ہے۔ چاند بھی خُوش نما ہوتا ہے۔ تارے بھی رقص کر سکتے ہیں اور انسان خُوشی سے دیوانہ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے محسن میرے دل میں زندگی کی رُوح آپ نے پھونکی ہے۔ آپ نے میرے اندھیرے دل کو روشن کر دیا۔ آپ نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ میں ایک افغان خاتُون ہوں۔ میں اپنی عزت کی حفاظت کرنا خُوب جانتی ہوں۔ میں کسی اجنبی مرد سے باتیں کرنا گناہ سمجھتی ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب سے میں نے آپ کی صورت دیکھی ہے میں آپ کی طرف کیوں کھنچی چلی جا رہی ہوں۔

افتخار مرزا : میری اچھی ناہید تم میرے دل کے اندر کا سب سے خوبصورت بُت ہو۔ تم زمین کا سب سے درخشاں ستارہ ہو۔ تم اس کائنات کا سب سے خوبصورت پھُول ہو۔ یہ کائنات تمھاری وجہ سے سجائی گئی ہے دیکھو یہ ستارے تمھیں دیکھ کر مسکرا رہے ہیں —— یہ سبزہ تمھارے قدموں پر لوٹ رہا ہے۔ یہ دریا تمھارے لیے زمین پر پیشانی رگڑ رہا ہے۔ یہ پھُول تمھارے لیے کھِل رہے ہیں یہ فضا تمھاری وجہ سے رنگین ہے آؤ ناہید، گھوڑے

سے کچھ دیر کے لیے اُتر آؤ ——آؤ فطرت کو اُس کے حسین نظاروں کی داد دیں۔

ناہید : بہت بہتر۔

افتخار مرزا اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اُس نے قریب ہی اپنے گھوڑے کو ایک پیڑ سے باندھ دیا اور ناہید کو گھوڑے سے اتارنے کے لیے آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں ناہید رکابوں سے پاؤں نکال کر۔ دونوں پاؤں گھوڑے کی ایک ہی سمت میں ڈالے ہُوئے بیٹھی تھی۔ چاندنی میں اُس کا چہرہ اور جسم آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ افتخار نے آکر ہاتھ بلند کر دیے اور اُس کو اس طرح اُتارا جیسے کوئی شاخ گل سے پھُول آہستہ سے اُتار لیتا ہے۔ دونوں ایک بے خودی اور سرشاری کے عالم میں دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

افتخار پر اس وقت عجیب سرمستی کا عالم طاری تھا۔ وہ گنگنا رہا تھا تھوڑی دیر میں فضا ناہید کے حسن، امیر خسرو کی غزل اور افتخار کے سوز وگداز سے بھر گئی۔

افتخار نے یہ غزل چھیڑ دی:

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش
وقت است خوش بہارہ کہ وقتِ بہار خوش

در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا
مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مضطربے و شرابے و مجرے
جامہ بہ زیر سایۂ شاخ چنار خوش

چیزے دگر مگو و ہمیں گو کہ در چمن

سبزہ خوش است و آب و خوش و جوئبار خوش
با درآں زماں کہ منش راہ می دہد
بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش
سرو بادہ خوش بود اندر چمن ولیک
آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

افتخار مرزا ایک عالمِ کیف میں خسرو کی غزل گا رہا تھا۔ اُس کا محبوب خوش تھا۔ وہ خوش تھا۔ تمام ماحول پر خوشی و مسرت طاری تھی۔ اس لیے امیر خسرو کا ایک ایک شعر نشتر بن گیا تھا۔ افتخار مرزا کا محبوب اس کے سامنے تھا۔ فطرت اپنی حسین آغوش کھولے کھڑی تھی۔ ماحول پر عجیب عالم طاری تھا اور ساری فضا سرخوش و سرشار تھی۔ خصوصاً ناہید کی آنکھوں میں حسن و جوانی کا نشہ جھلک رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بانکپن پیدا ہو گیا تھا جس نے اس کے حُسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ زمین کی گندی اور بیہودہ دُنیا سے اُٹھ کر چاند ستاروں کی دُنیا میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں مسرت ہی مسرت تھی۔ نغمہ ہی نغمہ تھا۔ جہاں شعلہ حسن تھا اور اس کا پروانہ تھا۔ اُس کو یہ بھی نہ محسوس ہُوا کہ یہ کیف زا اور مست کُن نغمات کب ختم ہوئے۔ اور اُس کا جسم کب افتخار کے جسم سے مل گیا۔ اُس کے ہاتھ کب افتخار کے ہاتھ میں آگئے۔ ادھر افتخار بھی دوسری دُنیا میں پہنچا ہُوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملکہ حُسن کے قدموں میں ڈالے ہُوئے تھا اور اُس کے حضور میں ہدیۂ تشکر پیش کر دیا تھا جس نے اُس کے دل کے تحفہ کو قبول کر لیا تھا۔ دونوں بڑی دیر تک اسی عالم میں رہے آخر ناہید نے سکوت توڑا۔

ناہید : افتخار صاحب، آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے، میں تو آپ کو صرف ایک سپاہی سمجھتی تھی لیکن اب معلوم ہُوا کہ آپ کے ترکش میں صرف لکڑی کے تیر نہیں بلکہ شعر و شاعری کے نشتر بھی ہیں۔ آپ خود بھی تڑپ سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی تڑپا سکتے ہیں۔ آپ کے پہلو میں درد بھرا دل اور آپ کے لب و لہجہ میں سوز گداز بھی ہے۔

افتخار مرزا : ناہید، یہ سب تمہارا کرم ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں نغمہ۔ یہ سب انداز گل افشانی گفتار صرف اس لیے ہے کہ تم سراپا صہبا بنی ہُوئی میرے سامنے بیٹھی ہو۔ تم دیوان حافظ کا خوبصورت ترین شعر ہو۔ جو تم کو دیکھے گا سر دُھنے گا!

ناہید : نہیں۔ اس وقت تو آپ ہی کی نغمہ سنجی نے اس کائنات کو مسحور کر دیا ہے۔ ہائے کیا شعر تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقعہ کے لیے یہ اشعار کہے تھے۔

افتخار مرزا : مجھے تو آخری شعر نے بڑا لطف دیا۔

سرو با دہ خوش بود اندر چمن ولیک،

آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

ناہید : اس شعر میں کیا خاص بات ہے :

افتخار : اس میں کون سی خاص بات نہیں ہے۔ عام حالات میں بھی شعر بہت بلند ہے۔ لیکن اس ماحول پر یہ شعر اس شدت سے صادق آتا ہے گویا صرف اس موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سرو بے شک حسین ہے اور میرے معشوق کا قد بھی

سرو کی طرح حسین و دل کش ہے۔ لیکن سرو کے ساتھ یہ نقص ہے کہ اگر اُس کو زمین سے اُکھیڑ لیا جائے تو اُس کا سارا حُسن خاک میں رل جائے۔ لیکن میرے سرو میں یہ خوبی ہے کہ وہ خواہ پیادہ ہو یا سوار، حسین ہی حسین ہے۔ دل کش ہی دکش ہے۔ اُس کے حُسن میں سواری سے نقص پیدا نہیں ہوتا۔ ناہید کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب تم سوار ہوتی ہو تو کچھ اور ہو جاتی ہو اور جب پیادہ ہوتی ہو تو تمھارے حُسن کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے۔ میں نے یہ دونوں کیفیتیں دیکھی ہیں۔ اس لیے اس شعر نے مجھ کو اس درجہ تڑپایا ہے۔

ناہید : آپ اشعار کی تشریح حسبِ منشا کرنا خوب جانتے ہیں۔

افتخار مرزا : ناہید تم بھی کچھ سُناؤ۔

ناہید : مجھے تو لسان الغیب حافظ علیہ الرحمۃ کی ایک غزل یاد ہے۔ اگر آپ کا اصرار ہے تو پیش کرتی ہوں۔

افتخار : اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے ؟

ناہید : بہتر۔

ناہید نے اپنی انتہائی سُریلی آواز میں حافظ کی اس غزل کو شروع کر دیا۔

خوشتر ز عیش و صحبت باغ و بہار چیست
ساقی کجا است گو سبب انتظار چیست
معنئ آب زندگی و روضۂ ارم
جز طرف جوئبار و مئے خوش گوار چیست
ہر وقت خوش کہ دست دہد مغتنم شمار

کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پُرس

اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

افتخار مرزا نے ایک ایک شعر کو کئی کئی مرتبہ پڑھوایا اور ہر مرتبہ اُس کے حُسن سے لطف اندوز ہوتا گیا۔ ناہید کی سُریلی آواز فضا میں گونجتی رہی۔ بڑی دیر تک یہ صحبت رہی۔ اچانک ناہید نے افتخار مرزا سے سوال کیا۔

ناہید : میرے محسن آپ نے اپنے متعلق اب تک مجھے کچھ نہ بتایا حالانکہ آپ میرے تمام حالات سے پُوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔

افتخار مرزا : ناہید میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ میں بندۂ عشق اور تمھارا پرستار ہوں، جس کی شرط مولانا جامی نے یہ مقرر کی ہے ؛

بندۂ عشق شدی ترک نسب کُن جامی

کہ در این راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ناہید : ہنس کر : فلاں ابنِ فلاں کے بجائے، فلاں بنتِ فلاں کہہ دیا جائے۔ تب بھی شعر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے میں آپ کی زندگی کے زیادہ حالات جاننا چاہتی ہوں۔ میری ہر لحظہ بڑھتی ہُوئی عقیدت مجھے اس بات پر مجبور کر رہی ہے۔

افتخار مرزا : اچھا اگر مولانا جامی کو مولانا سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتی ہو تو میں تم کو عمر خیام کا حوالہ دے سکتا ہوں جس نے دُنیا کے ہر شخص کو اس لیے اپنا عزیز کہا ہے کہ وہ انسانیت کے درجہ پر فائز ہے۔

ناہید : آپ نے خیام کا ذکر چھیڑا تو اُس کی ایک رباعی بھی سن لیجیے۔ جو مجھے بے حد عزیز ہے۔

افتخار : نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ضرور عطا فرمائیے۔

ناہید : سُنیے۔

رُباعی

در دہر آں کہ نیم نانے دارد
وز بہر نہفت آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خُوش جہانے دارد

افتخار مرزا : سُبحان اللہ۔ ایک مطمئن اور قناعت پذیر زندگی کا کیا نقشہ کھینچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عالم میں اُس کی شاعری کا پھریرا اُڑ رہا ہے۔ قبولیتِ عام میں خیام حافظ سے کہیں کہیں بڑھ جاتا ہے۔

ناہید : بے شک فارسی میں خیام و حافظ کو بہت بلند مقام حاصل ہے ان ہی نغمہ سرائیوں سے فارسی شاعری کا باغ سدا بہار بنا ہُوا ہے۔ اور جو بھی ان کو دیکھتا ہے محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ مگر یہ پھر آپ نے فارسی شاعری پر تبصرہ شروع کر دیا اور میرے جواب کو گول کر گئے۔ میں اپنے کرم فرما کے متعلق سب کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ جس شخص نے اپنے اخلاق، شرافت اور احسانات سے مجھے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا ہے۔ وہ کون ہے؟

افتخار مرزا : ناہید خدا کے لیے اس سوال کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھو۔

میں اس وقت اس دُنیا میں ہوں جہاں سب سے بڑا، سب سے بلند اور سب سے اُونچا مرتبہ انسانیت کا ہے۔

ناہید : آپ کے انکار نے میرے توسنِ شوق پر ایک تازیانہ کا کام کیا ہے۔ میں آپ کو اپنی جان کی قسم دے کر یہ پُوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟

افتخار مرزا :

چھوڑو یہ ذکر جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

ناہید : خُوب، مگر میں نے تو اپنی جان کی قسم دی ہے۔ یہ آپ کی جان کہاں سے آگئی ہے؟

افتخار : ناہید میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بغیر اس راز کو معلوم کیے نہ مانوگی۔ میں ان کیف زا حالات میں تلخ باتوں کو چھیڑنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن تم نے مجھے مجبُور کر دیا۔ اچھا سنو۔ میں مغل ہوں، شہنشاہ ہمایوں کا مشیرِ خاص ہوں اور پنج ہزاری کے منصب پر فائز ہوں، ناہید کا رنگ پہلے شدّتِ غم و الم سے بالکل سپید پڑ گیا پھر اُس کا چہرہ ایک دم سُرخ ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اُس کا تنفس تیز ہوگیا۔ وہ شعلہ جوالہ بن گئی اور تیوریاں چڑھا کر کھڑی ہوگئی۔

ناہید : افتخار تم مغل ہو، تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم مغل ہو۔ مجھے مغلوں سے سخت نفرت ہے۔ مغلوں نے ہماری حکومت کو تباہ و برباد کیا۔ ہمارے خاندانوں کو ختم کیا۔ ہماری شوکت اور حشمت کو مٹا دیا۔ ہم کو حاکم سے اپنا محکوم بنا لیا۔ ہم کو بلندیوں سے پستی میں دھکیل دیا۔ ہم کو شہنشاہ سے گدائے بے نوا بنا دیا، ہم کو آقا

سے غلام کر دیا۔ کیا پھر بھی میں کسی مغل کو اچھی نظروں سے دیکھ سکتی ہوں ؛ قوم کو چھوڑو ان گزشتہ ۵ سال میں میں نے ان مغلوں کے ہاتھوں کیسی کیسی اذیتیں برداشت کیں۔ کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں۔ کیسے کیسے صدمے سہے۔ میری ماں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی۔ میں نے ۵ سال ایسی خوفناک مفلسی میں بسر کیے جس کے تصوّر سے میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے شفیق باپ کی شکل کو ترس گئی۔ یہی مغل ہیں جنھوں نے مجھے اور میرے خاندان کو تباہ کیا۔ اب تم میرے پاس کیوں آئے۔ میری شوکت کو لُوٹنے والے۔ میری حکومت کو لُوٹنے والے۔ میرے خدم وحشم کو لُوٹنے والے۔ میری حکومت کو لُوٹنے والے۔ بتاؤ تم اب اس غم زدہ کے پاس کیوں آئے ہو۔ کیا تم میری ناموس اور عزت کو بھی لوٹنا چاہتے ہو۔ اُف۔ تم کس قدر خوبصورت دشمن ہو اور کتنے حسین حربے استعمال کرتے ہو۔ آہ، تم نے میرے وجُود کو ہلا دیا۔ تم نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ کہیں تم مجھ کو فریب تو نہیں دے رہے ہو۔ میں اپنے باپ کی بلند شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں وہ کبھی کسی مغل کا احسان نہ لیں گے۔ تم مجھ کو دھوکا دے رہے ہو تم مجھ کو اپنی حراست میں لینے کے لیے یہ شاطرانہ چالیں چل رہے ہو۔ دُور ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے۔ میں کسی مغل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھنا چاہتی۔

افتخار مرزا : اے حُسن کی شہزادی اور میرے دل کی ملکہ ناہید مجھ سے بدظن نہ ہو۔ میں مغل ہوں، لیکن ہر مغل کو بُرا سمجھ لینا مناسب نہیں۔ میں تو تمھارا ادنیٰ خادم ہوں میں تو تمھارے التفات پر زندہ ہوں، اگر تم نے مجھے اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا تو خدا کی قسم میں اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔

ناہید تم سمجھتی ہو کہ میں تم کو فریب دے کر اسیر کرنا چاہتا ہوں۔ میری شہزادی میں تو خود تمھاری زلف گرہ گیر کا اسیر ہوں۔ میں تم کو کیونکر اسیر کر سکتا ہوں بھلا میں تم کو کیونکر فریب دے سکتا ہوں۔ ناہید میں مانتا ہوں کو مغلوں کی وجہ سے تم پر ظلم وستم ہوئے۔ شاید میں اس گناہ کا کفارہ ادا کر سکوں۔ شاید میں ان ستم زدہ لوگوں کے کام آسکوں جو میری قوم کی وجہ سے برباد ہوئے اور یہی جذبہ مجھ کو یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ ناہید اگر تم مجھ کو ایک ذلیل اور ناپاک ارادہ کا انسان سمجھتی ہو۔ تو یہ خنجر لو اور میرے ناپاک وجود سے دنیا کو خالی کر دو۔ یہی معراجِ عاشقی ہے۔ یہی عید نظارہ ہے۔ بڑھو ناہید۔ کیا سوچ رہی ہو۔ مجھے قتل کر دو۔ میں پہلا مغل ہوں جو تمھاری زندگی میں آیا۔ تم میری قوم کا تمام غم وغصہ مجھ پر اُتار لو۔

ناہید کا غصہ اُتر چکا تھا اور اُس کے دل پر رنج وغم کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اُس کی پلکوں پر ستارے رقص کر رہے تھے۔

اب بھی وہ سوار جا رہے تھے۔ وہی چاندنی تھی۔ وہی سماں تھا۔ وہی دو رویہ پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ لیکن خدا معلوم ہر چیز کیوں اُداس تھی۔

ناہید کی آنکھیں سُرخ اور چہرہ لٹکا ہوا تھا وہ تصویر درد بنی ہوئی تھی۔ افتخار مرزا بھی مجسّمہ غم بنا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں وہ دونوں سوار خاموشی کے ساتھ شاہی کیمپ میں داخل ہو گئے۔

باب ۷

شیر شاہ سُوری کا عروج

شاہی کیمپ میں ہر طرف سنّاٹا نظر آتا ہے۔ رات کے ۱۱ بجے ہیں۔ نیند نے ہر سپاہی کو تھپک تھپک کر سُلا دیا ہے لیکن ایک خیمہ میں ابھی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ صفدر خاں اور ناہید ہیں جو پانچ سال کی طویل مُدّت کے بعد ایک دُوسرے سے ملے ہیں۔ جب تک ناہید اپنی داستانِ غم سناتی رہی۔ صفدر خاں آنسو بہاتے رہے۔ اس کے بعد صفدر خاں نے اپنی داستان سُنانی شروع کی۔

صفدر خاں: ناہید تم نے مجھ سے یہ برمحل سوال کیا کہ میں نے ایک مغل سردار کا احسان کیوں اُٹھایا۔ اور اپنی ضد پر اپنی وفا شعار بیوی کو قربان کرنے کے بعد اپنے ان سخت قوانین کو کیوں توڑا۔ ناہید۔ جب تک ہمارا مغلیہ فوج سے مقابلہ نہ ہُوا تھا اور ہم ایک آخری ٹکر لینے کی جد وجہد کر رہے تھے ——— اس وقت تک اُمید کی شمع ہمارے دل میں روشن تھی اور اس اُمید کے سہارے ہم لوگ بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار تھے۔ لیکن اس شکست نے ہم سے ہمارا یہ آخری سہارا بھی چھین لیا۔ دُوسرے اس میں میرا اپنا کوئی ذاتی فعل نہ تھا۔ میں لاشوں کے نیچے دبا ہُوا تھا ایک مغل

سردار نے مجھے وہاں سے نکالا اور اپنے کیمپ لے گیا۔ میں زندہ رہنے کی تمنا ختم کر چکا تھا، لیکن اُس نے مجھے میرا فرض یاد دلایا۔ ناہید وہ میرا فرض، تم تھیں۔ تمھاری پرورش، تمھارا خیال، جب تک قوم زندہ تھی میں اپنے گھر کے مفاد کو قوم پر قربان کرتا رہا اب قوم کی حیثیت سے ہمارا وجُود ختم ہو گیا اس لیے ہم کو اپنے گھروں میں دلچسپی لینا چاہیے۔

ناہید : اَبّا حضور۔ میں آپ کی افتادِ طبع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ عام حالات میں کبھی کسی مغل کے زیر بار احسان ہونا پسند نہ کریں گے لیکن ان حالات میں انسان کو اپنے آپ کو مشیت کے سُپرد کر دینا پڑتا ہے۔

صفدر خاں : نہیں ناہید۔ میں خودکشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن تمھارے اُوپر یہ صرف افتخار مرزا کا احسان ہے کہ اُس نے اس وقت تمھاری طرف سے مجھے پکارا اور مجھے یہ احساس دلایا کہ میں ایک معصوم بچی کو دُنیا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ ناہید یہ افتخار مرزا بڑا شریف اور نیک ہے اُس نے میری ایسی خدمت کی کہ اگر کوئی میری اپنی اولاد ہوتی تو بھی شاید اس سے زیادہ نہ کر سکتی۔ اور گو وہ ایک مغل ہے پھر بھی اس کے خلوصِ محبّت، شرافت کی وجہ سے میں اس کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں اور اپنے کلیجے کا ایک ٹکڑا ہی متصوّر کرنے لگا ہوں۔

ناہید : لیکن جب سے میں آئی ہوں۔ وہ آپ کے پاس بہت کم آتے ہیں۔

صفدر خاں : بیٹی وہ بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔ وہ تمھارے خیال سے نہیں آرہا ہوگا کہ کہیں اُس کی وجہ سے تم کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں کل اس کو ضرور بلواؤں گا۔

ناہید : جی ہاں ابا حضور وہ ہمارے محسن ہیں ہم کو اُن کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔

صفدر : بے شک ہم کو اپنے محسن کے کام آنا چاہیے!

ناہید : ابا حضور کیا پٹھان قوم میں اب ایسا کوئی شخص نہیں، جس کے جھنڈے کے نیچے پوری افغان قوم جمع ہو سکے اور مغلوں کو ہندوستان سے نکال دے۔

صفدر خاں : بیٹی۔ خدا میں بڑی قدرت ہے۔ وہ مُردے میں جان ڈال سکتا ہے۔ میری نظر میں افغان قوم میں صرف ایک جوہر قابل شیر شاہ ہے جو افغان قوم کو حیاتِ نَو بخشنے کی جد و جہد کر رہا ہے۔

ناہید : ابا حضور مجھے اُن کی زندگی کے کچھ حال سُنایئے۔

صفدر خاں : بیٹی قدرت کے کام عجیب ہیں۔ جہاں انسان کی تمام اُمیدیں اور آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ قدرت وہیں ایک ایسا موقع فراہم کر دیتی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے مشکل اور کرب زا حالات میں قدرت اتنے پُر اسرار طریقہ سے انسان کی مدد کرتی ہے جہاں انسان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ انسان اپنی کوشش پیہم کی شکست کے بعد اس تائید غیبی سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی بھی صلاحیت باقی ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ اشارہ کس کا ہے اور یہ کون اس کی مدد کر رہا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ بہت سی قومیں برابر شکستیں اُٹھانے کے بعد اپنے آپ کو مُردہ اور بے جان تصور کر لیتی ہیں۔ لیکن قدرت اس مردہ قوم میں کوئی ایسا فرد پیدا کر دیتی ہے جو ان کے انتشار کو تنظیم میں اور اُن کی ناکامیوں کو

کامیابیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

یہی حال افغانوں کا ہے۔ پانی پت کی جنگ کے بعد دریائے سینی پر دوبارہ افغانوں اور مغلوں کا مقابلہ ہُوا اور مغلوں نے اپنی دانست میں اُن کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔

لیکن مشیت کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے افغانوں کو سر بلند کرنے کے لیے شاید اُس نے شیر شاہ کو منتخب کر لیا ہے۔ اب میں تم کو شیر شاہ کی زندگی کے کچھ دلچسپ حالات سُناتا ہوں۔

ناہید : ضرور

صفدر خاں : ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ آفتاب اپنی دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکے ماندے مسافر کی طرح افق مغرب میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اس وقت ایک پہاڑی کی چٹان پر کچھ لوگ بیٹھے ہُوئے تھے۔ یہ لوگ سپاہی تھے۔ ان کے لباس سفید رنگ کے تھے۔ یہ لوگ ایک پاجامہ اُس پر ٹخنوں تک یا اس سے کچھ اُونچی چوڑے دامنوں والی قمیص۔ قمیص پر واسکٹ سر پر کلاہ اور کلاہ پر صافہ باندھے ہُوئے تھے۔ اُن کے قد لمبے، رنگ صاف اور پٹھے کٹے ہُوئے تھے۔ یہ سب افغان تھے جو اپنا قومی لباس پہنے ہُوئے تھے۔ زیادہ تر لوگ ادھیڑ عمر تھے۔ لیکن ان میں ایک خوبصورت جوان بھی تھا۔ یہ سب پہاڑی سے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک اُنھوں نے ایک آدمی کو بھاگتے ہُوئے دیکھا اور ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔

نوجوان : ارے یہ تو مغل ہے مغل۔

دُوسرا : ہاں مغل ہے۔ لیکن یہ ایسا بھاگا جا رہا ہے جیسے تمام راجپوت اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

اس پر سب نے پھر قہقہہ لگایا۔

تیسرا : کچھ بھی ہو اُن کی رفتار سے شان نظر آتی ہے۔

نوجوان : تحقیر آمیز لہجہ میں۔ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان میں شان تو ہے۔ مگر خواجہ سراؤں والی۔

تیسرا : ہنس کر۔ یہ خواجہ سراؤں والی شان کیسی ہوتی ہے۔ نوجوان نے بُرا سا منہ بنا کر کہا :

نوجوان : کیا بہادروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ لباس دیکھو تو زنانہ گھیر دار پاجامہ اس پر چُست قمیص جو پاجامہ کے اندر گھُس رہی ہے کمر میں پٹکا باندھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گلے سے ٹخنوں تک ایک ہی چیز پہنے ہوُئے ہیں۔ یہ مغلوں کا لباس ہے۔ مجھے تو اس میں زنانہ پن ہی دکھائی دیتا ہے۔

پہلا شخص : معلوم نہیں تمھیں مغلوں سے کیوں بیر ہے۔ تم کبھی کوئی کلمۂ خیر اُن کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ ان کی برائی کرتے ہو۔

نوجوان : مجھے تو مغلوں میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔ لباس وہ عجیب، حرکتیں وہ عجیب، چال ڈھال وہ عجیب، طور طریقے وہ بھی عجیب، غرضکہ وہ مجموعی طور پر عجیب و غریب ہوتے ہیں۔

دُوسرا شخص : اس میں شک نہیں کہ ان کی بعض باتیں عجیب ہیں۔ لیکن ان کو بہادر تو ماننا ہی پڑے گا۔ کم از کم وہ ہماری افغان قوم سے زیادہ محنتی،

جفاکش اور بہادر ہیں۔

نوجوان نے چلاّ کر کہا : یہ کیا بکواس ہے۔ مغل اور افغان سے بہادر، اس کا فتویٰ ایک افغان دے رہا ہے۔ تم کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

تیسرا شخص : اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ مغلوں نے افغانوں کو شکست دی اور اُن کی ہڈیوں پر اپنے ایوان تعمیر کیے۔ کیا بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست نہیں دی۔

نوجوان : میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ مغلوں نے افغانوں کو شکست دی لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ مغل افغانوں سے زیادہ بہادر ہیں۔ مجھے ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس جنگ میں مغلوں کی بہادری زیادہ ہے یا افغانوں کی اپنی غداری اور بدنصیبی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس وقت افغان قوم کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ افغان سردار شہنشاہ ابراہیم لودھی کے خلاف ہو گئے کیا یہ حقیقت نہیں کہ افغانوں کی مرکزی قوت کو زوال آ گیا۔ اگر افغان پہلے کی طرح متحد رہتے تو مغلوں کو ہندوستان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بابر کی کیا مجال تھی کہ ہندوستان کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا اور افغانوں پر حکومت کا خیال اس کو کبھی نہ آتا۔

پہلا شخص : (فرید خاں) شیر خاں تم سچ کہتے ہو ہم نے اپنی نا اتفاقی اور آپس کے جھگڑے اور فساد سے حکومت کو کھو دیا۔

شیر شاہ : محترم بزرگ۔ آپ ہی بتایئے۔ کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ شہنشاہ ابراہیم کے چچا علاؤ الدین نے حکومت حاصل کرنے کی

بے جا ہوس میں بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی —— کیا دولت خاں نے لالچ میں پھنس کر بابر کو ہندوستان فتح کرنے کا دعوت نامہ نہیں بھیجا۔ بھائیو۔ ہم نے اس گھر میں خود ہی آگ لگائی اور اب خود ہی شور مچا رہے ہیں۔ اس گھر کی تباہی میں غیروں سے کہیں زیادہ اپنوں کا ہاتھ ہے۔

پہلا شخص : فرید۔ تم ٹھیک کہتے ہو ہم نے اپنی حکومت کی بُنیادوں کو خود اکھیڑ کر پھینک دیا تاکہ دوسرے اس پر اپنی شاندار اور مضبوط حکومت تعمیر کر سکیں۔

شیر شاہ : اور اس نا اتفاقی، خود غرضی، ہوا و ہوس اور لالچ کا نتیجہ نکلا کہ ہم فرماں روا سے محکوم، آقا سے خادم اور آزاد سے غلام ہو گئے۔

ایک سن رسیدہ بزرگ نے کہا : اب تو ہماری قسمت میں محکومی و غلامی لکھ دی گئی ہے۔

شیر شاہ : یہ نہایت بُزدلی اور کم ہمتی کی باتیں ہیں۔ ہم کو اپنی اس حالت پر قانع نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے مغلوں کو رزم و بزم ہر جگہ دیکھا ہے۔ وہ بہادر اور جنگجو ہیں۔ اگر پُوری افغانی قوم منظم و متحد ہو جائے۔ خدا کی رحمت شامل حال ہو اور قسمت ساتھ دے تو میں اکیلا مغلوں کو ہندوستان سے نکال سکتا ہوں۔ یہ سُنتے ہی تمام افغانوں نے جو بڑی دیر سے شیر شاہ کی یہ تقریر سُن رہے تھے۔ ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ایک بزرگ نے شیر شاہ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔

بزرگ : فرید۔ (شیر شاہ، خدا کے لیے اپنی زبان کو لگام دو۔ اگر مغلوں نے ان باتوں کو سُن لیا تو ہم سب پر مصیبت آ جائے گی۔

شیر شاہ: محترم بزرگ۔ میں مغلوں سے نہیں ڈرتا۔ قبلہ میرے دل میں ایک عرصہ سے ہندوستان فتح کرنے کی آرزو کروٹیں لے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ میری خواہش پوری اور میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔ اس بات پر تمام افغانوں نے پھر ایک قہقہہ بلند کیا اور ایک نے کہا۔

پھر تو فرید خاں (شیر شاہ) تم شہنشاہ ہند ہو جاؤ گے۔ اور لوگ تم کو ظلِ سبحانی خلیفۃ الزمانی۔ حضرت شیر شاہ سوری اور خدا جانے کیا کیا کہا کریں گے!

اس پر محفل قہقہوں سے گونج گئی۔

فرید خاں (شیر شاہ) کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کو اپنے ساتھیوں کا یہ مذاق بہت ناگوار گزرا۔ اُس نے بڑی تلخی سے کہا۔

شیر شاہ: تم سب میری باتوں پر ہنس رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھاری ہمتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ تمھارے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ تمھارے دلوں میں ولولے اور ولولوں میں جوش باقی نہیں رہا۔ یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ ہماری سلطنت ہم سے چھن گئی۔ ہماری عزت وعظمت خاک میں مل گئی۔ ہم حاکم سے محکوم۔ شاہ سے گدا اور فرماں رواسے غلام بن گئے۔ ہم آج غلام ہیں۔ ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اسی ملک میں جہاں بانی کی ہے۔ یہ بڑی غیرت کی بات ہے۔ افسوس افغانی قوم کی غیرت جس کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ کہاں گئی۔ اب افغانی قوم کی مثال اس لُٹے ہوئے قافلے کی ہے جسے اپنے لُٹنے کا غم بھی نہیں۔

ایک افغان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بھئی یہ نوجوان ہیں۔ ان کی رگوں میں گرم خون دوڑ رہا ہے اس لیے ان کو دُور کی سوجھتی ہے ہم بھلا ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں۔

شیر شاہ : کاش تم بلند ہمت ہوتے۔ کاش تم پستی کے بجائے بلندیوں کا خیال رکھتے۔ اگر آج بھی ہم کمرِ ہمت باندھ لیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم مُردوں کو بغیر صور اسرافیل کی مدد کے زندہ کر سکتے ہیں۔ ہم افغان قوم میں ایک نئی رُوح پھونک سکتے ہیں۔

دوسرے افغان نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

بھائی بات یہ ہے کہ ہمارے فرید خاں (شیر شاہ) نے اپنے والد کی حیات میں سہرام کی جاگیر کا انتظام بڑی حسن و خوبی سے کیا تھا اس سے اُن کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ مغلیہ سلطنت کو بھی سنبھال سکتے ہیں۔ اس پر سب نے زیرِ لب مسکرانا شروع کیا۔ فرید خاں جل گیا اور اُس نے کہا :

شیر شاہ : تم ہنسو یا مذاق اڑاؤ۔ میں تمھاری باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ میں اپنے ارادوں میں اٹل اور اپنے خیالات میں بلند ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگر افغان قوم متحد و متفق ہو جائے تو ہم مغلوں کو ضرور ہندوستان سے نکال سکتے ہیں اور اس طرح ایک مرتبہ پھر افغانوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ توڑ کر ان کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت دے سکتے ہیں۔

ایک بوڑھے افغان نے بڑی محبت اور شفقت سے فرید خاں کو سمجھایا۔

بوڑھا : فرید خاں۔ تم میرے عزیز ترین دوست حسن کے لختِ جگر ہو اس لیے میں تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ جب میں نے تم کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ تمھاری پیشانی اور بشرہ سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ تم ایک نہ ایک دن بڑے آدمی ہوگے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تم کو ایک منصبِ بلند پر دیکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ تم اس سے بھی زیادہ ترقی کر جاؤ۔ لیکن میرے عزیز ہندوستان کی حکومت کا خواب نہ دیکھو اس میں تمھاری جان کو خطرہ ہے۔

دوسرے اپنی زبان کو بند رکھو کیونکہ دُنیا میں حاسد اور دشمن زیادہ اور حقیقی دوست کم ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

شیر شاہ : مشکل یہ ہے کہ میں ذرا صاف گو واقع ہُوا ہوں، جو بات میرے ذہن میں آجاتی ہے اس کو بے تکلف کہہ دیتا ہوں۔

بوڑھا : لیکن شیر خاں ایک بڑے انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ موقع اور محل کو دیکھ کر بات کرے۔ اور اپنے خیالات اور جذبات پر پوری قدرت رکھتا ہو۔

شیر خاں : آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں انشاء اللہ آئندہ اس کی احتیاط کروں گا۔

بوڑھا : شیر خاں ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو اس وقت ظہیرالدین محمد بابر شہنشاہ ہندوستان ہیں اگرچہ انھوں نے ہم سے حکومت لے لی لیکن انھوں نے من حیث القوم ہم کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ہماری طاقت کو نہیں توڑا۔ خواہ مخواہ ہم کو پریشان نہ کیا۔ سلطنت آنے جانے والی چیز ہے آج ایک کے پاس ہے۔ کل دوسرے کے۔ لیکن ایک بلند انسان اس

قوم کو اپنے اخلاق و مراعات سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ حکومت حاصل کرے اُس کے برخلاف ایک سرکش انسان اپنے محکومین کو سخت سے سخت اذیتیں دیتا ہے۔ بابر نے افغانوں کی عزت کو برقرار رکھا اس نے ان کو فوج میں اعلیٰ عہدے دیئے اور ہماری جاگیروں کو قائم رکھا محض اس لیے کہ وہ بھی مسلمان ہے اور ہم بھی مسلمان ہیں۔ حکومت لینا اور بات ہے۔ لیکن قوم کو تباہ و برباد کر دینا دوسری شے ہے۔ انھوں نے بزورِ شمشیر ملک حاصل کیا۔ لیکن ہماری قوم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ خدا نے ہماری حکومت کی باگ ڈور دست بابری میں دے دی۔ لیکن اُنھوں نے اس طاقت کا غلط استعمال نہیں کیا۔ اس لیے ہم کو بھی وفاشعار رعایا اور سچے مسلمان کی طرح اُن کی عزت کرنا چاہیے۔ اور اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے قوم کے وقار کو ٹھیس پہنچے اور وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔

شیر شاہ: محترم آپ کی باتوں نے مجھ پر بڑا اثر کیا میں شہنشاہ بابر کی اطاعت کرنے کی کوشش کروں گا۔

بوڑھا: بیٹا شیر خاں۔ خدا تم کو منصب بلند عطا کرے۔ میری باتوں سے بد دل نہ ہونا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تمھاری ہی بھلائی اور بہبودی کے لیے کہا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ خدا نے تم کو وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں کہ تم دُنیا میں بڑے سے بڑا مرتبہ حاصل کرنے کے اہل ہو۔ میں تمھاری اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہم افغانوں میں آپس میں اتفاق و اتحاد نہیں۔ ہم نے اس نااتفاقی کی وجہ سے اتنی عظیم مملکت کو کھو دیا۔ لیکن اب بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں۔ اب

بھی ہمارے قبیلوں اور جرگوں میں ایک دوسرے کے خلاف زہر بھرا ہُوا ہے۔

شیر شاہ: میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس نفاق کی خلیج کو جلد از جلد پاٹ دوں۔

بوڑھا: بیٹا شیر خاں۔ اگر تم نے یہ کام کر لیا تو تم اپنی قوم پر بڑا احسان کروگے!

اسی وقت نقاروں کی آواز پہاڑی پر گونجنے لگی۔ یہ سب لوگ کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک مغل فوج ایک پہاڑی سے اُتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھ رہی ہے۔ ان کا لباس اور ہتھیار جگمگا رہے تھے۔ شیر خاں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔

شیر خاں: آپ نے اس مغل دستہ کو دیکھا۔

شیخ ابراہیم: ہاں دیکھ رہے ہیں۔

شیر خاں: ان سپاہیوں کی رفتار سے استقلال اور جرأت ظاہر نہیں ہوتی۔ اگر افغانی دستہ ہوتا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔

شیخ ابراہیم: تمھیں مغلوں سے خواہ مخواہ کا بیر ہے۔ تم کو ان کی اچھی چیز بھی بُری ہی نظر آتی ہے۔

شیر شاہ: یا شیخ مجھے مغلوں سے تعصب نہیں بلکہ میں ان کے رنگ ڈھنگ بڑی توجہ سے دیکھ رہا ہوں۔ اگر آپ بھی میری نظر سے ان کی حرکات کو دیکھیں تو میرے ہم خیال ہو جائیں۔

شیخ ابراہیم: شاید تم نے بابر کی زندگی کے حالات کا مطالعہ نہیں کیا وہ کتنا جفاکش، محنتی اور دلیر انسان ہے!

شیر خاں: میں جانتا ہوں۔

شیخ ابراہیم: پھر تم کیوں ہر وقت بابر اور اس کی سپاہ کی برائیاں کرتے رہتے ہو۔

شیر خاں: یا شیخ میں برائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت کا اظہار کرتا ہوں میں نے چند دن مغلوں کی صحبت میں گزارے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مغل بہادر اور مستقل مزاج نہیں ہوتے۔ میں نے کئی لڑائیوں میں ان کو پرکھا ہے ان میں ثبات و قرار نہیں۔

شہنشاہ بابر اپنے آپ کو سب سے زیادہ عالی نسب اور شریف سمجھتے ہیں۔ وہ ملکی معاملات میں خود دلچسپی نہیں لیتے بلکہ انھوں نے اپنے امراء اور ارکین سلطنت کو ملک کے انتظام کا مدار بنا دیا ہے۔ وہ اپنے امرأ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور ان کی رائے قول فیصل ہوتی ہے۔ وہ خود رعایا کا حال معلوم کرنے یا ان کے فلاح و بہبود کے متعلق سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امرأ سپاہیوں سے، رعیت اور قابو یافتہ زمینداروں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُن کے عہد میں دولت مند اپنی دولت سے اپنے ہر مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے اور جس کے پاس دولت نہیں وہ زبان تک نہیں ہلا سکتا۔ یہ طریقہ حکومت کا نہیں۔ اس سے سپاہی بددل رعایا مخالف اور زمیندار ظالم ہو جاتے ہیں۔ اگر خدا نے میری سُن لی۔ قوم نے میرا ساتھ دیا تو آپ دیکھیں گے کہ میں کس آسانی سے مغلوں کو ہندوستان سے نکالتا ہوں اور افغانوں کی حکومت ایک مرتبہ پھر اس سر زمین میں قائم کروں گا۔ یہی نہیں بلکہ میں یہ بھی بتاؤں گا کہ سلطنت کس طرح کی جاتی ہے۔ لڑائیاں کیسے لڑی جا سکتی ہیں اور

ملک میں امن و امان کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔

شیخ : یہ ناممکن ہے کہ مغل ہندوستان کو چھوڑ دیں۔

شیر شاہ : انسان کی جرأت اور ہمت۔ استقلال اور عزم۔ ہر ناممکن چیز کو ممکن بنا سکتا ہے۔

صفدر خاں : بیٹی ناہید تم کو نیند تو نہیں آ رہی ہے۔

ناہید : نہیں ابا حضور۔ آپ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کر دیا جس کا ایک ایک لفظ انسان کے جسم میں زندگی دوڑا دیتا ہے۔ میں اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئی۔ مہربانی فرما کر مجھے شیر شاہ سوری کی زندگی کے کچھ حالات اور سنائیے۔

صفدر خاں : اچھا۔ اب میں تم کو شیر خاں کی زندگی کا ایک اہم واقعہ سُناتا ہوں۔

سلطان جنید برلاس امراء بابری میں بلند مقام رکھتے تھے۔ جس وقت شیر خاں کے عزیز اس کو اس کی موروثی جائیداد سے الگ کر دینا چاہتے تھے تو یہ سلطان جنید برلاس ہی تھے جنھوں نے شیر شاہ کی مدد کی اور اپنی فوج دے کر شیر شاہ کا حوصلہ بڑھایا۔ اس لیے شیر خاں سلطان جنید برلاس کو اپنا محسن سمجھتے تھے اور ان کے ملازمین خاص کے زمرہ میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک دن سلطان نے شیر خاں سے کہا۔

سلطان : شیر خاں آج شہنشاہ بابر نے ہم کو دستر خوان شاہی پر مدعو کیا ہے۔ تم بھی ہمارے ہمراہ چلو۔

شیر خاں : میں حضور کو اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ حضور نے مجھے ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ میں حضور کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن حضور مجھے اپنے ہمراہ شاہی دسترخوان پر نہ لے چلیں تو بہتر ہے۔

سلطان جنید برلاس : کیوں؟

شیر خاں : میں ایک گنوار آدمی ہوں۔ خدا معلوم شاہی دسترخوان پر کون سی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جس سے آدابِ شاہی میں فرق واقع ہو جائے۔

سلطان جنید برلاس : شیر خاں تم اپنے آپ کو گنوار آدمی کہتے ہو حالانکہ تمھاری باتیں بڑی پر حکمت اور تمھارے مشورے بڑے مدبرانہ ہوتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ کوئی ایسی بات تم سے سرزد نہ ہو گی کہ شہنشاہ بابر تم سے ناراض ہو جائیں۔

شیر خاں : حضور والا اگر آپ میری جان طلب کریں وہ بھی میں بے دریغ آپ پر نثار کرنے کے لیے تیار ہوں آپ نے اس وقت میری مدد کی جب کوئی دوسرا مددگار نہ تھا اور مجھے تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ میں نے یہ صرف اس خیال سے کیا تھا کہ کہاں ایک اجڈ سپاہی کہاں ظلِ سبحانی ممکن ہے مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے۔

سلطان جنید برلاس : ہم جانتے ہیں کہ شیر خاں جیسی شخصیت کا انسان غلطی نہیں کر سکتا اور اگر بفرض محال ایسی کوئی بات ہو بھی گئی تو شہنشاہ بابر اس پر درگذر کریں گے۔

شیر خاں ہم تنہا شاہی دستر خوان پر جانا نہیں چاہتے۔

شیر خاں : آپ تنہا کیوں جائیں۔ میں آپ کے جلو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔

سلطان جنید برلاس : شیر خاں کی ہمراہی میں اپنے خیمے و خرگاہ تک پہنچے۔ وہ اور ان کا لشکر ایک نشیبی وادی میں خیمہ زن تھا۔ ان کے لشکر گاہ کے گرد سیکڑوں سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ خیمہ خاص کے چاروں طرف مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔

سلطان جنید برلاس کو دیکھتے ہی تمام سپاہیوں نے فوجی قاعدے سے ان کو سلام کیا۔ وہ خیمے میں جا کر بیٹھ گئے۔ بہت سے خادم اور خواجہ سرا اُن کی پشت کی طرف آ کھڑے ہوئے شیر خاں بھی ایک قریب ہی مسند پر بیٹھ گئے۔

سلطان جنید برلاس : شیر خاں ہم نے سُنا ہے کہ تم نے ایک شیر کا شکار کیا تھا جس کی وجہ سے تم کو شیر خاں کا خطاب پیش کیا گیا ہے۔

شیر خاں : جی ہاں حضور۔

سلطان جنید برلاس : ہم اس واقعہ کی تفصیل سُننا چاہتے ہیں۔

شیر خاں : سلطان والا تبار۔ میں حضور کی ملازمت میں شامل ہونے سے پہلے جناب سلطان محمد۔ والئ بہار کی ملازمت میں تھا۔ وہ بھی حضور کی طرح خادم پر بے حد مہربان تھے۔ اور میں وہاں بھی ان کے مقربان خاص کے زمرے میں شامل ہو گیا تھا۔

ایک دن میں اور سلطان محمد شکار کھیلنے گئے۔ اتفاق سے ہم دونوں

لشکر سے جدا ہو گئے اور ایک گھنے جنگل میں گھس گئے۔ سلطان نے ایک ہرن کو مارا تھا اور ہم دونوں اس کی تلاش میں جنگل میں گھسے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہم دونوں کے گھوڑے بھڑکے۔ ساتھ ہی شیر کے دھاڑنے کی آواز سُنائی دی۔ اب ہم نے اپنے گھوڑوں کی باگوں کو کھینچا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہم نہایت گھنے جنگل میں تنہا تھے۔ مدافعت کی کوئی شکل نہ تھی۔ شیر قریب آرہا تھا اور ہم دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ کیونکہ ہم اس عالم میں شیر کے استقبال کو مطلق تیار نہ تھے۔ اتنی دیر میں شیر جھاڑیوں کو روندتا راستوں کو صاف کرتا ایک شانِ بے نیازی سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

سلطان محمد نے مجھ سے کہا:

شیر خاں اب کیا ہو گا؟

شیر خاں: حضور مطلق نہ گھبرائیں۔ اگر اللہ کی مدد شامل حال رہی تو میں اس کو ابھی ٹھکانے لگائے دیتا ہوں۔

میں نے پہلے ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سلسلہ میں خواہ میری جان ہی کیوں نہ ختم ہو جائے مگر میں اپنے ولی نعمت پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ شیر کو دیکھتے ہی میں نے کوشش کی کہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاؤں اور سلطان محمد کے آگے آجاؤں۔ لیکن گھوڑے نے شیر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا اور جب میں نے اُس کو آگے بڑھانے کی زیادہ کوشش کی تو وہ الف ہو گیا۔ شیر نہایت سکون سے سینہ تانے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ گھوڑا آگے نہیں بڑھتا اور بے قابو ہُوا جاتا ہے تو میں جلدی سے

گھوڑے پر سے زمین پر کود پڑا۔ جیسے ہی میں زمین سے جدا ہُوا شیر مجھ پر جھپٹا لیکن میں بھی اس کے مقابلہ کے لیے تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

سلطان محمد نے چیخ کر کہا : شیر خاں۔ یہ کیا حماقت کر رہے ہو۔ شیر تم کو ہرگز نہ چھوڑے گا۔

میری نگاہیں شیر کی نگاہوں سے لڑی ہُوئی تھیں۔ میں نے کہا :

حضور بے فکر رہیں۔ میں انشاءاللہ ابھی اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔

اسی عرصہ میں شیر نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے فوراً پینترا بدلا۔ شیر وہاں آ کر گرا جہاں میں ایک لمحہ پہلے کھڑا تھا۔ میں نے پھرتی سے تلوار کا وار کیا لیکن وار اوچھا پڑا اور شیر کا کان اُڑ گیا۔ اس سے شیر اور زیادہ غضب ناک ہو گیا اس نے ایک ایسی ہولناک اور گرج دار آواز نکالی کہ سارا جنگل دہل گیا اور فوراً ہی پلٹ کر مجھ پر پُوری شدت سے حملہ آور ہو گیا۔ شیر اپنا منہ کھولے میری طرف بڑھ رہا تھا گویا وہ مجھے نگل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پنجے پھیلا دیے تھے۔ جیسے وہ مجھے ان خوفناک پنجوں سے نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ غضبناک شیر کو اس عالم میں اپنے سے اتنا قریب دیکھ کر کوئی بھی ہوتا لرز جاتا۔ مگر میں تو پہلے ہی سر سے کفن باندھ چکا تھا۔ میں نے مطلق فکر نہ کی اور آنکھیں بند کر کے خدا کا نام لے کر ایک تلوار کا بھرپُور ہاتھ شیر کی گردن پر مارا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے تلوار کس طرح چلائی —— کس طرف چلائی لیکن میں نے دیکھا کہ شیر کا سر زمین پر پڑا ہے۔ اور شیر زمین پر تڑپ رہا ہے۔

سلطان محمد جلدی سے اپنے گھوڑے سے اُترے اُنھوں نے فرطِ محبت سے مجھے گلے لگا لیا اور کہا۔ فرید خاں میں تمھارا بے حد مشکور ہوں کہ تم نے مجھے موت کے منہ سے چھڑایا۔ اور میری جان بچائی اور خود موت سے دست و گریبان ہو گئے میں تم کو شیر خاں کا خطاب دیتا ہوں۔ خدا تم کو زندگی میں ہمیشہ بڑی سے بڑی منزل میں ایسی ہی کامیابی عطا کرے جیسی اُس نے تم کو اس شیر پر غالب رکھا۔

جنید برلاس : واقعی شیر خاں تم نے تو بڑی اولعزمی، بہادری اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ موت کا ڈر ایک فطری ڈر ہے۔ اور موت سے اس طرح کھیلنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ تمھارے بشرے سے شان امارت ٹپکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم زندگی میں کوئی انتہائی بلند مقام حاصل کروگے۔

شیر خاں : حضور عالی اب تک مجھ کو زندگی میں جو کچھ بھی حاصل ہُوا وہ سب حضور ہی کا طفیل ہے۔ خدا مجھ پر مہربان تھا اس لیے اُس نے آپ جیسے انسان کو مجھ پر مہربان کر دیا ورنہ میں کیا تھا۔ مجھے خود میری موروثی جائداد سے محروم کر دیا گیا اور اب تک میں طرح طرح کی اذیتوں اور پریشانیوں میں گھرا ہُوا ہوں۔

جنید برلاس : شیر خاں ہم تمھارا دل بہلانے یا جی خوش کرنے کے لیے یہ باتیں نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم مغل بڑے قیافہ شناس ہوتے ہیں۔ مجھے میرے علم نے یہ بتایا کہ تم بڑے صاحب اِقبال ہو اور زندگی میں ضرور کسی نہ کسی دن کوئی نہایت شان دار کامیابی حاصل کروگے!

شیر خاں : چونکہ حضور کو مجھ سے محبت ہے۔ اس لیے حضور ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ حضور کی ذرّہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ حضور اگر مجھے زندگی میں کوئی بلند منصب ملا بھی تو وہ بھی آپ ہی کا کرم ہوگا۔

سلطان جنید : نہیں شیر خاں۔ یہ سب تمھارے اقبال کا کرشمہ ہے۔ میں نے تمھارا تعارف اپنے بڑے بھائی میر خلیفہ سے کرایا تھا۔ وہ بھی تم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

شیر خاں : حضور ممکن ہے میر خلیفہ صاحب کی جد و جہد سے مجھے کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے۔ لیکن چونکہ آپ نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میرا تعارف میر خلیفہ سے کرا دیا۔ اس لیے ان کے ذریعہ مجھے آئندہ جو بھی عروج حاصل ہوگا۔ وہ آپ ہی کے صدقے میں ہوگا۔

جنید برلاس : شیر خاں ہمیں تم سے بڑی محبت ہے ہم دل سے یہی چاہتے ہیں کہ تم کسی بلند مرتبے پر فائز ہو۔

شیر خاں : یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے آپ جیسا مربی مل گیا۔

سلطان برلاس : اچھا چلو۔ شاہی دسترخوان کے بچھنے کا وقت آگیا ہے۔

شیر خاں : میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ ہر وقت تیار رہتا ہوں جب آپ چلنے کا حکم دیں گے ہم رکاب ہو جاؤں گا۔

سلطان جنید برلاس دوسرے خیمے میں گئے اور لباس بدل کر آ گئے۔ سلطان اور شیر خاں خیمے سے باہر نکلے چند سواروں کو ساتھ لیا اور شاہی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیونکہ شاہی خیمہ کچھ فاصلے پر تھا اس لیے یہ سب کے

سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ سلطان جنید اور اُن کے سپاہی مغل تھے۔ ان میں صرف شیر خاں ہی افغان تھا۔ جس راستے سے یہ گزرے اس کے دونوں طرف خیموں بستی آباد تھی۔

جس جگہ شاہی لشکر فروکش تھا وہ پہاڑی مقام تھا اُونچی نیچی زمین تھی اس پر خیمے نصب کیے گئے تھے۔ ان خیموں سے کچھ عجیب شان نظر آتی تھی۔ مغل اپنا مخصوص لباس پہنے آجا رہے تھے۔

جب یہ لوگ شاہی کیمپ کے قریب پہنچے تو بے شمار افسر، سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ کیمپ میں داخل ہونے کے لیے ایک بلند دروازہ تھا۔ اس پر چند مغل ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے ہُوئے کھڑے تھے۔ ان سپاہیوں نے سلطان کو سلام کیا سلطان اور شیر خاں اندر داخل ہُوئے۔ ان کے سپاہی وہیں رہ گئے۔ شروع میں سپاہیوں کے خیمے تھے۔ اس کے بعد افسروں کے۔ پھر شاہی رسالے کے۔ اس کے بعد امیروں اور وزیروں کے لیے شاندار خیمے نصب تھے۔ یہ خیمے بڑی خوبصورتی اور آراستگی سے قطار اندر قطار لگائے گئے تھے اس ترتیب میں مراتب کا خیال رکھا گیا تھا۔ برابر کا امتیازی نشان اس کے خیمے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ہر خیمے کے سامنے سائبان تھا۔

یہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ شاہی خیموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں بھی سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ اب شیر شاہ قلب لشکر میں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک بلند مقام پر ایک بہت

بڑا خیمہ اور سائبان نصب ہے۔ جس کی خوبصورتی دیکھ کر انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ ہزاروں مغل سپاہی چست سفید لباس پہنے بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے ہیں اور امراء و وزراء مملکت خیمہ کی جانب جا رہے ہیں۔ اب وہ اس سائبان کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ وہ سائبان اتنا وسیع وعریض تھا کہ اس کے نیچے کئی سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ یہ سائبان ریشمی کپڑے کا تھا اور اُس کے نیچے کا استر گہرے سرخ رنگ کا تھا۔ سائبان کی چوبوں پر چاندی کے خول چڑھے ہُوئے تھے نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کے قالینوں کا فرش تھا۔ صدر میں ایک نہایت ہی مکلّف کارچوبی کے کام کی مسند بچھی ہُوئی تھی۔ اس لیے شاہی مسند کے سامنے چھوٹی چھوٹی ہزاروں مسندیں لگی ہُوئی تھیں۔ جن پر امیر مشیر اور عزیز بیٹھے ہُوئے تھے۔ سلطان جنید برلاس کی شہنشاہ سے قرابت تھی۔ دوسرے وہ میر خلیفہ کے بھائی تھے اس لیے سب ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی بہت سے لوگ ان کی تعظیم کے لیے بڑھے اور پھر اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے۔ ابھی یہ لوگ آکر بیٹھے بھی نہ تھے کہ شہنشاہ بابر کی آمد آمد کا غل ہُوا۔ تمام لوگ بے چینی سے اپنے شہنشاہ کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں چوب دار کی آواز بلند ہُوئی۔

با ادب، با ملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہ بابر تشریف لاتے ہیں۔

سب درباری سر جھکا کر تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے اور جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ شہنشاہ آئے اور رونق آرائے مسند ہُوئے۔ خدام بصد ادب پسِ پشت کھڑے ہوگئے۔ شہنشاہ کے اشارے پر سب لوگ نہایت مہذب طریقہ

سے اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ بابر نے ایک نگاہ سب پر ڈالی۔ تمام مسندیں بھر چکی تھیں۔ دستر خوان بچھا دیا گیا۔ کھانا آنا اور قرینے سے لگنا شروع ہوا بے شمار لوگ کھانا چننے پر مامور تھے چند ہی منٹ میں سب کے سامنے کھانا چُن دیا گیا۔ شہنشاہ بابر نے ایک مرتبہ پھر حاضرین پر نظر ڈالی اور کہا بسم اللہ۔

سب نے کھانا شروع کر دیا۔ انواع واقسام کے کھانے سلیقے سے چُنے ہوئے تھے۔ بعض کھانے ایسے تھے جو افغانوں نے کھانا تو درکنار کبھی ان کے نام بھی نہ سُنے تھے۔ خادم نے شیر خاں کے سامنے ایک ایسی پلیٹ رکھی جو ٹھوس قسم کی تھی۔ شیر خاں نے بڑی دیر تک اُس کو چمچے وغیرہ سے کھانے کی ناکام کوشش کی۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو یہ احساس ہوا کہ کہیں دوسرے آدمی اس کے اس فعل پر مسکرا تو نہیں رہے ہیں۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک دو امراء جو سامنے کی صف میں بیٹھے تھے۔ واقعی اس کی اس حرکت اور پریشانی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ شیر خاں کو بڑا غصّہ آیا اور وہ اسے کسی نہ کسی طرح کھانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

اب دستر خوان پر بیٹھے ہوئے تمام امراء کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور لوگ مسکرا مسکرا کر اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شدہ شدہ یہ بات شہنشاہ بابر تک پہنچ گئی۔ اُنھوں نے بھی شیر خاں کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت شیر خاں نے میان سے تلوار نکالی۔ پلیٹ کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور چمچے سے بڑے اطمینان سے کھانے لگا۔ اس کی اس فراست پر

سب کو بڑا تعجب ہُوا اور خصوصاً شہنشاہ بابر اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے ایک نظر بھر کر شیر خاں کو دیکھا۔

ٹھیک اسی وقت شیر خاں نے بھی بڑے غرور و تمکنت کے ساتھ نظر اُٹھائی۔ اُس کی نظر شہنشاہ بابر سے ٹکرائی۔ یہ دو بلند مقاصد رکھنے والی نگاہوں کا ٹکراؤ تھا۔ ایک نگاہ وہ تھی جس نے فرغانہ سے اُٹھ کر ہندوستان کو اپنے پنجۂ اقتدار میں لے لیا تھا اور دُوسری وہ نظر تھی جو مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کا عزم کر چکی تھی۔

شہنشاہ بابر اُچھل پڑے۔ وہ بڑے قیافہ شناس تھے۔ انھوں نے ذرا دیر میں اس اقبال مند انسان اور اس کی طالع کی بلندی کو پڑھ لیا۔ شیر خاں اب تک کھانے میں مشغول تھا۔ شہنشاہ نے اپنے وزیر میر خلیفہ سے جو اُس کے برابر بیٹھے تھے آہستگی سے پوچھا۔

شہنشاہ بابر : یہ کون ہے ؟

میر خلیفہ : ظلِ سُبحانی یہ ایک افغان ہیں۔

شہنشاہ بابر : اتنا ہم بھی جانتے ہیں۔

میر خلیفہ : جہاں پناہ، اس کا نام فرید خاں اور خطاب شیر خاں ہے۔ کیونکہ اس نے سلطان محمد والی بہار کی زندگی بچانے کے لیے شیر کو تلوار سے قتل کر ڈالا یہ سہسرام کا جاگیر دار ہے بڑا دلیر اور بہادر شخص ہے۔

شہنشاہ بابر : میر خلیفہ۔ ہم نے لوگوں کو پہچاننے میں آج تک غلطی نہ کی۔ اگر ہمارا قیافہ درست ہے تو اُس کے چہرہ پر پادشاہی کے آثار

پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ حکومت کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہم نے ہزاروں افغان رئیس و امیر دیکھے ہیں۔ لیکن جو شان اس کے بشرہ سے عیاں ہے وہ کسی کے چہرے پر نہیں۔

میر خلیفہ: جہاں پناہ، شیر خان خاندان سُور سے تعلق رکھتا ہے یہ خاندان افغانوں میں بڑا معزز سمجھا جاتا ہے۔ اور شاید اسی نجابت اور شرافت کے خطوط حضور نے اُس کے چہرہ پر دیکھے ہوں گے!

شہنشاہ بابر: کچھ بھی ہو تم اس کی نگہداشت رکھو۔ ہمیں اس کی طرف سے خطرہ کا احتمال ہے!

میر خلیفہ: جہاں پناہ یہ شخص مصیبت زدہ ہے اس کی جاگیر پر محمد خاں شاہ خیل نے قبضہ کر لیا تھا۔ سلطان جنید برلاس نے اُس کی مدد کی۔ اس وقت سے وہ انھیں کی ملازمت میں ہے اور بڑا وفا شعار شخص ہے۔

اس عرصہ میں شیر خاں نے کئی مرتبہ دز دیدہ نگاہوں سے شہنشاہ بابر کا جائزہ لیا۔ اور اُن کو میر خلیفہ سے جھک کر باتیں کرتے دیکھا۔ اُس نے یہ اندازہ لگالیا کہ شہنشاہ اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ اور گفتگو کچھ خوش گوار نہیں ہے۔

شہنشاہ بابر نے بھی ایک نظر شیر خاں پر ڈالی اور پھر میر خلیفہ سے کہا۔

شہنشاہ بابر: جب سے میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس کو گرفتار کرلوں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

میر خلیفہ: جہاں پناہ اس غریب کے پاس نہ دولت ہے۔ نہ جمعیت ہے، نہ لشکر ہے نہ ساز و سامان ہے۔ یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے کسی خطرہ کا احتمال نہیں۔ دوسرے یہ شخص بے قصور ہے۔ اگر اسے گرفتار کر لیا گیا تو سارے افغان بھڑک اُٹھیں گے اور اعلیٰ حضرت سے بدگمان ہو جائیں گے اور یہی چیز تفرقہ کا باعث بن جائے گی۔

شہنشاہ بابر: صرف تمھاری سفارش پر ہم خاموش ہوئے جاتے ہیں۔

کھانا ختم ہو گیا۔ فرید خاں پہلے ہی کھٹک گیا تھا کہ بابر نے ان کے متعلق میر خلیفہ سے گفتگو کی ہے وہ یہ سمجھے کہ شاید کسی نے شہنشاہ بابر کو یہ بتا دیا ہے کہ یہ شخص مغلوں کی توہین کرتا ہے۔ ان کے تہذیب و تمدن کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اور یہ کہتا پھرتا ہے کہ وہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دے گا۔ شیر خاں فوراً سائبان کے باہر نکل آیا۔ اُس نے فوراً ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شاہی کیمپ کو چھوڑ دیا اور اپنے سپاہیوں سے کہا۔

شیر خاں: شہنشاہ بابر نے مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بدظن ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ یہاں میرا رہنا مناسب نہیں۔ تم سب ساز و سامان لے کر پیچھے چلے آؤ۔

یہ کہتے ہی وہ چند سواروں کو لے کر روانہ ہو گیا اُس کے جاتے ہی شاہی ملازم آئے۔ معلوم ہُوا کہ شہنشاہ بابر نے شیر خاں کو طلب کیا ہے۔ مگر شیر خاں جا چکا تھا۔ جب میر خلیفہ نے یہ خبر شہنشاہ کو پہنچائی تو انھوں نے کہا۔

شہنشاہ بابر : یہ اچھا نہ ہُوا اُسے گرفتار کرنا ضروری تھا۔

میر خلیفہ : اگر ایسا ہی ہے تو جب اعلیٰ حضرت حکم دیں گے اس کو اُس کی جاگیر سے گرفتار کر لیا جائے گا۔

شہنشاہ نے مسکراتے ہُوئے کہا : میر خلیفہ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ اور مسکراتے ہُوئے سائبان سے اپنے خیمے میں چلے گئے۔

ادھر شیر خاں نے سیدھا سہسرام کا رُخ کیا۔ شیر خاں نے راستہ میں قیام کرکے یہ سوچا کہ کہیں اس کے اس طرح چلے آنے سے شہنشاہ بابر برہم تو نہ ہو جائیں گے! اگر وہ ناراض ہو گئے تو میری گرفتاری کے لیے لشکر روانہ کریں گے۔ کیا میں شاہی لشکر کا مقابلہ کر سکوں گا اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ مقابلہ ممکن ہے۔ لیکن دُور اندیشی یہی کہتی تھی کہ شہنشاہ بابر کو غصہ دلانا، موت کو دعوت دینا ہے۔

تمام رات وہ اس فکر و تردد میں ٹہلتا رہا۔ کبھی سوچتا کہ اپنے آپ کو شہنشاہ بابر کے قدموں میں ڈال دوں، کبھی سوچتا کہ گوشۂ امن کہاں تلاش کروں۔ آخر بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کو اپنی جاگیر پر واپس چلنا چاہیے۔ راستہ میں اُس نے سلطان جنید برلاس کو یہ خط لکھا۔

آقائے محترم :

میں شاہی دسترخوان سے اُٹھ کر سیدھا اپنی جاگیر کی طرف روانہ ہو گیا ہوں۔ اس سے حضور

یقیناً کبیدہ خاطر اور متعجب ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ مجھے نظام بھائی سے یہ اطلاع ملی کہ محمد خان شاہ خیل اور سلیمان نے بہار کے حاکم سلطان محمد سے میری شکایت کی ہے کہ میں مغلوں سے مل گیا ہوں اور اس زعم میں اُن سے جاگیر چھین لی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں سلطان محمد اُن کے کہنے میں آ کر میری جاگیر پر لشکر کشی نہ کر دے، دوسری وجہ یہ ہے کہ شہنشاہ بابر نے دوران طعام میں میر خلیفہ سے میرے متعلق گفتگو کی۔ شہنشاہ بابر کی نگاہیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ وہ مجھ سے بدظن ہیں۔ اور میرے خلاف کوئی حکم دینے والے ہیں۔ اگر میں وہاں مزید ٹھہرتا تو کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ میں حضور سے اس بے باکی اور بلا اجازت چلے آنے کی معافی مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ حضور مجھے معاف فرمائیں گے۔

تابعدار

شیر خان

شیر خاں نے یہ تحریر اور چند تحائف ایک قاصد کے ہمراہ جنید برلاس کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

جب سلطان جنید برلاس شاہی دستر خوان سے واپس ہوتے اور اُن کو شیر خاں کے چلے جانے کا علم ہُوا تو اُن کو سخت ملال ہوا۔ وہ یہ بات کبھی تصور میں بھی نہیں لا سکتے تھے کہ شیر خاں اُن سے بلا اجازت حاصل کیے چلا جائے گا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ میر خلیفہ آ گئے۔

میر خلیفہ : جنید تم نے شیر خان کو کہاں روانہ کر دیا۔

جنید برلاس : میں خود یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں اتنی جلد دستر خوان سے اٹھتے ہی اپنی جاگیر پر روانہ ہو گیا۔

ہم کو اس بات کا افسوس ہے کہ وہ ہم سے مل کر نہ گیا۔ وہ اتنا باوفا ہے کہ اس کی وفا شعاری کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کون سی بات ہو گئی کہ وہ ہم سے بغیر ملے چلا گیا۔

میر خلیفہ : میرے خیال میں شیر خاں محض ایک اجڈ سپاہی نہیں بلکہ بڑا قیافہ شناس اور دُور اندیش انسان ہے۔

جنید برلاس : مگر آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں ؟

میر خلیفہ : اس نے جس دانائی کا ثبوت دیا۔ اُس نے مجھ کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔

جنید برلاس : خدا کے لیے مجھے بھی کچھ بتائیے۔

میر خلیفہ : دعوت میں شہنشاہ بابر نے شیر خاں کو تلوار سے بھی

آتش کو کاٹتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کی فراست کے قائل ہوگئے۔ اس کی نگاہ شیر خاں کی نگاہ سے ٹکرائی، شہنشاہ بابر اچھل پڑے۔ انھوں نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ اس کے بشرہ سے شہنشاہی کے آثار ہویدا ہیں۔ اس کی طرف سے خطرہ کا احتمال ہے۔ اسے گرفتار کرلو۔

میری سفارش پر شہنشاہ اس وقت بالکل خاموش ہوگئے شیر خاں نے مجھے اور شہنشاہ کے صرف آہستہ آہستہ گفتگو کرنے سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ گفتگو اسی کے متعلق ہورہی ہے۔ اور یہ کوئی خوش گوار نہیں اسے کھٹک گیا اور وہاں سے فوراً فرار ہوگیا۔

برلاس : کیا اس کے بعد شہنشاہ نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔

میر خلیفہ : ہاں وہ میری وجہ سے خاموش ہوگئے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے شیر خاں کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔

برلاس : کمال ہے۔ میں بالکل برابر بیٹھا تھا۔ مجھے کسی چیز کا شبہ تک نہ ہوا۔

میر خلیفہ : یہ سب حکومت کے اسرار ہیں۔ شہنشاہ کو خطرہ ہے کہ یہ کہیں افغانوں کو متحد اور منظم کرنے میں کامیاب نہ ہوجائے۔ اور مغلوں کو ہندوستان سے نکال دے وہ تو کہیے شیر خاں پر قدرت مہربان ہے کہ وہ اس جال سے نکل گیا۔ جب شہنشاہ کو معلوم ہوا کہ شیر خاں فرار ہوگیا تو انھوں نے مجھ سے کہا۔

میر خلیفہ، ہم تمھاری وجہ سے خاموش ہوگئے اُسے گرفتار کرنا بہت

ضروری تھا۔

کچھ دنوں کے بعد جنید برلاس کو شیر خاں کا خط ملا۔ وہ اُس کی فراست کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے بڑی محبت سے خط کا جواب دیا۔

شیر خاں

ہم تم سے بہت خُوش ہیں۔ تم نے اپنی دُور اندیشی سے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ اس وقت تمھارا چلا جانا ہی بہتر تھا۔

جنید برلاس

صفدر خاں : بیٹی ناہید، ابھی ہم نے شیر خاں کی زندگی کے چند ورق اُلٹے ہیں۔ اُس کے ہر صفحہ، حیات پر، عزم و ارادے کی قندیلیں روشن ہیں۔ اب رات زیادہ ہوگئی ہے اس لیے آرام کرو۔

ناہید : آبا حضور، جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس بلند شخصیت کے حالات کو سنتی رہوں۔ لیکن آپ کی تکلیف کے خیال سے خاموش رہوں۔

صفدر خاں : بیٹا اب ہم پھر کبھی تم کو شیر خاں کی زندگی کے دوسرے دلچسپ حالات سُنائیں گے۔

ناہید : بہت بہتر۔ آبا حضور۔

باب ۸

بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صُلح ہو جائے جنگ ہو کر

شہنشاہ ہمایوں فتح کے شادیانے بجاتے شہر میں داخل ہو گئے اہل شہر نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ افتخار مرزا نے صفدر خاں اور ناہید کو اپنے گھر مہمان رکھا۔ گھر کے اندرونی حصہ میں ناہید اور صفدر خاں رہتے اور باہر کے حصہ میں خود افتخار مرزا رہتے تھے۔

وہ گھر جو کبھی سونا اور سنسان تھا اس میں زندگی کے نشانات پیدا ہو گئے تھے۔ عورت کا وجود، ہر چیز میں ایک حُسن پیدا کر دیتا ہے۔ اب کمرے سلیقے سے سجے ہوتے تھے۔ قالینوں اور مسندوں کا گرد و غبار ختم ہو گیا تھا۔ باغ میں مالی مصروف نظر آتا۔ گھر میں کنیزیں، خادمائیں، دن بھر ناہید بی بی کے حکم سے کام میں لگی رہتیں اور جھاڑ پونچھ، آراستگی میں سارا سارا دن گزار دیتی۔ ناہید نے اسی گھر کو ذرا دیر میں آئینہ خانہ بنا دیا۔ افتخار مرزا نے جب اپنے در و دیوار دیکھے تو اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرنے لگا۔ ہر کمرہ دلہن کی طرح سجا ہُوا تھا اور ہر شے اپنے مقام پر صاف اور سلیقہ سے رکھی تھی۔

افتخار مرزا نے محسوس کیا کہ صفدر خاں اس کے گھر میں رہنے سے

پریشان ہے۔ اس لیے اُس نے ایک دن موقع پاکر یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

افتخار مرزا: محترم صفدر صاحب، کیا میں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں۔

صفدر خاں: بیٹے تیرے لیے میری جان حاضر ہے۔

افتخار مرزا: نہیں وعدہ کیجیے کہ آپ اس کو پورا کریں گے۔

صفدر خاں: تم پہلے بات تو بتاؤ۔ پھر اگر میرے بس میں ہے تو اس کو ضرور پُورا کروں گا۔

افتخار مرزا: آپ اس مکان میں مستقل قیام کریں۔

صفدر خاں: (فرطِ محبت سے آبدیدہ ہو کر) بیٹا کبھی میں بھی صاحبِ حیثیت تھا۔ اسی آگرہ میں میرا بھی ایک خوبصورت سا مکان تھا۔ میرے بھی نوکر چاکر تھے۔ لیکن اب ایک مفلس اور بے یار و مددگار ہوں۔ لیکن افتخار میں پھر بھی اپنے رہنے کے لیے بندوبست کر سکتا ہوں۔ آپ کے احسانات یوں ہی میرے حال پر کیا کم ہیں؟

افتخار مرزا: قبلہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ بیمار ہیں اور جب تک آپ کو صحت کامل نہ ہو جاتے میں آپ کو اپنے سے جُدا نہ کروں گا۔ دوسرے میں سپاہی ہوں۔ میرا وقت زیادہ تر شہر سے باہر گزرتا ہے۔ اس لیے یہ مکان نوکروں کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ آپ نے خود دیکھ لیا کہ جب آپ تشریف لاتے تھے تو اس گھر کی کیا کیفیت تھی۔ اور آج یہ کس حال میں ہے۔ خدا نے میرے سر پر سے والدین کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھا لیا۔ اب اگر آپ اس غریب خانہ کو رونق بخشیں تو یہ میرے

لیے بڑی باعثِ مسرت بات ہو گی۔ میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو اپنے والد مرحوم کی جگہ متصور کرتا ہوں اور اسی لیے یہ عرض داشت کر رہا ہوں۔

صفدر خاں : بیٹا افتخار تم مجھے مجبور نہ کرو۔ تم نے مجھے بُری طرح اپنی محبت میں گرفتار کر لیا ہے کاش میں تمھاری کوئی خدمت کر سکتا اور تمھارے کام آ سکتا۔

افتخار مرزا : ناہید کہاں ہیں ؟

صفدر خاں : اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہے۔

افتخار مرزا : ارے کیا طبیعت خراب ہے ؟

صفدر خاں : مجھے تو کچھ بتاتی نہیں، تم ہی جا کر پوچھ لو۔

افتخار مرزا : بہت بہتر۔

افتخار مرزا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا ناہید کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا وہ ناہید سے ملے یا نہ ملے، کہیں ناہید یہ تو نہیں سمجھ رہی کہ میں اس طرح زبردستی اُس کو قید رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے مل کر اس کے خیالات ضرور معلوم کرنا چاہئیں شوقِ دیدار نے تمام مصلحتوں اور دُور اندیشیوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور ناہید کے دروازے پر آہستہ سے آواز دی۔

افتخار مرزا : کیا میں آ سکتا ہوں ؟

اندر سے ایک نحیف سی آواز آئی۔ آ جایئے۔

افتخار مرزا دھڑکتے ہُوئے دل اور سوچتے ہُوئے دماغ کے ساتھ

آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ اُسی کا گھر تھا۔ اُسی کا کمرہ تھا۔ لیکن یہ جگہ اس کو کچھ بدلی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ تمام کمرہ ناہید کے حسن سے جگمگا رہا تھا۔ ناہید ایک مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بہت کچھ پھیکا پڑ گیا تھا اور چہرہ پر ضعف و نقاہت کے آثار تھے۔

افتخار مرزا : ناہید کیسی ہو ؟

ناہید : خدا کا شکر ہے کہ آپ عیادت کو تشریف لائے ہیں۔

افتخار مرزا : ناہید تم نے مجھے یہ نہ بتایا کہ تم بیمار ہو۔

ناہید : صرف اس لیے کہ کہیں آپ یہ خبر سُن کر گھر چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔

افتخار : میں تمھارا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

ناہید : میں نے اپنے محسن کے ساتھ گستاخی کی۔ اس کے اعلیٰ جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔ وہ حق بجانب ہے۔ آپ کی برہمی جائز۔ آپ گھر میں کم سے کم وقت گزارتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر براہِ خدا مجھے یہ تو سمجھائیے کہ جب آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں تو پھر آپ مجھے اور ابا حضور کو یہاں رہنے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں۔ کیا اس طرح آپ ایک بدنصیب اور غم زدہ عورت سے انتقام لینا چاہتے ہیں کیا آپ مجھے اپنے تغافل کا نشانہ بنا کر تڑپانا چاہتے ہیں۔

افتخار مرزا : اے افتخار کے دل کی ملکہ ذرا صبر و سکون سے کام لو۔ میں تو تمھاری نگاہ نیم باز کا کشتہ ہوں۔ اپنے ترکش کے سارے تیر۔ میرے دل مجروح پر خالی نہ کرو۔ مجھ سے بدظن نہ ہو، میں تو حسن کی جناب میں خوں شدہ

دل کا حسین گلدستہ لے کر آیا ہوں۔ دیکھو تمھارے غصّہ کی آگ کو سرد کرنے کے لیے میں نے سیلاب اشک کو بلایا ہے ناہید۔ کیا تم نے کبھی پروانہ کو شمع سے، بلبل کو پھول سے عشق کو حُسن سے جُدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا میں اپنی ناہید کو جو ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ اور گوشۂ دل میں مسکراتی نظر آتی ہے۔ کبھی بُھلا سکتا ہوں۔ ناہید میں تم سے دُور دُور صرف اس لیے رہا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لو کہ میں تمھاری مرضی کے خلاف تم پر مسلط ہونا چاہتا ہوں۔ ناہید جو معراجِ حسن دیکھنے کا والہ و شیدا ہو وہ بھلا توہینِ حُسن کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ ناہید فراق کی گھڑیوں نے میرے دل کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ کاش میں تم کو اپنے گلستانِ دل کی سیر کرا سکتا۔ کاش میں وہ بے قراریاں اور اضطراب جمع کر سکتا۔ جب میں تمھارے فراق میں مبتلا رہا ہوں۔ کاش وہ آنسو جو میں نے تمھاری جُدائی میں بکھیرے ہیں کسی شیشے میں بند کیے جا سکتے۔ کاش اُمید و بیم کے اس سمندر کو بند کرنا ممکن ہوتا۔ تب میں بتا سکتا تھا کہ تمھارے بغیر یہ زندگی کس طرح گزری ہے۔

ارے ناہید تم رو رہی ہو، کیا یہ میری محبت کا جواب ہے۔ نہیں ناہید یہ آنکھیں مسکرانے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں اتنی مستی و سرشاری ہے کہ یہ سارے عالم کو ڈبو سکتی ہیں۔ ناہید نہ رو۔ تم تو مسکرانے اور خوشی بخشنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ تمھارا حسن۔ حسنِ یوسف کو شرماتا ہے تمھارے لب، لبِ مسیحا سے زیادہ زندگی تقسیم کرنے والے ہیں، اور تمھاری ذات

ید بیضا سے زیادہ روشن ہے۔ تم کو اُداسیوں سے کیا کام۔

ناہید : نہیں افتخار۔ میں ہمیشہ کی بدنصیب ہوں، قدرت نے ایک گہرِ بے بہا میرے دامن میں ڈال دیا۔ لیکن میں نے اس کو جھوٹا موتی سمجھ کر پاؤں تلے روند ڈالا۔ فطرت نے ایک لعل درخشاں مجھے عطا کیا۔ میں نے اُس کو پتھر سمجھا۔ یہ فطرت کا نہیں میرا اپنا قصور ہے۔ افتخار تم نے میرے والد کی جان بچائی۔ تم نے ایک بھولے ہوئے باپ کو اُس کی لڑکی کا تصور دیا۔ تم نے دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ملایا۔ اور اب بھی تم ہم پر انعام اور اکرام پر اکرام کر رہے ہو۔ پھر تم نے محبت کا حسین ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کائنات کی حسین ترین لذت سے آشنا کیا۔ افسوس تمھارے ان احسانات کے بدلے میں نے کیا کیا۔

میں نے اس ہار کو اپنے پاؤں سے روند ڈالا۔ افتخار میں اس قابل نہیں کہ تم جیسا بلند انسان مجھ سے محبت کرے۔

افتخار مرزا : محبت کرنے والا دل، ان تمام پستیوں سے بلند ہو کر سوچتا ہے ہر محبت کرنے والا ان آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ خدا کی قسم تم نے جو باتیں صاف صاف مجھ سے کیں اس سے میری محبت اور بڑھ گئی۔ تم نے میری نظر میں عورت کے درجہ کو کچھ اور بلند کر دیا۔ ناہید تم خواہ مجھے اپنے در سے نکال دو۔ لیکن میں ہمیشہ اس طرح تمھاری محبت کا دم بھرتا رہوں گا۔

ناہید : میں کس منہ سے کہوں کہ تم سے محبت کرتی ہوں۔

افتخار : ناہید مجھے معاف کر دو۔

ناہید : معافی تو مجھے مانگنا چاہیے۔

افتخار : نہیں یہ تذلیلِ حُسن ہے۔ میں اس کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

ناہید : مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔

افتخار : شاد باد اے عشق، خوش سودائے ما

اے طبیب جُملہ علتہائے ما

ناہید : نہیں یہاں تو یہ زیادہ موزوں ہے ؎

بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صُلح ہو جائے جنگ ہو کر

افتخار : ناہید۔ اب میں تم کو ایک خُوش خبری سُنانا چاہتا ہوں۔

ناہید : زہے نصیب۔ سُنائیے!

افتخار : میں نے شہنشاہ ہمایوں سے صفدر خاں کا تذکرہ کیا تھا وہ ان کے حالاتِ زندگی سُن کر بہت زیادہ متاثر ہُوئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اگر رضامند ہوں تو اُن کو فوج میں کوئی مناسب عہدہ دے دیا جائے گا۔

ناہید : کیا آبا حضور اس کو گوارا کریں گے؟

افتخار : ہاں اب ان کا زاویۂ فکر بدل گیا ہے۔ اس لیے اُمید ہے کہ وہ میری اس بات کو مان لیں۔

ناہید : یہ کیونکر؟

افتخار : وہ بڑے غیور اور حساس انسان ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان کی غیرت کو صدمہ پہنچاؤں اور ان کو دوسرے کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے

کے لیے آمادہ کروں۔ اس سے اُن کی خود داری کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور اس میں بُرائی کیا ہے۔ آج سیکڑوں انسان معمولی ملازمتوں پر پڑے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔

ناہید : آپ کہتے تو ٹھیک ہیں۔ غربت، فاقہ کشی یا دوسروں کے مرہونِ منت رہنے سے کہیں زیادہ یہ بات بہتر ہے کہ انسان ملازمت کرلے۔ میں بھی ابّا حضور سے اس مسئلہ پر گفتگو کروں گی۔

افتخار : میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے ان کے لیے ملازمت اور منصب کا بندوبست کرلیا جائے۔ اور پھر میں اور آپ ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ناہید : گویا آپ ایک اور احسان ہم لوگوں پر کرنا چاہتے ہیں۔

افتخار : جانِ افتخار اب ہم اور تم دو جُدا گانہ وجود نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری روحیں، ہمارے جذبات، ہمارے خیالات ایک ہیں۔ اس لیے اس "من تو شدم، تو من شدی" کی منزل میں احسان اور کرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ناہید : کاش میرے پاس ایسے حسین نرم و نازک اور موثر الفاظ ہوتے جس کے ذریعہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکتی۔ اور اپنے جذبات اور احساسات آپ کو بتا سکتی۔ آپ نے مجھے اپنا بنا لیا ہے۔ میں آپ سے عہد کرتی ہوں کہ اب زندگی بھر آپ کی اور صرف آپ کی ہو کر رہوں گی اور آپ کی پرستش کرتی رہوں گی۔

افتخار : نہیں ناہید قابلِ پرستش تو تم ہو۔ جب سے میری ملاقات تم سے ہوئی۔ میں نے تم کو اپنے دل کے مندر کی خوبصورت ترین دیوی منتخب کر لیا۔ میں اس دن سے تمھاری پرستش کر رہا ہوں اور اس وقت تک پرستش کرتا رہوں گا جب تک یہ جسم و جان کا رشتہ باقی رہے گا۔ اتنی دیر میں شاہی ہرکارہ آیا اور افتخار مرزا ناہید سے رخصت ہو کر شاہی محل سرا کی طرف روانہ ہو گئے۔

باب ۹

بیرم خاں کی سیاسی بصیرت

آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے دُور تک شاہی محلات اور دوسری سر بہ فلک عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ——— جہاں یہ عمارتیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے امراء وزراء اور دوسرے بڑے منصب داروں کی عالی شان عمارتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ شاہی محلات کے برابر ہی ایک نہایت نفیس اور خُوش نما چھوٹا سا محل ہے۔ حالانکہ یہ محل چھوٹا ہے لیکن حُسن و خوبصورتی میں کسی اچھے سے اچھے محل سے کم نہیں ہے۔ یہ پورا محل سنگ سُرخ کا بنا ہُوا ہے۔ اس کا نام "کاشانہ" ہے۔ کاشانہ کا صدر دروازہ بہت بلند اور کُشادہ ہے۔ اس میں دُور تک دو رویہ فوجیوں کے لیے کوٹھڑیاں بنی ہُوئی ہیں۔ مسلح سپاہی دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ آگے چل کر پائیں باغ ہے۔ یہ بھی اپنی آراستگی اور حسن و خوبی میں کسی باغ سے کم نہیں ہے۔ جگہ جگہ خوبصورت اور حسین پھُولوں کے تختے ہیں۔ بیچ میں ایک سنگ مرمر کا حوض ہے۔ نہایت حسین روشیں بنی ہُوئی ہیں۔ جو اپنے اندر بلا کی کشش رکھتی ہیں حوض میں صاف پانی موتی کی طرح چمک رہا ہے اور فوارے اس پانی کو فضا میں بکھیر رہے ہیں۔ حوض میں ہزاروں قسم کی رنگ برنگ مچھلیاں تیر رہی ہیں۔

جن کی رنگینی اور عجیب و غریب حرکتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ باغ سے گزرنے کے بعد، کاشانہ کی اصلی عمارتیں شروع ہوتی ہیں۔ اس میں ایک دیوان عام ہے۔ یہ ایک نہایت خوبصورت ہال کمرہ ہے۔ اس کے دروازوں میں اطلس و دیبا کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کمرے میں بڑا قیمتی فرنیچر اور دوسرا شیشہ آلات لگا ہوا ہے۔ کمرہ ایرانی قالینوں سے مزین ہے۔ بیچ میں ایک گاؤتکیے سے پشت لگائے بیرم خاں بیٹھے ہیں۔ نوکر چاروں طرف صف بستہ پشت بہ دیوار کھڑے ہیں۔ سامنے دورویہ مسندوں پر دوسرے معزز امراء جاگیر دار اور منصب دار بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے سونے کا خاصدان رکھا ہے۔ لوگ گفتگو میں مشغول ہیں۔ اتنی دیر میں ایک خدمت گار آیا اور بیرم خاں کو تسلیم کرکے سامنے کھڑا ہوگیا۔

بیرم خاں : کہو کیا بات ہے۔

نوکر : حضور افتخار مرزا صاحب تشریف لائے ہیں۔

بیرم خاں : بہت خوب، اُن کو بصد افتخار ہمارے پاس پہنچا دو۔

افتخار مرزا نوکروں کے جھرمٹ میں داخل ہوئے۔ بیرم خاں نے لب فرش سے اُن کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ تمام مصاحبین بھی کھڑے ہوگئے۔ بیرم بیگ نے افتخار مرزا کو اپنی مسند پر جگہ دی۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی دوسرے مصاحبین بھی اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے۔

بیرم خاں : افتخار مرزا صاحب آپ بڑے موقع پر آگئے اس وقت یہاں یہ بحث جاری تھی کہ غزل میں سعدی بڑے ہیں، یا لسان الغیب حافظ

ہمارے ابوالقاسم صاحب کا کہنا ہے کہ غزل میں سعدی سب سے بہترین ہیں۔ اور مولانا شہاب الدین ہمائی، حافظ کے حق میں ہیں۔

افتخار مرزا: واقعی بحث بڑی دلچسپ ہے۔ کیوں نہ ان دونوں کا مباحثہ کرا لیا جائے۔

حاضرین: بے شک یہ بہت مناسب ہے۔

بیرم خاں: ہم تمھاری رائے سے متفق ہیں اور تم کو اس کا حکم مقرر کرتے ہیں۔

افتخار مرزا: آپ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا حکم بننے کا مستحق نہیں آپ فارسی کے شاعر ہیں۔ آپ کا فارسی مذاق انتہائی پاکیزہ ہے۔ آپ کی فطرت شاعرانہ ہے۔ آپ شاعری کی نزاکتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کے دم سے اس دور میں فارسی علم و ادب کا چراغ روشن ہے۔ اس لیے مباحثہ کے لیے آپ ہی کو حکم بننا چاہیے۔

بیرم خاں: آپ کی خوشنودی کے خیال سے ہم یہ عہدہ قبول کرتے ہیں۔

افتخار مرزا: جزاک اللہ۔

بیرم خاں: حاضرین ہم نے اس مباحثہ کا صدر بننا قبول کر لیا ہے۔ اب جلسہ کی کارروائی باقاعدہ شروع ہوتی ہے۔ اب میں اپنے دوست ابوالقاسم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ شیخ سعدی کی شاعری پر روشنی ڈالیں۔

ابوالقاسم نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ جناب صدر و دیگر معزز حاضرین۔

کون شخص ایسا ہے جس نے فارسی کی یہ مشہور رباعی نہ سُنی ہوگی۔

در شعر سہ تن پیغمبران آنند
ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں۔ ان پیغمبروں میں ہر پیغمبر جُداگانہ شریعت رکھتا ہے۔ ابیات کی پیغمبری فردوسی کو اور قصیدہ کی پیغمبری انوری کو عطا ہوئی ہے۔ لیکن شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ شیخ کے سر پر اولیت کا تاج دمک رہا ہے بلکہ صحیفہ غزل کی پیغمبری بھی ان کو عطا ہوئی ہے۔

خود حافظ علیہ الرحمۃ نے اس کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے استاد غزل سعدی پیش ہمہ کس اتا

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ سعدی نے سب سے پہلے غزل کو غزل بنایا اس سے پہلے غزل معشوق کی مداحی کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ شیخ نے سب سے پہلے اس میں جذبات قلبی کا اظہار کیا۔ شیخ سے قبل جو لوگ گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے۔ اس میں سے اکثر ایسے تھے جنھوں نے کبھی خود عشق نہ کیا تھا اور صرف لطف سخن اور حسنِ کلام کے لیے اس کو استعمال کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو الفاظ صرف زبان سے نکلتے ہیں۔ وہ اثر نہیں کرتے۔ہاں دل سے نکلی ہوئی بات، دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شیخ کے زمانہ میں قوم

کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے اس لیے زندگی کا سرمایہ صرف عشق و عاشقی رہ گیا تھا۔ حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ اس لیے یہ آگ کے شعلے زندگی بھر اُن کی زبان سے نکلتے رہے اُنھوں نے خود بھی عشق کیا اور معشوقوں کے جور و ستم، بے مہری و بے وفائی کے جاں گداز صدمے اُٹھائے۔ اس لیے اُن کا سینہ سوز و گداز کا آتشکدہ ہے۔

همه از دست غیر ناله کنند
سعدی از دست خویشتن فریاد

یا مثلاً اُن کا یہ شعر ہے۔

گر کند میل به خوبان، دل من خورده مگیر
کین گناهست که در شهر شما نیز کنند

اور اس شعر کا کیا کہنا ہے۔

هیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگران
باز می پوشند و ما در آفتاب افگنده ایم

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سعدی غزل کے پیغمبر تھے۔ ان کی غزل میں عاشقی، سوز و گداز، جوش و خروش، سادگی، غرض وہ تمام چیزیں شامل تھیں اور ان کے بعد کے آنے والے شعراء اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ غزل میں ان کے بعد کوئی دوسرا "نبی" نہ ہوگا۔ ابوالقاسم کی تقریر کو لوگ بڑے غور اور توجہ سے سُن رہے تھے۔ وہ بڑی دیر تک اسی طرح بولتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شہاب الدین نے کہا۔

"اس میں شک نہیں کہ شیخ سعدی کو فارسی شاعری کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ اور اولیت کا تاج ہمیشہ اُن کے سر پر جگمگاتا رہے گا۔ لیکن یہ خیال کہ شاعری کی نبوّت ختم ہو گئی۔ غلط ہے۔ ذہنِ انسانی ہمیشہ ترقی کرتا رہا ہے اور اسی طرح ترقی کرتا رہے گا۔ ہم کو دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ سعدی کے کچھ عرصہ کے بعد افق شاعری پر حافظ علیہ الرحمۃ کی شخصیت ماہِ کامل بن کر چمکی۔ اُس کے شعر نہیں بلکہ چلتا ہُوا جادُو ہے۔ اُس کی غزل نہیں۔ سحر ہے۔ اس کے اشعار نہیں، نگینے ہیں۔ اس کی شاعری نہیں، بلکہ گلستان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع کے اعتبار سے سعدی اور حافظ میں کوئی فرق نہیں لیکن بیان نے ایک دوسرے میں بڑا خوبصورت فرق پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ فرق اس قسم کا ہے۔ جو گلاب کے تازہ کھِلے ہوئے پھُول اور جوہی کے پھولوں میں ہوتا ہے۔ جوہی کا پھُول زیادہ لطیف۔ زیادہ نازک اور سفید ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو بھی انسان کو مست و سرشار بنا دیتی ہے۔ لیکن گلاب کا پھُول، اپنے حسُن، دل کشی اور رنگ و نور و خوشبو و ساخت کے اعتبار سے تمام پھُولوں کا سرتاج ہوتا ہے۔ یہی حال سعدی اور حافظ کا بھی ہے۔ بہت سی وہ باتیں جو پہلے سعدی کہہ چکے تھے۔ حافظ نے نظم کیں۔ لیکن اپنے مخصوص اسلوب بیان سے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ بعض جگہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اس کو صرف معجزہ سے تعبیر ہی کیا جا سکتا ہے۔

سعدی

اے بلبل اگر نالے من با تو ہم آوازم
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

یا

فریاد دوستاں ہم از دست دشمن است

فریاد سعدی از دل نامہربان دوست

یا

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر

کیں گناہست کہ در شہر شما نیز کنند

حافظ

بنال بلبل اگر با من سر یاری ست

کہ ما در عاشق زاریم و کار ما زاری است

یا

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

یا

من ارچہ عاشقم و رند و میکش و قلاش

ہزار شکر کہ یاران شہر بیگناہ اند

حافظ علیہ الرحمۃ نے جس طرح گلستانِ فارسی کو رنگ برنگ کے پھولوں سے سجایا یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اُن کی غزلیں ہمیشہ دُنیا سے خراج عقیدت وصول کرتی رہیں اور ان کا انوکھا انداز بن کر ہر دِل میں چبھتا رہے گا۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یا

گرچہ پیرم، تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گہہ ز کنار تو جواں برخیزم

اس شعر پر محفل میں کہرام مچ گیا۔ اور مولانا شہاب الدین مرحبا اور سبحان اللہ کے نعروں میں بیٹھ گئے۔

بیرم خاں اپنی جگہ سے اٹھے اور فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ حضرات آپ نے ابوالقاسم اور مولانا شہاب الدین کی تقریریں سنیں دونوں مقررین نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے اپنے خیالات کو پیش کیا۔ ہم دونوں کے طرزِ استدلال سے بہت خوش ہوئے لیکن ہمارے خیال میں سعدی اور حافظ دونوں پھول ہیں۔ لیکن دونوں کا رنگ و بو جدا جدا ہے۔ سعدی نے فارسی غزل کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن حافظ کی زمزمہ پردازیوں نے غزل کو حدِ سحر تک پہنچا دیا۔ لہٰذا ہم شہاب صاحب کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم دونوں مقررین کو ایک ایک مرصع تلوار اور ایک ایک نسخہ دیوانِ حافظ و سعدی انعام میں دیتے ہیں۔

ابوالقاسم اور شہاب نے بڑھ کر انعامات لیے اور سر جھکا کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ بیرم خاں نے ان کو قریب آنے کو کہا اور جب وہ دونوں پائیں فرش تک پہنچ گئے تو بیرم خاں نے دونوں مقررین

سے مصافحہ کیا اور ان کو تحفے عطا کیے۔ مجمع نے صدائے تحسین بلند کی۔

بیرم خاں : کیوں افتخار۔ تمھارا اس مباحثہ کے متعلق کیا خیال ہے؟

افتخار مرزا : بہت کامیاب رہا۔ خدا کی قسم بیرم خاں، آپ کی وجہ سے اس دور میں شعر و شاعری کا چراغ جل رہا ہے اور آپ اس کا فانوس بن کر اس چراغ کی روشنی کو بڑھا رہے ہیں اور مخالف ہواؤں سے اسے بجھنے سے بچا رہے ہیں۔ لیکن میں آج آپ سے کچھ نجی گفتگو کرنے آیا تھا۔

بیرم خاں : اچھا تم نے پہلے کیوں نہیں کہا۔ ابھی لو۔ اس کے بعد بیرم خاں نے مجمع کو خطاب کر کے کہا "تخلیہ"

تمام حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے بیرم خاں کی تعظیم کی، اور چلے گئے۔ اب اس وسیع اور عریض کمرے میں صرف دو ہستیاں محوِ گفتگو نظر آتی ہیں۔

بیرم خاں : ہاں افتخار مرزا، اب جو کچھ کہنا ہے اطمینان سے کہو۔

افتخار : اچھا تو پھر میں مثنوی کی طرح شروع کرتا ہوں۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

بیرم خاں : گویا کہ آپ، ہجر کی حکایت کو نے کی زبان میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

افتخار مرزا : جی ہاں!

بیرم خاں : لیکن تم نے آج تک نہ بتایا کہ تم اس خطرناک بیماری کا

شکار ہو گئے ہو۔

افتخار مرزا نے ناہید اور اُن کے والد صفدر خاں کی مختصر داستان بیرم خاں کو سُنائی اور کہا۔ بیرم خاں وہ افغان لڑکی' بلائے جان ہے۔ وہ ایک شعلہ جوالہ ہے۔ وہ مجسمہ حُسن ہے وہ حسن و زیبائی کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن وہ مغلوں سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ مجھ سے مصلحتاً مل رہی ہے۔ اگر اُس کو ذرا بھی موقعہ ملا تو وہ مجھ کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔

بیرم خاں : افتخار گویا تم نے ناہید کے باپ کو اس لیے موت سے پناہ دی کہ تم اُن کو اپنے گھر کی پاسبانی سونپو ——— تم نے ناہید اور صفدر خاں کو اس لیے ایک دوسرے سے ملایا کہ آپ ناہید اور اُس کے والد سے اُس کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔

افتخار : بیرم خاں، اگر آپ نے میری تمام سرگزشت سننے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تو مجھے اس سے سخت اذیت ہوئی۔

بیرم خاں : ہاں تمھاری گفتگو کا لُب لباب یہی ہے۔ تم نے ایک افغان سردار کی جان بچائی تو اس کو اپنے اکیلے گھر کا نگران بنا دیا، اور ایک حسین لڑکی کو اُس کے باپ سے ملایا، تو اس کو اپنے عشق میں گرفتار کر لیا۔ تو کیا یہ سودے بازی نہیں۔ کیا اس کا نام خلوص ہے۔ کیا مغل کردار یہی ہے کیا شرافت اور انسانیت کا یہی تقاضا ہے ؟

افتخار مرزا : خوب ؏

کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو

نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

بیرم خاں، میں تم کو اپنے دل کے داغوں کی بہار دکھانے آیا تھا۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ تم نشتر زنی کر کے میرے دل کو اور زیادہ فگار کر دوگے ؛

بیرم خاں : افتخار مرزا، مجھے بے حد افسوس ہے کہ میرے الفاظ سے تمہارے دل کو تکلیف پہنچی۔ افتخار مرزا یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کسی انسان کا دل دُکھانا سب سے بڑا گناہ خیال کرتا ہوں۔ نا کہ میں اس دل کو دُکھانے کی کوشش کروں جسے میں فخریہ اپنا دل کہہ سکتا ہوں۔ افتخار تمہارا دل بڑا حساس، بڑا خوبصورت اور بڑا پُرخلوص ہے۔ اگر ناہید نے اس پر ڈاکہ ڈالا تو کوئی نادانی کی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس "محبت" کے چکر میں نہ پڑو اس سے انسان کو سوائے بربادی اور پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ صفدر خاں اور ناہید کو باعزت و احترام رخصت کر دو۔

افتخار مرزا : مگر ان کا آگرہ میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔

بیرم خاں : ہاں یہ ممکن ہے کہ تم اُن کی رہائش کے لیے کسی معقول جگہ کا بند وبست کر دو۔

افتخار مرزا : اگر ظلِ سبحانی سے اُن کی سفارش کی جائے تو !

بیرم خاں : اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر اس بہانے اُن کو کوئی منصب یا جاگیر مل گئی تو پھر کیا چاہیے ؛

افتخار مرزا : اگر اس سلسلہ میں آپ ظلِ سبحانی سے رجوع کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

بیرم خاں : اتنی چھوٹی سی بات کے لیے دو آدمیوں کا ظل سبحانی سے سفارش کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے تم خود ظل سبحانی سے گفتگو کرکے اس قصہ کو ختم کرسکتے ہو۔

افتخار مرزا : اگر آپ بھی ہمراہ ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

بیرم خاں : آپ کا بھی جواب نہیں۔ میں کب آپ کے ہمراہ نہیں ہوتا۔ کسی دن موقع دیکھ کر ظل سبحانی کے کان میں یہ بات ڈال دیں گے۔

افتخار مرزا : میں بھی یہی چاہتا تھا!

بیرم خاں : شاید ہم اب آزادانہ ظل سبحانی سے نہ مل سکیں گے۔

افتخار مرزا : (متعجب ہوکر) کیوں۔ وہ کون سی ایسی طاقت ہے جو ہمارے اور ظل سبحانی کے درمیان آسکتی ہے۔

بیرم خاں : ظل سبحانی کا فرمان۔

افتخار مرزا : مگر ایسا کوئی فرمان ابھی تو نہیں نکلا ہے۔

بیرم خاں : ظل سبحانی۔ صرف ہمارے لیے اس قسم کی کوئی قید نہیں لگا رہے ہیں۔ بلکہ یہ فرمان عام ہوگا۔ ہر قسم کے لوگوں کے ملنے کی ساعتیں، دن، لباس مقرر کیا جائے گا اور وہ اُس دن کے علاوہ ظل سبحانی کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکے گا۔

افتخار مرزا : میں اب بھی کچھ نہ سمجھا۔

بیرم خاں : یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ شہنشاہ ہمایوں کو نجوم پر بے حد یقین ہے۔ وہ بات بات پر فال نکالتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں اجرام فلکی کو

دیکھتے ہیں۔ ستّاروں کی گردش اور برجوں پر بہت زور دیتے ہیں اور کوئی بات بغیر فال کے نہیں کرتے!

افتخار مرزا: یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ 'نجوم' ایک علم ہے۔ لیکن اس پر اتنا بھروسہ کرنا، کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس کے حسابات غلط ہو سکتے ہیں اور اس طرح انسان کے بلند سے بلند ارادے کو، کسی سیارے کا مقام، برج، یا سعد و نحس تاریخ۔ یا فال، خاک میں ملا سکتی ہے۔

بیرم خاں: افتخار مرزا، میں تمھاری رائے سے متفق ہوں۔ انسان کو ان توہمات میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ شہنشاہوں کی رائے میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اور اُن کے فیصلہ کو کون بدل سکتا ہے۔

افتخار مرزا: مگر ظلِ سبحانی کو، ان تمام چیزوں پر اتنا اعتقاد کیوں ہے؟

بیرم خاں: یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بہت متاثر ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اس کے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں تم کو شہنشاہ ہمایوں کا ایک دلچسپ واقعہ سُناتا ہوں، جو عالمِ شہزادگی میں اُن پر گزرا۔

ایک دن شہزادہ ہمایوں، مولانا مسیح الدین کے ہمراہ شکار کو گئے۔ میں بھی ہم رکاب تھا۔ اچانک شہزادہ ہمایوں کو یہ خیال آیا کہ پہلے جو تین آدمی ملیں اُن سے فال لینی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ سے اور

مولانا مسیح الدین سے کہا۔ ہم دونوں نے یہی کہا کہ تین آدمیوں سے فال لینا مناسب نہیں۔ آپ ایک آدمی سے فال لے لیں۔ لیکن شہزادے اس پر راضی نہ ہوئے۔ ابھی ہم لوگ زیادہ دُور نہ گئے تھے کہ سامنے سے ایک شخص آتا ہُوا نظر آیا۔ شہزادہ نے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ تمھارا نام کیا ہے؟

اُس نے جواب دیا۔ مجھے "مراد خواجہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک دوسرا شخص ملا جو اونٹ پر چلا جا رہا تھا۔ شہزادے نے اُسے روک کر اُس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا۔ میرا نام "دولت خواجہ" ہے۔ اس پر شہزادہ ہمایوں کو بہت تعجب ہُوا۔ اور انھوں نے کہا کہ اگر تیسرے آدمی کا نام "سعادت خواجہ" ہُوا تو بڑا لطف آئے گا اور بہت نیک شگون ہوگا۔ ہم لوگ اسی طرح بڑھے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک گڈریا آتا ہُوا نظر آیا۔ شہزادے نے بڑی بیتابی سے اُس سے اس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا ناچیز کو سعادت خواجہ" کہتے ہیں۔ اس سے ہم سب کو بڑا تعجب ہُوا۔ اور سب نے اس فال کی بڑی تعریف کی۔ اب شہنشاہ ہمایوں مالک تخت و تاج ہیں لیکن اب تک اس واقعہ کا اُن کے دل و دماغ پر کافی اثر ہے۔ انھوں نے اپنی تمام رعایا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اہل دولت، اہل سعادت اور اہل مراد۔

"اہل دولت" میں اخوان، اقربا، امراء، وزراء اور دوسرے میں منصب دار وجاگیردار شامل ہیں۔

"اہل سعادت" میں صدر عظام، مشائخ وکرام، سادات وذی الاحترام وعلماً

تفضیات اسلام، فضا، شعرا۔ اشراف وغیرہ شامل ہیں۔

اور ناچنے گانے والوں کو "اہلِ مراد" میں شامل کیا گیا ہے۔

افتخار مرزا : خوب۔ بہت خوب۔ مگر یہ سب انتظامات کب ہوئے ؟

بیرم خاں : کل میں شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں حاضر تھا۔ ملک کے جوتشیوں، نجومیوں اور اجرامِ فلکی کے ماہروں نے شہنشاہ کو چاند کی طرح حلقہ میں لے لیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان ماہرینِ فلکیات کا خیال تھا کہ اگر شہنشاہ مکرم اپنے تمام امورِ ملکی کو اُن کے حسبِ ہدایت ڈھال لیں اور ہر کام کے لیے ستاروں کی گردش اور سعد و نحس تاریخوں کا خیال رکھیں تو وہ ہمیشہ کامیاب و خوش و خرم رہیں گے۔ اس لیے شہنشاہ نے اُن کے زرّین مشورہ کو قبول کرتے ہوئے تمام رعایا کو، اہلِ دولت، اہلِ سعادت اور اہلِ مراد میں تقسیم کر دیا اب وہ ہر مہینے، ہر ہفتے اور سال کے ہر دن کو جداگانہ ناموں سے تقسیم کریں گے۔ مثال کے طور پر اہلِ سعادت سہ شنبہ کو وقت چاشت شہنشاہ سے سرخ لباس میں مل سکیں گے۔ اہلِ دولت، چہار شنبہ کو وقت نصف شب زرد لباس میں ظلِ سبحانی سے مل سکیں گے۔ کیونکہ اس وقت برج رحل۔ برج قمر میں داخل ہوتا ہے۔

افتخار مرزا : لاحول ولاۃ۔ یہ کیا حماقت ہے۔ اس طرح ملکی انتظام میں بڑا خلل پڑ جائے گا۔ اگر کوئی بغاوت کرے۔ اور اُس دن نجوم کے علم کے مطابق صرف اہلِ مراد بارگاہ سلطانی میں پیش ہو سکیں گے تو پھر اہم معاملات کو کس طرح جلد از جلد سلجھایا جا سکے گا۔

بیرم خاں : میں خود حیران ہوں اور کوئی بات ہوتی تو شہنشاہ کو روکنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ان حالات میں میں کیا کرسکتا ہوں۔ شہنشاہ علم نجوم پر ایسا ایمان لے آئے ہیں کہ اُن کے یقین کو متزلزل کرنا اتنا آسان نہیں۔

افتخار مرزا : بہر حال ہم کو اس سلسلہ میں ضرور کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔

بیرم خاں : بے شک یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور ہم اس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اس طرح تمام نظامِ حکومت درہم برہم ہوجائے گا۔

افتخار مرزا : اچھا۔ آپ صفدر خاں کی سفارش کب کر رہے ہیں ؟

بیرم خاں : آپ جاکر ان کی صاحبزادی سے کہہ دیجیے۔ جن کے عشق نے آپ کو دیوانہ بنا رکھا ہے کہ ظلِ سبحانی نے فی الحال اُن کے ابّا حضور کو یک ہزاری کے منصب بلند پر مقرر کیا ہے۔ اور خیمہ، خرگاہ، مکان، سوار، خلعت اور اسپ مرصع دینے کے لیے تیار رہیں۔ ارے اگر تمہارے معشوق کے کام نہ آئے تو پھر کس کے کام آئیں گے ؟

افتخار مرزا : (ہنستے ہوئے) بہت بہت شکریہ !

بیرم خاں : مگر افتخار مرزا یاد رکھو، یہ عشق و عاشقی سپاہی کی موت ہے۔ تم بہت اچھے انسان تھے۔ خدا معلوم تم کو یہ اچانک کیا ہوگیا۔

افتخار مرزا : بیرم خاں میں بھی پہلے عشق کا اور اہل جنون کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ عشق خلل دماغی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن جب سے میں نے ناہید کو دیکھا۔ ایک عجیب خلش۔ ایک عجیب چبھن، اور ایک بے چینی سی محسوس کر رہا ہوں۔ ہائے حافظ نے ٹھیک کہا ہے۔ ؎

ما در پیالہ عکس رُخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ دوامِ ما

بیرم خاں : واہ واہ۔ مولانا روم نے خوب کہا ہے :

شاد باد اے عشق ، خُوش سودائے ما
اے طبیبِ جُملہ علتہائے ما

افتخار مرزا : بے شک مولانا روم نے سچ کہا ہے۔ عشق ہماری ہر بیماری کا معالج ہے۔ جو شخص کوچۂ یار میں اپنی زندگی گزار دے اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے۔ ہائے کیا شعر ہے۔

حاصلِ عمر نثار رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

بیرم خاں : افتخار تمہارے اوپر عشق و شاعری کا بھوت سوار ہے یا دوسرے الفاظ میں ناہید سوار ہے۔ ورنہ میں تم سے اہم ملکی مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ ملک کے حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

افتخار مرزا : ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

بیرم خاں : افتخار مرزا تم کو اندازہ نہیں کہ ملکی حالات کس درجہ نازک صورت اختیار کر گئے ہیں۔

افتخار مرزا : میں کچھ نہ سمجھا۔

بیرم خاں : تم نے دیکھا کہ شہنشاہ ہمایوں کے تخت نشین ہونے سے پہلے خواجہ خلیفہ نے سید مہدی خواجہ کو برسراقتدار لانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کامران نے جو کچھ کیا وہ تاریخِ غداری میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

افتخار مرزا : ہاں خود شہنشاہ ——— !

بیرم خاں : شہنشاہ ہمایوں کی بات نہ کرو۔ افیون کے استعمال اور نجومیوں اور کچھ آرام پسندی نے ان کے تمام اعلیٰ صفات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ہر وقت نجومیوں کے چشم و ابرو کے اشارے پر گردش کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ نجومیوں سے بڑا وہ ہے۔ جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور اس میں تاروں کی قندیلیں روشن کیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مالک حقیقی ہے۔ اس کے علاوہ دُنیائے ناپائدار میں کوئی ایسی شے نہیں جس پر تکیہ کیا جا سکے۔ اس لیے افتخار مرزا آپ کا اور ہمارا یہ فرض ہے کہ سلطنت مغلیہ کو کمزور نہ ہونے دیں۔ جب کسی آفت کو آتا ہُوا دیکھیں تو سینہ سپر ہو جائیں۔ کیونکہ ہم پر شہنشاہ نے بہت احسانات کیے ہیں اور وہ اب بھی ہم کو اپنا صحیح غم خوار سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی سچی بات کے کہنے کے لیے ہم کو شہنشاہ کی ناراضگی بھی اٹھانا پڑے تب بھی اس کا غم نہیں۔

افتخار مرزا : بیرم خاں میں تمھاری قدر کرتا ہوں اور تمھاری اس قربت اور دوستی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا وہ بڑے خلوص

نیت سے کیا اور میں اپنے آپ کو باعثِ صد افتخار سمجھتا ہوں کہ میرے دوستوں میں آپ جیسے افراد بھی شامل ہیں۔ جو ہر قسم کے صلے سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ جو حق بات کہنے سے نہیں ڈرتے۔ جو بات کو فائدے اور نقصان کی ترازو پر نہیں تولتے۔ لیکن بیرم خاں۔ ہمارا یہ معاشرہ بڑا گندہ ہے۔ لوگ اب تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس دور میں شہنشاہ سفید و سیاہ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے۔ اس کو کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔ وہ آزاد اور مطلق العنان حکمران ہے۔ انسانوں پر خدا کا غضب بادشاہوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے اور اگر خدا کسی کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کرنا چاہتا ہے تو اس پر بادشاہ وقت کو مہربان کر دیتا ہے۔ بادشاہ ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ جو اُس کے جی میں آئے کر سکتا ہے۔ مگر بیرم خاں کیا ایسا ہی ہے۔ تم تو شہنشاہ مکرم کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ ہر بادشاہ اپنے امراء سے ڈرتا ہے۔ اور اُن کو کسی قیمت پر ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ ہمارا نظامِ حکومت کچھ ایسا ہے کہ اس میں قوت اور طاقت کا مرکز خود شہنشاہ نہیں بلکہ امراء ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان ایک غیر ملک ہے اور یہاں کی رعایا ہندو ہے۔ وہ مسلمان حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ اور ہر باہر کے آدمی کو ڈاکو اور اپنے مذہب و ملّت کا دشمن خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے حکومت کا ڈھانچہ، عوامی نہیں بلکہ سپاہیانہ ہے۔ سپاہ بھی کسی ایک نسل و قبیلہ کی نہیں جس میں اتحاد و اتفاق رہ سکے بلکہ اس میں مغل، افغان، ترکی، ایرانی، اور ہندو سب ہی شامل ہیں۔

بیرم خاں : تم ٹھیک کہتے ہو۔ گجرات میں بہادر شاہ نے اپنی قوت کو بہت بڑھالیا ہے۔ ادھر افغان اور لودھی اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ بہار اور بنگال میں شیر خاں اپنی قوت اور طاقت کو بڑھا رہا ہے۔ اگر ایسی صورت میں کامران نے کوئی فتنہ پیدا کر دیا تو اس کا روکنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ افتخار مرزا میری تو راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شہنشاہ ہمایوں ایک کوہ آتش فشاں پر بیٹھے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر' سلطنتِ مغلیہ کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔

افتخار مرزا : بیرم خاں واقعی تم نے میری آنکھوں پر سے پردے اٹھا دیے۔ واقعی ملک کی حالت نازک ہے۔ خدا شہنشاہ ہمایوں کو زندہ سلامت رکھے۔ اور ہم کو ہر حال میں وفادار اور ثابت قدم رکھے۔

اتنی دیر میں شاہی ہرکارہ آیا جس کی آمد پر دونوں نے درباری لباس پہنا اور شاہی محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

باب ۱۰

غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ رُوزگار ہوتا

دنیا نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔ خسرو خاور کی حکومت ہو گئی تھی اور ملکہ شب کے سیاہ گیسو فضائے بسیط پر پھیل چکے تھے۔ چاند شہزادی شب کے ماتھے کے ٹیکے کی طرح چمک رہا تھا اور ستاروں نے گویا عروس شب کی مانگ میں افشاں چھڑک دی تھی۔ وہی آگرہ جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اب وہاں ہو کا عالم ہے۔ وہ سڑکیں جن پر ہر وقت ہزاروں انسانوں کا شور و غل رہتا تھا۔ سنسان پڑی تھیں۔ ایک سناٹا اور سکوت ہر طرف طاری تھا۔ شہنشاہِ خاموشی کا دور دورہ تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے انسان نیند کی آغوش میں جا چکے تھے۔ سکوت اتنا مکمل تھا۔ گویا زندگی موت کی آغوش میں چلی گئی ہے۔

مگر جمنا کے کنارے ایک سبز رنگ کے چھوٹے سے خوش نما محل کے غربی کمرے سے روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔ ناہید اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی ہے۔ خیالات اُس کو خدا معلوم کہاں سے کہاں لے گئے۔ وہ سوچ رہی ہے۔

"میں خود عروج و زوال۔ پستی و بلندی انقلابات عالم کا ایک زندہ کرشمہ ہوں۔ ابھی کل کی بات ہے میری والدہ حیات تھیں۔ والد برسرِ روزگار تھے گھر میں روپیہ کی ریل پیل تھی۔ عیش ہی عیش اور نغمہ ہی نغمہ تھا۔ اچانک ایک

انقلاب آیا۔ باپ سے جدائی ہوئی ۵ سال کی طویل مدت مفلسی میں گزاری ماں کا انتقال ہُوا۔ پھر خبر ملی کہ باپ بھی شہید ہوگئے، میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ اکبری نے میرے اوپر بڑا احسان کیا وہ مجھے اپنے گھر لے گئی ورنہ شاید یہ جسم وجان کا رشتہ کبھی کا ختم ہوجاتا والدین کے بعد زندگی اُداس وویران تھی۔ میرا کوئی مقصد حیات نہ تھا اور میں بے کیفی کے ساتھ زندگی کے دن پورے کررہی تھی۔ لیکن پھر قسمت نے پلٹا کھایا اور تم۔ ہاں تم۔ اس مرتبہ ظالم افتخار تم۔ مسیحا بن کر آئے اور دیکھتے دیکھتے میرے وجُود پر چھاگئے۔ ہائے میں نے کتنی کوشش کی کہ تمہارے اوپر۔ اپنے دل ودماغ کے دروازے بند کرلوں۔ لیکن جب تمھاری یاد آئی تو میرے دیدہ و دل تمھارے استقبال کے لیے فرش راہ بن گئے۔ میں کتنی کوشش کرتی ہوں کہ تم کو حرم سرائے دل میں داخل نہ ہونے دوں۔ لیکن تم اس میں دبے پاؤں آجاتے ہو۔ میں نے غلط کہا۔ تم میرے گوشۂ دل سے نکلے ہی کب تھے کہ تم کو باہر سے آنے کی ضرورت پیش آئے میں نے بارہا اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دیا کہ میں تمھاری یاد کو اپنے ذہن کی گہرائیوں سے نکال چکی ہوں لیکن پھر بھی تصور میں تم ہی تم جلوہ گر نظر آتے ہو۔ ہائے سعدی نے کیا خوب میرے جذبات کی ترجمانی کی ہے ؎

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست
تا ندانند حریفاں کہ تو منظور منی

ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ پھر زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ کتنا حسین تھا یہ انقلاب، اور کتنا خوبصورت اور جاذب نظر تھا اس انقلاب کا لانے

والا۔ آہ جی چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ سامنے رہے۔ یہ پیغمبر انقلاب بالکل نیا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ میرے والد کو زندگی بخشی اور ان کو زندہ رہنے کا احساس دلایا، اُن کی بیٹی سے انھیں ملایا۔ اُنھیں ایک ہزار کے منصب پر فائز کیا۔ بلکہ اُس نے میرے گوشۂ دل کو محبت کے نور سے جگمگا دیا۔ وہ دل جس نے کبھی کسی کی طرف رُخ نہ کیا تھا اُس کا اسیر ہوگیا۔ وہ آنکھیں جو کسی کی منتظر نہ تھیں اب کسی کے کے لیے چشمِ براہ تھیں۔ وہ نگاہیں جو کسی کے لیے پُرآپ نہ ہوئی تھیں اس خوبصورت انقلابی کے لیے مسلسل بہنے لگیں۔ وہ دل جس میں کسی کا درد نہ تھا اب کسی ایک شخص کے وجود سے مملو ہوگیا۔ اُس نے میرے دل کو ہلا دیا۔ مجھے ایک مشتِ خاک سے انسان بنا دیا اور اس میں بلا کی تڑپ اور زندگی بھر دی۔ اُس نے ایک جسدِ بے رُوح میں نئی روح دوڑا دی۔ اور اُس کی مسیحائی سے ایک بے کار وجود، باکار ہوگیا۔ جس گلشن نے کبھی بہار کا منہ بھی نہ دیکھا تھا اب وہاں تمناؤں کا باغ لہلہا رہا تھا۔ جہاں پہلے رنج و غم کی حکمرانی تھی۔ وہاں خوشی و مسرت نے قبضہ کرلیا تھا۔ جہاں پہلے کچھ نہ تھا وہاں اب سب کچھ تھا میرے دل کی حیات اس کی مرہونِ منت ہے میں اسی ظالم اور قاتل کی ماری ہوئی ہوں۔ پھر بھی اپنے اوپر اتنی قدرت نہیں رکھتی کہ اس کو اپنے ذہن کی گہرائیوں سے نکال دوں۔

آہ افتخار! تم کیوں میری زندگی میں آگئے۔ تم نے کیوں مجھے باغِ محبت کی سیر کرائی۔ دیکھیے اس چاہ کا کیا انجام ہو۔ میرا دل کیوں بدگمانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مجھ کو تم سے

جُدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افتخار وعدہ کرو گے کہ تم آگے بڑھ کر پیچھے نہ ہٹو گے۔ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے۔ وعدہ کرو کہ میرے ساتھ زندگی کے اس بھیانک سفر کو خوش گوار بناتے چلے جاؤ گے!

مگر ناہید۔ تو کیوں ایک مغل سے اتنی توقعات وابستہ کر رہی ہے یہ وہی مغل تو ہے جس نے تجھ کو تباہ و برباد کیا۔ کیا مغل سے مہر و وفا رکھنا۔ افغان قوم سے غداری نہیں۔

مگر میں افغان قوم کے ساتھ غداری کر سکتی ہوں لیکن افتخار کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ میرے محسن۔ تم بڑے اچھے بڑے شریف اور بڑے اُونچے کردار کے انسان ہو۔ میں بھلا تم کو اپنے صفحۂ دل سے کیسے مٹا سکتی ہوں۔ افتخار! شاید اس وقت تم اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہو گے۔ تم کو کیا معلوم کہ کوئی تمھارے فراق میں کروٹیں بدلا کرتا ہے۔ تم کیا جانو کہ جب سے تم سے ملاقات ہُوئی ہے۔ میری آنکھیں خواب سے کوسوں دُور ہیں۔ نیند کم بخت آتی ہی نہیں۔ تمام رات ایک عجیب بیقراری میں گزرتی ہے۔ افتخار سچ کہنا کیا تمھاری بھی یہی کیفیت ہے۔ نہیں۔ تم کو کیا۔ تم دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر چین سے بستر پر آرام کرتے ہو اور میں رات بھر فراق کے صدمے سہتی رہتی ہوں۔ لو اب تو سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔

چلو اچھا ہُوا۔ اس بیقراری سے تو فرار ملا۔

ناہید اُٹھی، ضروریاتِ زندگی سے فارغ ہو کر اُس نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی۔ نماز کے بعد وہ دیر تک اپنی شیریں آواز میں تلاوتِ کلام

پاک کرتی رہی۔ پھر نعت و منقبت پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ باورچی خانہ میں گئی۔ خادمہ کو ناشتہ کے لیے اور گرم پانی کی ہدایات دے کر وہ اپنے والد کے کمرے میں گئی۔

ناہید : ابا حضور۔ تسلیم۔

صفدر خاں : جیتی رہو۔ بیٹی۔

ناہید : ابا حضور۔ گرم پانی آگیا ہے۔ وضو کر لیجیے۔

صفدر خاں : بیٹی۔ خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔

صفدر خاں نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ناہید نے اتنی دیر میں ایک مسند پر ناشتہ چن دیا۔ صفدر خاں نماز صبح سے فارغ ہوتے اور مصلے سے سیدھے دستر خوان پر آتے۔

ناہید : کہیے ابا حضور۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ؟

صفدر خاں : بیٹی۔ میں اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ تمھاری آنکھیں سرخ ہیں۔ چہرہ بھی کچھ افسردہ ہے۔ کہیں میری بیٹی کو کوئی شکایت تو نہیں ہو گئی !

ناہید : جی نہیں۔ ابا حضور۔ میں آپ کی دعا سے بخیریت ہوں۔ صرف رات نیند ذرا دیر میں آئی۔ اس لیے آنکھیں ذرا بوجھل ہو گئی ہیں۔

صفدر خاں : بیٹی۔ رات کو زیادہ دیر تک نہیں جاگتے اس سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ کیوں بیٹی۔ کیا افتخار ابھی سو کر نہیں اٹھے۔

ناہید : ابا حضور۔ میں ابھی معلوم کیے لیتی ہوں۔

صفدر : کتنا شرمیلا ہے یہ افتخار۔ تیری وجہ سے اس نے میرے پاس بھی آنا چھوڑ دیا۔ میں نے کتنی مرتبہ کہا کہ صبح کو ناشتہ میرے ساتھ کر لیا کرو لیکن وہ اپنی فطری شرافت کی وجہ سے ہمیشہ ٹال جاتا ہے۔

ناہید : ابا حضور۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کو بُلوا لوں۔

صفدر خاں : نہیں بیٹی۔ وہ ایسے نہیں آئے گا مجھے خود جانا چاہیے۔

ناہید : ابا حضور آپ کہاں تکلیف کریں گے میں اُن کو بُلائے لاتی ہوں۔

ناہید یہ کہہ کر پھرتی سے کمرے سے نکل گئی۔ اور افتخار کے کمرے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ناہید نے دیکھا کہ افتخار مرزا کی پشت دروازے کی جانب ہے اور وہ جھکے ہوئے کسی چیز کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ناہید دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور اُس کے قریب پہنچی۔ افتخار مرزا اپنے کام میں اتنا محو تھا کہ اُس کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ناہید نے دیکھا کہ افتخار کے ہاتھ میں ایک تصویر ہے جس کو وہ بغور دیکھ رہا ہے۔ اُس نے جب اس تصویر پر نظر ڈالی تو وہ اُس کی تصویر تھی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فرطِ مسرت سے وہ گُلِ نوشگفتہ کی طرح کھل گئی۔ شرم و حیا کی نقاب اس کے خوبصورت چہرہ پر پڑ گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ افتخار مرزا نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کا محبوب اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جس بُت کی پرستش کر رہا تھا وہ اُس کے سامنے موجود تھا۔ افتخار نے تصویر کو جلدی سے رکھ دیا۔ اُس نے اپنی کانپتی ہوئی نگاہیں ناہید پر ڈالیں۔ ناہید نے دیکھا کہ اُس کی پلکوں پر ستارے رقص کر رہے تھے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ مسرت کے آنسو

ہیں یا اُس کے فراق میں بہائے ہُوئے آنسوؤں کا نشان دے رہے ہیں۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ان خوبصورت آنکھوں کو چوم لے۔ لیکن اُس نے اپنے دل پر بہت زیادہ قابو پاتے ہُوئے کہا۔

ناہید : ابا حضور نے آپ کو یاد کیا ہے۔ سُنا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میں عیادت کے لیے آئی ہوں۔

افتخار : ؏

خوشا احوالِ مہجوری عیادت کو وہ آئے ہیں
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

ناہید : خوب، شعر تو آپ نے بہت خوبصورت پڑھا —— ابا حضور آپ کا ناشتہ پر انتظار کر رہے ہیں۔

افتخار : اور آپ ؟

ناہید : میں آپ کے ہمراہ چلنے کی منتظر ہوں۔

افتخار : خوش قسمت۔ چلیے۔

ناہید اور افتخار کمرے سے نکلے۔ ناہید نے فقرہ کسا۔

ناہید : یہ صبح ہی صبح کیا ہو رہا تھا۔

افتخار : اشکِ صبح گاہی سے وضو کر رہا تھا۔

ناہید : (تجاہل سے) میں آپ کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔

افتخار : دیکھو حافظ نے اس واقعہ کی کتنی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔

ناہید : کیا ؟

افتخار : ؎ من در پیالہ عکس رُخِ یار دیدہ ایم

ناہید : مگر آپ کے پاس کوئی پیالہ نہیں۔

افتخار : شاید حافظ کے پاس کوئی دیکھنے کی چیز نہ تھی اس لیے انھوں نے پیالہ ہی میں محبوب کا عکس دیکھ لیا۔

ناہید : مگر یہ چوری اچھی نہیں !

افتخار : اپنی چیز کی چوری جائز ہے۔

دونوں اس طرح مسکراتے ہُوئے صفدر خاں کے کمرے میں داخل ہوئے۔ افتخار نے بڑھ کر صفدر خاں سے مصافحہ کیا اور ان کی طبیعت کا حال دریافت کیا۔

صفدر خاں : بیٹا افتخار۔ تم مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ جسے تم جیسا ہمدرد و غم گسار مل جائے اُسے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔

افتخار مرزا : حضور میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں، کہ مجھے آپ کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ ہاں اس وقت میں یہ کہنے کے لیے آ رہا تھا کہ رات شہنشاہ ہمایوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ سلطان بہادر والی گجرات کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے فوج کشی کریں گے اور اس معرکہ میں ظلِ سبحانی بنفسِ نفیس تشریف لے جائیں گے۔ اس لیے مجھے شہنشاہ ہمایوں کے ہمرکاب رہنا ہوگا۔ میں آج ۵ بجے شام یہاں سے اپنا لشکر لے کر شہر سے باہر شاہی لشکر کے پیش خیمہ سے مل جاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری عدم موجودگی میں کسی قسم کی غیریت یا تکلیف نہ کریں گے۔ میں انشاءاللہ اس مہم کے ختم ہوتے ہی فوراً آگرہ آجاؤں گا۔

صفدر خاں : بیٹا افتخار۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تمھاری دانست میں میں اتنا بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں کہ میں تمھارے ہمراہ نہ چل سکوں گا۔ بیٹا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں گھر میں چارپائی پہ پڑا رہوں اور تم جنگ کے شعلوں میں گھرے رہو۔ بیٹا۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ اگر تم مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے تو میں تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گا۔!

افتخار مرزا : قبلہ! میں آپ کے شجاعانہ جذبات اور اپنی ہمت و جرأت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ جب نقارۂ جنگ بج جاتا ہے تو ایک سپاہی کے لیے جس نے اپنی تمام زندگی میدانِ جنگ میں گزاری ہے۔ گھر میں پڑا رہنا بہت گراں گزرتا ہے۔ میں آپ کو اپنے ہمراہ لے جانے میں یقیناً فخر محسوس کرتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ناہید کی تنہائی نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ میں آپ سے گھر پر رہنے کی درخواست کروں۔

صفدر خاں : افتخار مرزا، اگر میں مغلیہ حکومت کا ملازم نہ ہوتا تو شاید تم سے اصرار نہ کرتا۔ لیکن یہ میری غیرت کے منافی ہے کہ جس شہنشاہ نے مجھے ملازمت، شہرت اور عزت دی۔ میں مصیبت کے وقت اُس کے کام نہ آؤں۔

ناہید : ابا حضور، تمام سپاہی ایک ہی مرتبہ میدانِ جنگ میں نہیں جاتے۔ آپ یہاں رہ کر بھی اپنی ملازمت کا فرض پورا کرسکتے ہیں۔ یہ ایک معمولی سی مہم ہے۔ اس کو سر ہو جانے دیجیے۔ اس کے بعد بھی آپ کو اپنی وفاداری اور بہادری و جاں نثاری کے بہت سے مواقع ملیں گے۔

اس وقت آپ اپنے ارمان نکال لیجیے گا۔ مگر اس وقت نہ جائیے آپ بہت کمزور ہیں۔ اور میں بھی اکیلی ہوں۔

صفدر خاں: بیٹی نیک کام میں بولا نہیں کرتے۔ تم تو اتنی بہادر اور جفاکش ہو کہ تم نے اکیلے گھر میں پانچ سال گزار دیے یہاں تو خدا کے فضل سے نوکر، چاکر، کنیزیں، باندیاں اور خدمت گار موجود ہیں۔ یہ تمھارا دل بہلانے کے لیے کافی ہیں۔

صفدر خاں کو افتخار مرزا اور ناہید نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ جنگ پر جانے کے لیے بالکل آمادہ ہو گئے اور اپنے رسالے کے چیدہ چیدہ سپاہیوں کے ہمراہ لڑائی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

افتخار مرزا: اچھا محترم، اگر آپ مُصر ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ میرے ہی دستہ میں سپہ سالار کی حیثیت سے رہیں گے۔ میں شہنشاہ ہمایوں سے اس کا تذکرہ کروں گا اور وہ یقیناً اس فیصلہ سے بہت خُوش ہوں گے۔ یہ کہہ کر افتخار مرزا نے صفدر خاں سے رخصت لی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ناہید سُنبل کی طرح پیچ وتاب کھاتی ہُوئی اپنے کمرے میں گئی اور اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اُس کو افتخار پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ عجیب انسان تھا۔ وہ اُس کی پرستش کرتا ہے۔ لیکن جب وہ خود سامنے آجاتی ہے۔ تو کسی نہ کسی بہانے اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ افتخار مرزا کے کردار کی یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس کو اس وقت بہت غصہ

آرہا تھا۔ افتخار جا رہا ہے۔ لیکن اُس نے ایک نظر بھر کر بھی مجھے نہ دیکھا اور صرف ابا حضور سے باتوں میں مشغول رہا۔ اُس نے چلتے وقت دو لفظ ہمدردی کے بھی نہ کہے ظالم، بیدرد، بے وفا، قاتل، یہ کہہ کر اُس نے رونا شروع کر دیا اچانک اُس کو کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اُس نے اپنے دوپٹے کے سرے سے اپنے آنسو خشک کیے اور آنے والے کو دیکھا۔ آنے والا افتخار نہ تھا بلکہ اُس کی خادمہ تھی۔ جو ایک پلیٹ میں ایک لفافہ لیے ہوئے تھی۔ ناہید نے بڑھ کر لفافہ لیا اور پتہ پر نظر ڈالی۔ لفافہ پر اپنا پتہ دیکھ کر سخت حیران ہوئی۔ اُس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔

پیاری ناہید!

"تم حیران ہو گی کہ صبح اُٹھ کر تمھاری تصویر کو پوجنے والا اتنا سنگ دل کیسے ہو گیا کہ اپنے جنگ پر جانے کی خبر سُنا کر بھی تم سے ایک لفظ ہمدردی بھی نہ کہہ سکا۔

ناہید۔ اگر ابا حضور نہ ہوتے تو شاید میں یہ خبر تم کو نہ سُنا سکتا۔ ناہید یقین کرو۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ جب تمھارے روبرو ہوں گا تو تمام اگلے پچھلے گلے شکوے تم سے کروں گا۔ لیکن تمھارے آتے ہی رعب حسن سے کچھ ایسا از خود

رفتہ ہو جاتا ہوں کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔

ناہید۔ میں تم کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اس کا مجھے کتنا دکھ ہے۔ یہ تو کوئی ایسا ہی غم نصیب بتا سکتا ہے جس نے فراق کی راتوں کو انگاروں پر لوٹ لوٹ کر سحر کی ہو۔ ناہید تمہاری مفارقت مجھ پر بہت گراں گزرے گی لیکن ناہید۔ دیکھو رشتہ صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ گھبرانا نہیں۔ میں جنگ کے ختم ہوتے ہی فوراً واپس آ جاؤں گا۔

ارے تم نے رونا شروع کر دیا نہیں ناہید نہیں اکیلا میدان جنگ میں نہیں جا رہا ہوں بلکہ تمہاری یاد بھی میرے ساتھ ساتھ ہے۔ ناہید حالات سے پریشان نہ ہونا اور ہمیشہ یہ خیال رکھنا کہ تم کو اگر اپنے لیے نہیں تو کسی دوسرے کے لیے زندہ رہنا ہے۔

فراق نصیب

افتخار

افتخار مرزا کا خط پڑھ کر ناہید نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی امیدوں کا چراغ اچانک گل ہو گیا۔ وہ چراغ جس کو افتخار کی محبت نے روشن کیا تھا اور اس کی جگہ خدشات اور توہمات نے لے لی۔ اس لڑائی کا کیا

انجام ہوگا اور اگر اس لڑائی میں مغلوں کی ہار ہوئی۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکی۔ اُف میں کس قدر بدنصیب ہوں جب سے پیدا ہوئی ہوں میری زندگی انھیں لڑائیوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس لڑائی کے چکر میں میرا گھر کا گھر تباہ ہوگیا۔ اور اب اگر اس لڑائی میں افتخار مرزا کو کچھ ہوگیا۔ اُف میرے خدا۔ کتنا قیامت خیز ہے یہ خیال، کتنا وحشت ناک ہے یہ تصور۔ ہائے میں کیا کروں، کس طرح ان کو روکوں کیا میں تمام عمر لڑائیوں کے اختتام کا انتظار کروں گی یہ لڑائی جھگڑے کبھی ختم نہ ہوں گے۔ یہ جنگ و جدال انسان کی فطرت ہے اسے کون روک سکتا ہے۔

پالنے والے تو افتخار مرزا کو اپنی حفظ و امان میں رکھ۔ پالنے والے تو ان کو زندہ و سلامت رکھ۔ وہی میرا آسرا ہے۔ وہی میری زندگی ہے۔ میرے گلستان کی بہار وہی ہے خداوندا اس پر رحم فرما۔

ادھر شاہی فوج کوچ کی تیاری کر رہی تھی شاہی پیش خیمہ باغ گلفشاں میں نصب ہو چکا تھا اور لوگ اپنا اپنا سامان خیمہ، خرگاہ، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، نوکر، چاکر، صراحی بردار وغیرہ کے ساتھ اپنے اپنے رسالہ اور خیمے میں جمع ہو رہے تھے۔ اس وقت بیرم خاں اور افتخار مرزا بھی اپنے اپنے خیموں کا جائزہ لینے آتے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بیرم خاں کی نظر افتخار کے چہرہ پر پڑی۔

بیرم خاں : افتخار مرزا میں نے ہمیشہ جنگ میں جاتے ہوئے تمہارے چہرہ کو خوش و خرم دیکھا ہے۔ لیکن آج تم اُداس نظر آ رہے ہو۔

افتخار مرزا : بیرم خاںؔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ موت خود زندگی

کی محافظ ہے۔ لیکن اس وقت ناہید سے جدا ہونے کے خیال نے میرے دل میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے۔

بیرم خاں : خوب۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

افتخار، دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ عشق کی وادی میں قدم نہ رکھو۔ کیونکہ یہاں انسان کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا!

افتخار مرزا : بیرم خاں تم سچ کہتے ہو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میرے دل کو دونوں ہاتھوں سے مسل رہا ہے۔ میں نے کبھی یہ تڑپ۔ یہ بے چینی اپنے اندر نہ دیکھی تھی کیا میں بزدل ہو گیا۔

بیرم خاں : نہیں تم بزدل نہیں ہو بلکہ اس عشق نے تم کو نکما کر دیا ہے۔ ورنہ تم بھی بڑے کام کے آدمی تھے۔ خیر گھبراؤ نہیں۔ اس لڑائی کے اختتام پر ہم خود صفدر خاں سے اس مسئلہ میں گفتگو کریں گے اور اگر وہ آمادہ ہو گئے تو تمھاری عاشقی کو حدِ شریعت میں لا کر جلوہ کثرتِ اولاد دیکھیں گے۔

افتخار مرزا : میرے اچھے دوست۔ میرا دل سوزِ عشق سے فگار ہوا جاتا ہے۔

بیرم خاں : بکومت۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تم کو اس بات کی اجازت دے دیں کہ تم اپنی محبوبہ کو اپنے ہمراہ میدانِ جنگ میں لے چلو۔ شاید تم قرونِ وسطیٰ کے سرفروشوں اور قوم کی ان عورتوں کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہو

جو میدانِ جنگ میں جا کر اپنے شوہروں، بھائیوں، دوستوں، عزیزوں کو غیرت دلاتی تھیں اور ان کو اپنی قوم کے لیے مرنے مارنے کے لیے آمادہ کرتی تھیں لیکن تم اس سلسلہ میں بھی پھسڈی ہو۔ تم صرف یہ چاہو گے کہ جب ساری دُنیا جنگ کے شعلوں میں گھری ہو تو تم محبوب کی زلفوں کے سایہ تلے آرام کرو۔ بیرم کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ البتہ جنگ کو فتح کرنے کے بعد میں تم کو ناہید سے ملانے کا وعدہ کر سکتا ہوں۔

افتخار مرزا: (ہنس کر) شکریہ

اس طرح یہ دونوں کیمپ کا معائنہ کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک کنیز آئی۔ افتخار نے دیکھا تو وہ اُس کی کنیز تھی جس کو اُس نے خاص طور پر ناہید پر مقرر کیا تھا۔ افتخار کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کو اندیشہ ہائے دور دراز نظر آنے لگے۔ جب وہ افتخار مرزا کے قریب آئی تو اُس نے ایک خط نکال کر افتخار کو دیا۔ اُس نے جلدی سے خط کھولا۔ خط کے الفاظ یہ تھے۔

میرے محسن!

آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بغیر ملے جنگ پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ جنگ کے ہنگاموں میں گُم ہو جائیں گے اور آپ کی پوری توجہ اور پورا ذہن اُسی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اس طرح کام میں آپ کا طویل سے طویل وقت گزر جائے گا۔ مگر یہ تو فرماتے جائیے کہ میں آپ

کی مفارقت میں کس طرح زندگی کے دن گزاروں
گی کاش آپ مجھ سے آخری مرتبہ مل سکتے تاکہ
میں آپ کو ایک نظر دیکھ لیتی۔

طالب دیدار

ناھید

افتخار نے خط بند کر دیا اور ایک عجیب فکر کے عالم میں کھو گیا۔ اُس نے کتنی اذیتوں اور ضبط نفس کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ناہید سے رخصت نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر دل اس گلی میں جا کر چل گیا تو اس کا منانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ناہید سے رخصت ہوتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ یہ تصور اس کے لیے بڑا عجیب اور وحشت ناک تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو الوداع کہے۔ ہائے کس منہ سے کہے۔ کیونکر کہے اور کیسے کہے۔ وہ کئی گھنٹے سوچتا رہا کہ وہ چلتے وقت ناہید سے ملے یا نہ ملے۔ اُس نے اپنے دل پر جبر کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ وہ ناہید سے نہیں ملے گا۔ لیکن ناہید کی اس مختصر مگر موثر تحریر نے اس کے عزم و استقلال کو اس طرح تہہ و بالا کر دیا جس طرح سمندر کی موجیں کسی کشتی کو ڈبونے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اب پھر افتخار کا ذہن صاف ہو چکا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔ وہ ناہید کا خیال تھا۔ ایک ہی تصور تھا۔ اور وہ ناہید کا تصور تھا۔ ایک ہی جذبہ تھا۔ وہ ناہید کا جذبہ تھا، اس کے صاف و شفاف آئینہ دل پر ناہید کی تصویر تھی جو اُس کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور سامنے

رکھی ہوئی ناہید کی اصلی تصویر بھی گویا کہہ رہی تھی۔

"کیوں جی ۔ تم بے ملے جارہے تھے ۔ اب کیوں نہیں جاتے ؟"

اب شام ہو چکی تھی۔ فوجیوں کی آگرہ میں یہ آخری رات تھی وہ شہر سے کچھ دُور باغ گلفشاں کے سامنے خیمہ زن تھے اور صبح کو یہ لشکرِ گراں اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے والا تھا۔

آج شہنشاہ ہمایوں بھی محل چھوڑ کر خیمے میں آگئے تھے۔ اور ان کی وجہ سے سارے امراء، وزراء، سپاہی وغیرہ سب اپنے اپنے گھروں سے الوداع ہو کر خیموں میں فروکش ہو گئے تھے۔ ہر شخص فوجی تیاریوں میں مشغول تھا۔ لیکن افتخار مرزا ایک کرب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کے برابر کے کمرے میں صفدر خاں سامان وغیرہ مرتب کرنے میں مشغول تھے۔ افتخار مرزا اپنے کمرے میں امید و بیم کے عالم میں ٹہل رہا تھا اُس نے ابھی ابھی فیصلہ کیا کہ وہ ناہید سے ضرور ملے گا اور ابھی وہ شہر واپس جانے کے لیے پَر تول ہی رہا تھا کہ شاہی ہرکارہ خیمہ میں داخل ہوا۔

شاہی ہرکارہ : حضور کے نام کچھ پیغام ہے۔

افتخار مرزا : اچھا کہو۔

شاہی ہرکارہ : حضرت ظلِّ سبحانی کا حکم ہے کہ تمام امراء، وزراء، مشائخ، عہدہ داران آج رات کا کھانا ۸ بجے شب شاہی دسترخوان پر نوش کریں گے اس کے بعد جنگ کی مشاورتی کونسل ہوگی۔ حضور کو بھی ظلِ سبحانی نے یاد کیا ہے۔

افتخار مرزا : اور کچھ کہنا ہے۔

شاہی ہرکارہ : جی نہیں۔

افتخار مرزا : اچھا تم جا سکتے ہو۔

شاہی قاصد کے جاتے ہی افتخار پھر ایک مرتبہ عالم یاس میں ڈوب گیا۔ ظلِ سبحانی کے ساتھ دسترخوان شاہی پر ماحضر تناول کرنا، مشاورتی کمیٹی کی شرکت شہنشاہ مکرم سے تخلیہ میں گفتگو، کیا اس کے بعد مجھے یہ موقع مل سکے گا کہ میں اپنی ناہید کا دیدار کر سکوں۔ یا اللہ تو مجھ پر رحم کر یہ میرا دل کیوں خود بخود ڈوبا جا رہا ہے۔

مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میری ناہید کو مجھ سے جُدا کر رہا ہے۔ اُف۔ کیا مجھے اتنی بھی اجازت نہیں کہ میں اس کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اُف اُس کے شہابی عارض مرجھا گئے ہوں گے۔ افتخار تو بہت ظالم ہے۔ ایک ہی مکان میں رہنے کے باوجود تو ناہید کی دل جوئی نہ کرسکا۔ تونے خود اُس سے ملنے سے احتراز کیا۔ اب تجھ کو اس کا بدلا مل رہا ہے۔ اب اگر تو ملنا بھی چاہے تب بھی نہ مل سکے گا۔ شاہی فرمان کو ٹالا نہیں جا سکتا اور ناہید سے ملے بغیر مجھے کوئی سکون نہیں مل سکتا۔ الٰہی! کس کشمکش میں پھنس گیا ہوں۔

ابھی افتخار مرزا یہی سوچ رہا تھا کہ صفدر خاں خیمے میں داخل ہوئے اور کہا۔

صفدر خاں : بیٹا افتخار تم نے ابھی درباری لباس زیب تن نہیں کیا۔

شاہی دعوت میں جانے کا وقت ہو گیا۔

افتخار مرزا نے نوکروں کو اشارہ کیا۔ نوکروں نے پوشاک لا کر سامنے رکھ دی اور افتخار مرزا نے کپڑے پہنے، پٹکا باندھا۔ سر پہ پگڑی رکھی۔ کمر میں تلوار لگائی اور ہر طرح سے لیس ہو کر شاہی خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے قدم شاہی خیمے کی جانب اُٹھ رہے تھے لیکن اس کا دماغ کسی اور ہی جگہ کی سیر کر رہا تھا۔

کیونکہ شاہی خیمہ وہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہ تھا اس لیے افتخار مرزا اور صفدر خاں پیدل ہی روانہ ہو گئے راستے میں امراء اور دوسرے — عہدہ داروں کے خیمے تھے کیونکہ افتخار مرزا شہنشاہ کے دستِ راست تھے اس لیے راستہ میں جو بھی ملتا وہ افتخار مرزا کو سلام کرتا لیکن آج افتخار مرزا کو ان تمام ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خیمے کے چاروں طرف دور تک سپاہیوں کا پہرہ لگا ہُوا تھا۔ جب افتخار مرزا صفوں کے قریب پہنچے تو سپاہیوں نے ان کو سلامی دی وہ اسی طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔

باغ گلفشاں کے وسط میں ایک انتہائی رنگین اور پر فضا مقام پر شاہی خیمہ نصب تھا۔ یہ خیمہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں سیکڑوں آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ تمام خیمے میں قالین بچھے ہُوئے تھے اور دو رویہ مسندیں لگی ہُوئی تھیں ہر شخص اپنی حیثیت اور منصب کے مطابق بیٹھا ہُوا تھا۔ افتخار مرزا اس مجمع سے گزرتے ہُوئے شاہی مسند کے قریب پہنچ گئے اور شہنشاہ ہمایوں کے بائیں جانب ایک مسند پر بیٹھ گئے۔ تمام خیمہ کافوری شمعوں کی روشنی، زرق

برق لباسوں خوبصورت اور نوجوان چہروں سے جگمگا رہا تھا۔ جھاڑ و فانوس روشن تھے اور خوشبویات نے تمام فضا کو مہکا دیا تھا۔

افتخار مرزا کو ابھی بیٹھے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ کہ ظلِ سبحانی شہنشاہ ہمایوں کی آمد آمد کا غل ہوا۔ ہر شخص مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں شہنشاہ مکرم تشریف لے آئے۔ سب لوگ جہاں پناہ کے استقبال کو سروقد کھڑے ہو گئے۔ شہنشاہ اپنی مسند پر بیٹھے اور ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔

دستر خوان بچھا دیا گیا۔ سیکڑوں آدمی کھانا چُن رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں دستر خوان انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر گیا۔ شہنشاہ نے بسم اللہ کہا اور سب نے کھانا شروع کر دیا۔

افتخار مرزا کو مطلق بھوک نہ تھی۔ وہ مجبوراً دستر خوان پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے یونہی کھانے کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ شہنشاہ ہمایوں کی نظر افتخار مرزا پر پڑی انھوں نے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار مرزا تم کچھ افسردہ اور غمگین نظر آتے ہو — یہاں تک کہ تم کھانا بھی نہیں کھا رہے۔

افتخار مرزا : نہیں عالم پناہ۔ آپ کے خادم خاص کو بھلا کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ اور غم کی گھٹائیں کاشانۂ ہمایونی تک کیونکر پہنچ سکتی ہیں۔ میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اس لیے کھانے کی خواہش نہیں۔

شہنشاہ ہمایوں : ہم شاہی طبیب کو طلب کرتے ہیں۔

افتخار مرزا : نہیں عالم پناہ میں اتنا بیمار نہیں۔ تھوڑی دیر میں میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں تم نے ہم کو یہ نہ بتایا کہ افتخار مرزا کی طبیعت ناساز ہے۔

بیرم خاں : جہاں پناہ، افتخار مرزا ایک ایسے مرض میں گرفتار ہو گئے ہیں جس کی دوا کسی طبیب کے پاس نہیں۔ بلکہ دوا کرنے سے مرض میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : (مسکراتے ہوئے) ہم سمجھے۔ بیرم خاں وہ کون رہزن عقل و ہوش ہے جس نے ہمارے سپاہی کے سینے کو تیر مژگاں سے چھلنی کر دیا۔

بیرم خاں : ظل سبحانی۔ جنگ سے مظفر و منصور واپس آنے پر ہی میں یہ تمام واقعہ حضور کے گوش گزار کروں گا۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار تم کو یہ مہلک مرض کس طرح لگ گیا۔

افتخار مرزا : ظل سبحانی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : اچھا۔ تو پھر ہم کبھی فرصت میں تم سے یہ دلچسپ حکایت سنیں گے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمھارے درد کا درمان تلاش کیا جائے گا۔

افتخار مرزا : ظل سبحانی خادم حضور کے اس لطف خاص کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں کی اس گفتگو سے افتخار مرزا کے چہرے پر بحالی آ گئی۔ اس

کا زرد چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور وہ اُن دنوں کی یاد میں کھو گیا جب ناہید اُس کی ہو جائے گی۔

کھانا ختم ہُوا اور لوگ فارغ ہو کر اطمینان سے اپنے اپنے مقامات پر بیٹھ گئے۔ شہنشاہ ہمایوں نے سب سے پہلے لوگوں کو اس فوج کشی کا سبب بتایا۔ انھوں نے کہا کہ سلطان بہادر والی گجرات روز بروز اپنی طاقت بڑھا رہا ہے اور اُس نے گرد و نواح کا بہت سا علاقہ جو پہلے سلطنت مغلیہ میں شامل تھا۔ اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا ہے۔ اب اس کو اپنی قوت پر بہت ناز ہے اور وہ اس تمام علاقہ کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اس لیے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس فتنہ کا سر شروع ہی میں کچل دیا جائے تو بہتر ہے۔

شہنشاہ ہمایوں کی تقریر کے بعد بیرم خاں نے ایک بڑی مدلل تقریر کی۔ اُنھوں نے گجرات کی گزشتہ تاریخ پر روشنی ڈالی۔ وہاں کے لوگوں کا ذکر کیا وہاں کی زمینوں کی زرخیزی کا تذکرہ کیا اور وہاں کے بے پناہ مال و دولت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ شاہی فوج کو کس راستہ سے بڑھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں کیا کیا احتیاطی تدابیر ممکن ہیں۔ اس کے بعد بہت سے دوسرے افسروں اور قلعہ داروں نے گجرات کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ آخر میں بیرم خاں نے کہا۔

بیرم خاں : اس وقت سلطان بہادر گجراتی چتوڑ کے راجہ سے برسرِپیکار ہے۔ اس کی فوجیں چتوڑ کا محاصرہ کیے ہُوئے پڑی ہیں۔ اس لیے میری ناقص رائے میں ہم کو چتوڑ سے کچھ فاصلے پر اپنی فوجیں لے کر پہنچ جانا چاہیے۔

اور اس کو اطاعت پر مجبور کر دینا چاہیے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اسے راستہ میں گھیر کر شکست دینا چاہیے۔ اور اگر اسے چتوڑ ہی میں شکست ہوگئی تو پھر گجرات پر قبضہ کر لینا بہت آسان ہو جائے گا!

تردی بیگ: مجھے بیرم خاں کی تجویز سے پورا پورا اتفاق ہے۔

ہندو بیگ: میں بھی بیرم خاں کی رائے سے متفق ہوں۔

دوسرے امراء: ہم سب اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں: ہم بیرم خاں کی اس تجویز سے بے حد خوش ہوئے لیکن اس میں صرف ایک بات کی وضاحت نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم کو کس مقام پر پہنچ کر سلطان بہادر کا انتظار کرنا چاہیے۔

بیرم خاں: میرے خیال میں "تلوڑ" اس سلسلہ میں بہترین مقام ہے۔ یہ جگہ چتوڑ اور گجرات کے وسط میں واقع ہے۔ اس جگہ کی آب وہوا خوش گوار اور سلسلہ رسل و رسائل بہتر ہے اس لیے اگر ہم تلوڑ میں قیام کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ تمام امراء نے اس کی تائید کی شہنشاہ ہمایوں نے اس مہم کی کامیابی کے لیے دُعا کی۔ اور مغلیہ سپاہیوں کی ننگی تلواروں کے سایہ میں اپنے خیمے میں چلے گئے۔

اب دربار برخاست ہو چکا تھا۔ اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ سے اٹھا اور خیمے کے باہر چلا گیا۔

افتخار مرزا اپنے خیمے میں آیا نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا

کہ ناہید سے ملنے کے لیے اس کے پاس صرف چند گھنٹے رہ گئے ہیں اس لیے اُس نے جلدی جلدی درباری لباس اتارا اور سادہ کپڑے پہن کر رات کی تنہائیوں میں گھوڑے پر بیٹھ کر شہر کی جانب روانہ ہوگیا۔

باب ۱۱

وہ کوئی جارہا ہے شبِ غم گزار کے

دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ آہوں کا بازار گرم تھا۔ جب افتخار مرزا اپنی حالت پر قابو پا کر ناہید کو تسلی و تشفی دینے کی کوشش کرتے تو ناہید مجسم غم بن جاتی اور سیلابِ اشک اُس کی آنکھوں سے بہنے لگتا۔ اور جب ناہید کی طبیعت کچھ ہلکی ہوتی اور وہ افتخار مرزا کو الوداعی نظروں سے دیکھتی تو افتخار مرزا کی آنکھیں بہنے لگتیں۔ دونوں رنج والم کی تصویریں بنے ہوئے تھے۔ دونوں تہیۂ طوفان کیے ہوئے تھے۔ دونوں بسمل تھے۔ دونوں بے چین تھے۔ دونوں کے سامنے جدائی کی گھڑی آگئی تھی۔ افتخار مرزا حیران تھا کہ زندگی میں اُس نے یہ خوبصورت موتی اتنی دریا دلی سے کبھی نہیں لٹائے تھے۔ ادھر ناہید پریشان تھی کہ آج ہر بات پر رونا کیوں آرہا ہے۔ آج یہ دل کیوں اُمنڈا آرہا ہے۔ میں نے بڑی سے بڑی مصیبت کو تنہائی کو، مفلسی کو پریشانی کو برداشت کر لیا۔ لیکن میں نے کبھی اپنی کشتیٔ دل کو تہِ آب ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کبھی میری یہ کیفیت نہ ہوئی۔ پھر یہ آج کیا بات ہے طرح طرح کے وسوسے اس کے نازک دل و

دماغ میں بن بُلائے مہمانوں کی طرح چلے آرہے تھے۔ دونوں بیقرار تھے۔ دونوں کی پلکوں پر ستارے رقص کر رہے تھے۔ آخر ناہید نے افتخار مرزا سے سوال کیا۔

ناہید : افتخار مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی مجھے تم سے زبردستی جُدا کر رہا ہے۔ اور یہ میری اور تمھاری آخری ملاقات ہے۔

افتخار مرزا : ناہید خدا کے لیے ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ تمھارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور تم کو کوئی طاقت مجھ سے جُدا نہیں کر سکتی۔ میں لڑائی سے جلد واپس آکر اُپنی ناہید کو ہمیشہ کے لیے اپنے گوشۂ دل میں سجا لوں گا۔

ناہید : افتخار۔ مجھے ان لڑائیوں سے سخت نفرت ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان۔ انسان کے کیوں درپئے آزار ہے۔ یہ معاشرہ سب انسانوں کو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتا۔ یہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے پاؤں کے نیچے روند کر کیوں خاموش ہوتا ہے۔ اس تہذیبؔ تمدن اور خصوصاً مغلیہ تہذیب نے ہم کو کیا دیا۔ ہاں کچھ چنگیز اور کچھ ہلاکو پیدا ہوتے۔ جنھوں نے انسانی تہذیب کے بڑے سے بڑے مینارۂ عظمت کو ڈھا دیا۔ انسانی بلندیوں کو خاک میں ملا دیا۔ کیا یہی ذہن انسانی کا نکتۂ عروج ہے۔ حسد، بغض، لالچ، ملک گیری، دل آزاری، یہی وہ نعمتیں ہیں جن سے ہم نے اپنے دامن انسانیت کو داغ دار کر لیا ہے۔ آؤ افتخار۔ اس سپاہیانہ لباس کو پھاڑ کر پھینک دیں۔ اس کی جگہ

محبت و اخوت کا لباس زیب تن کریں۔ اس نوکری کو چھوڑ دو۔ اس کی جگہ کوئی ایسا کام کریں جس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے۔ چلو اس قتل و غارت گری کی دُنیا سے۔ اس خود غرض دنیا سے۔ اس ظالم دنیا سے۔ اس وفا نا آشنا دنیا سے جہاں وہ خوبصورت دلوں کو ملنے کی بھی اجازت نہیں۔ کہیں دُور چلے جائیں۔ کسی ایسی جگہ چل کر رہیں جہاں اس قسم کے ہنگامے نہ ہوں، جہاں امن و سکون ہو۔ جہاں محبت و پیار کا دور دورہ ہو۔ جہاں انسانیت اور شرافت کا خطبہ اور سکہ جاری ہو۔ جہاں دو محبت کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ نہ کیا جائے جہاں حُسن اپنی تابانیاں اور عشق حشر سامانیاں دیکھ سکے۔ جہاں کلیوں کے مسکرانے کی اجازت ہو۔ جہاں مسرت و شادمانی کے لیے دوسروں کی خوشنودی اور خوشامد کی ضرورت نہ پڑے۔ جہاں آزادی ہی آزادی ہو۔ محبت ہی محبت ہو خلوص ہی خلوص ہو۔ افتخار، اس محل اور اس کی آرائشوں کو چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلو افتخار تمہارے بغیر یہ محل، یہ شیشہ آلات، یہ خوشنما باغات اور یہ سب سامان بیکار ہے۔

افتخار مرزا : ناہید تم نے میرے جذبات اور احساسات کو خوبصورت ترین الفاظ میں پیش کیا۔ پیاری آزردہ نہ ہو۔ ہم آج کے معاشرہ میں جنگ و جدال سے بچ نہیں سکتے۔ اگر ہم کسی دوسرے پر فوج کشی کریں گے تو کوئی دوسرا ہم پر لشکر کشی کر کے ہم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ اس لیے یہ لڑائیاں، انسان اپنی بقا اور تحفظ کے لیے لڑتا ہے۔ میدانِ جنگ سپاہی کا گھر ہوتا ہے۔ عزت کی موت، ذلت کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اس دُنیا میں صرف انھیں لوگوں کو رہنے کا حق حاصل ہے جو اپنے آپ کو اس دُنیا میں رہنے کا اہل ثابت کرتے ہیں۔ ورنہ یہ بے رحم دُنیا اس کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔

ذرا اس نظامِ کائنات پر ایک نظر ڈال کر دیکھو۔ ہر چھوٹا پرندہ بڑے پرندے کی غذا بن جاتا ہے۔ ہر بڑا جانور چھوٹے جانور کو لقمۂ اجل بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس ہمارے نظام میں بھی وہ معزز و ممتاز ہے جس کی کمر میں تلوار، تلوار میں کاٹ اور جسم میں طاقت ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تلوار کمر سے کھول کر، اپنی شجاعت۔ نجابت اور خاندانی عظمت کا تذکرہ کرے تو لوگ اس کو بزدل۔ کم ہمت اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اور وہ نہ صرف سوسائٹی کی نگاہ سے گر جاتی ہے۔ بلکہ اپنی نظر میں خود بھی رسوا اور ذلیل ہو جاتا ہے۔ ناہید آج کے معاشرہ میں کوئی بغیر دادِ شجاعت دیے اور سر سے کفن باندھے۔ ایک عزت دار اور خود دار زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ناہید میں یا بیرم خاں شہنشاہ ہمایوں کے مقرب خاص ہیں کہ ہم دونوں نے فانوس کی طرح اس "چراغ مغلیہ" کی حفاظت کی۔ ہم نے ہمیشہ اپنے آپ کو شہزادے کی خاطر بڑی سے بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ جب کبھی شہزادے پر کوئی مصیبت آئی تو ہم اس کی سپر بن گئے۔ اس لیے مجھے میدانِ جنگ سے جانے سے نہ روکو۔ اور میرا انتظار کرو۔

ناہید : افتخار جاؤ۔ میں تمھاری شجاعت اور مردانگی کو اپنی خاطر داغ دار کرنا نہیں چاہتی لیکن افتخار مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلو۔ میں خیمے سے لڑائی

کا منظر دیکھتی رہوں گی۔

افتخار مرزا : ناہید یہ بھی ممکن نہیں۔ وعدہ کرو میرا انتظار کرو گی۔

ناہید : ایک پابند قفس اگر انتظار نہ کرے گا تو پھر اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

افتخار مرزا : ناہید۔ تم کو میں ایک دلچسپ بات سنانا بھول گیا۔

ناہید : ایسے عالم میں کوئی دلچسپ بات بھی ہو سکتی ہے۔

افتخار مرزا : ہاں۔ وہ جو کسی کا شعر ہے۔

می تواں عشق بتاں داشت زمردم لیکن

زردی رنگ ورخ و خشکی لب راچہ علاج

بالکل یہی حال میرا ہُوا۔ میرے چہرے سے میرے دوستوں نے میری بیماری دل کا پتہ چلا لیا اور بیرم خاں نے مجھے اس رنگین داستانِ عشق دہرانے پر مجبور کر دیا۔ بیرم خاں میری پریشانیوں سے اتنے گھبرائے کہ انھوں نے اس کا ذکر شہنشاہِ مکرم سے کر دیا۔ جہاں پناہ نے مجھ سے تمام گفتگو سُننے کے بعد وعدہ کیا ہے کہ لڑائی کے خاتمہ پر وہ خود اس مسئلہ میں دلچسپی لیں گے اور صفدر خاں سے رشتہ طلب کریں گے۔

ناہید : (شرما کر) آپ بڑے وہ ہیں۔ آپ مجھے ساری دُنیا میں بدنام کر رہے ہیں۔ آپ کو بیرم خاں اور شہنشاہ مکرم سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ ابا حضور کی نظر انتخاب کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔

افتخار مرزا : میں جانتا ہوں پھر بھی میں خود یہ تحریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیوں تم کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ناہید : میرے لیے اس میں مسرت ہی مسرت ہے۔ اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

افتخار مرزا : اچھا ناہید۔ اب ہم جلد ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔

ناہید : ہاں۔ دیکھیے وہ گھڑی کب آتی ہے؟

افتخار مرزا : ارے ۲ بج گئے۔ یہ تمام وقت کس قدر جلد گزر گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ تم سے جُدا ہونے کے بعد یہی وقت کس طرح گزرے گا۔ اچھا ناہید۔ ایک سفر نصیب کو رخصت کرو۔ دیکھو دامن صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

ناہید : آنسو پونچھتے ہوئے ایک بلا نصیب سوائے صبر و ضبط کے اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

افتخار مرزا : اچھا ناہید۔ اپنے افتخار کا الوداعی سلام قبول کرو۔

ناہید : بہ سفر رفتنت مبارک باد

بہ سلامت روی و باز آئی

افتخار مرزا : انشاء اللہ بہ قیدِ حیات۔ میں جلد اور بہت جلد آؤں گا۔ ناہید جب تک ہو سکے سلسلہ خط و کتابت جاری رکھنا۔ اچھا ناہید دکھڑا ہو جاتا ہے، دل تو یہی چاہتا ہے کہ ناہید تمھاری زلفوں کے سایہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں۔ تمھارے رُخِ روشن کی تابناکیوں سے اس دل کو بہلاتا رہوں۔ اور در حسن پر اسی طرح سر خم کیے رہوں۔ اور اسی طرح دیارِ حسن میں عشق کا چراغ روشن رکھوں۔ لیکن ناہید فرض نے میرے پاؤں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ میں جا رہا ہوں لیکن میرا دل تمھارے پاس ہے۔

میری روح تم ہو۔ تمھارے بغیر میں ایک پل کے لیے بھی آرام نہیں کر سکتا۔ اچھا پیاری ناہید۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو بوسہ دیتا ہے اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔

ناہید: افتخار مرزا، میں تم کو خدا کے حوالے کرتی ہوں۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

افتخار نے الوداعی نظر ناہید پر ڈالی اور کمرے سے چلا۔ لیکن وہ مڑ مڑ کر ناہید کو دیکھتا رہا۔ وہ بمشکل تمام گھوڑے پر بیٹھا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ جب تک وہ نظر آتا رہا ناہید ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھتی رہی۔ گویا وہ اس شعر کی تصویر کشی کر رہی تھی۔ ؎

کر کے رخصت اُن کو تا حدِّ نظر دیکھا کیے
جس طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُدھر دیکھا کیے

جب افتخار حدِ نظر سے آگے گیا تو ناہید پلنگ پر گر پڑی۔ آنسو اُس کی تنہائی پر بیقرار ہو کر اُس کی اعانت کے لیے آتے۔ اور اُس کی پلکوں پر رقص کرنے لگے۔

باب ۱۲

شہنشاہ ہمایوں کی بہار اور بنگال پر فوج کشی

شہنشاہ ہمایوں کی فوج تلور میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ ہزاروں سپاہی اپنے محبوب شہنشاہ ہمایوں کے چشم و ابرو پر اپنی زندگی کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ شاہی فوجیں ایک قدرتی محفوظ مقام پر خیمہ زن ہیں۔ اس کی پشت پر پہاڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے اور سامنے دریا بہہ رہا ہے۔

کیونکہ ابھی جنگ کا آغاز نہیں ہُوا ہے۔ اس لیے ہر سپاہی کے چہرہ پر طمانیت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اُن کی باتیں زیادہ طویل اور اُن کی دلچسپیاں زیادہ بڑھی ہُوئی ہیں۔ وہ شاہی بازار میں خرید و فروخت میں مشغول نظر آتے ہیں۔ کچھ فوجی شطرنج سے اپنا دل بہلا رہے ہیں۔ کچھ شکار کے لیے اِدھر اُدھر جنگلوں میں پھیل گئے ہیں۔ اور کچھ شعر و شاعری۔ موسیقی اور دوسری چیزوں سے اپنا دل بہلا رہے ہیں۔

امراء کی بزم آراستہ ہے۔ اور خیام و حافظ کے اشعار میں ڈھلی ہُوئی شراب، کسی صراحی دار گردن سے نکل نکل کر تمام بزم کو رنگین اور بے خود بنائے ہُوتے ہے۔

بیرم خاں بھی اسی قسم کی ایک بزم سجائے ہوئے تھے کہ شاہی قاصد شہنشاہ ہمایوں کا پیغام لے کر پہنچ گیا۔

بیرم خاں فوراً کھڑے ہوگئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی سارے مصاحبین بھی کھڑے ہوگئے۔ بیرم خاں شاہی خیمہ کی طرف روانہ ہوئے اور تمام مصاحبین اُن کو خیمے تک چھوڑنے کے لیے آئے۔

بیرم خاں نے دیکھا کہ شہنشاہ مکرم کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے جس کو وہ بغور دیکھ رہے ہیں اُن کے چہرہ سے فکر کے آثار پائے جاتے ہیں۔

بیرم خاں نے جھک کر سلام کیا۔ لیکن شہنشاہ نے اپنی محویت میں آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بیرم خاں پاسِ ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

بڑی دیر کے بعد شہنشاہ کی نظر بیرم خاں پر پڑی۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں۔ تم کب سے اس حالتِ رکوع میں کھڑے ہو۔

بیرم خاں : ظلِ سبحانی کسی فکر میں اُلجھے ہوئے تھے۔ میں ظلِ سبحانی کے تسلسلِ خیالات کو توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جب سے حضور نے طلب کیا ہے۔ اسی طرح کھڑا ہوا ہوں۔

شہنشاہ : بیرم خاں تم نے ہم کو اپنی شرافت، تہذیب و وفاداری سے اپنا اسیر بنا لیا ہے۔

بیرم خاں : جہاں پناہ۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا اسی دربار سے حاصل کیا اور میں جب تک زندہ ہوں اپنی وضع داری پر قائم رہوں

گا۔ دنیا کی نظریں میں کچھ بھی سہی۔ لیکن آپ کی نگاہ میں وہی ذرہ ہوں جس کو آپ نے تابانی بخش کر آفتاب بنا دیا۔ میں وہی بیرم خاں ہوں جو آج سے دس سال پہلے جہاں پناہ کے قدموں میں پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ مجھے جو مرتبہ جو بزرگی، جو مقام، جو منصب حاصل ہوئے وہ سب حضور کی چشم کرم کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کا بار بار اعتراف نہ کرنا کفر ہے۔ اپنے محسن کے کام نہ آنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور محسن بھی ایسا محسن جس نے دنیا کی ہر نعمت۔ ہر بزرگی، ہر عزت، میری آغوش میں ڈال دی۔ ایسے شخص کا شکریہ ادا نہ کرنا۔ کتنا بڑا کفران نعمت ہے۔

شہنشاہ : بیرم خاں، جب ایام شہزادگی میں سب سے پہلے تم ہمارے سامنے پیش کیے گئے تو ہم تمھاری سُریلی آواز تمھارے خوبصورت انداز بیان اور خصوصاً تمھارے اخلاق عادات، اور آداب مجلس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم وہ واقعہ شاید کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

جب ہم نے تم کو طلب کیا اور تم نے دیکھا کہ غنودگی نے ہم کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ تم اسی طرح خدا معلوم کب تک کھڑے رہے، اور جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے اس طرح تم کو مؤدب کھڑے ہوئے دیکھا۔ اچھا خیر ان باتوں کو جانے دو اس وقت ہم نے ایک اہم مسئلہ میں مشورہ لینے کے لیے تمھیں یاد کیا تھا۔

بیرم خاں : جہاں پناہ: فرمائیے وہ کیا مسئلہ ہے ؟

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں ہم تمھاری ذہانت کے قائل ہو گئے۔ دیکھو

سلطان بہادر گجراتی نے ہسم کو یہ خط بھیجا ہے شہنشاہ ہمایوں نے خط بیرم خاں کے ہاتھ میں دے دیا۔ بیرم خاں نے بڑے غور سے خط پڑھنا شروع کیا۔

خط

شہنشاہ گیتی پناہ نصیر الدین محمد ہمایوں کو بعد دعائے درازی اقبال کے واضح ہو کہ سلطان بہادر گجراتی، ان کا غلام خانہ زاد ہے۔ وہ اتنا گستاخ نہیں کہ کوئی ایسی حرکت کرے جو مزاج ہمایونی پر گراں گزرے سلطان بہادر سلطنت مغلیہ کا وفادار ہے اور اس وقت چتوڑ کے راجہ سے برسر پیکار ہے اس نے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا ہے اور اس کو اس محاصرہ میں کامیابی کی پوری پوری اُمید ہے۔ یہ نمک خوار حکومت مغلیہ بارگاہ ہمایونی میں درخواست کرتا ہے کہ شہنشاہ مکرم ان نازک حالات میں اس پر فوج کشی نہ کریں۔ اور اس ناچیز کو اتنی مہلت دیں کہ وہ قلعہ چتوڑ کو فتح کر کے حضور کے قدموں میں حاضر ہو کر اپنی خطاؤں کو معاف کرا سکے؛

منجانب، سلطان بہادر گجراتی

(مہر)

شہنشاہ ہمایوں: بیرم خاں تم نے اس تحریر سے کیا اندازہ لگایا۔

بیرم خاں: جہاں پناہ۔ سلطان بہادر ان خوشامدانہ باتوں سے حضور سے مہلت کا طلب گار ہے۔

شہنشاہ ہمایوں: پھر تمھارا کیا خیال ہے؟

بیرم خاں: میں بارگاہ ہمایوں میں صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ سلطان بہادر گجراتی اور راجہ چتوڑ دونوں سلطنت مغلیہ کے بدخواہ ہیں ہم کو ان دونوں کی جنگ کا خاموشی سے مشاہدہ کرنا چاہیے۔ ان دونوں میں جو کامیاب ہوگا۔ اس کے متعلق فیصلہ کر لیا جائے گا۔

شہنشاہ ہمایوں: تم نے نہایت اچھی رائے دی۔ ہم یہی کریں گے۔ اچھا ہم کو سلطان بہادر کو کیا جواب دینا چاہیے۔

بیرم خاں: یہی کہ جہاں پناہ، تمھاری اس تحریر سے بہت خوش ہوئے۔ جب تم چتوڑ کے راجہ سے برسر پیکار ہو وہ تم پر لشکر کشی نہ کریں گے اور تور میں تمھاری آمد کے منتظر رہیں گے۔

شہنشاہ ہمایوں: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کو ضابطہ تحریر میں لے آؤ۔

بیرم خاں نے فوراً اس مضمون کا خط سلطان بہادر گجراتی کو لکھا۔ پھر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ شہنشاہ نے اس پر اپنی مہر ثبت کی اور قاصد کے حوالے کر دیا۔

شہنشاہ ہمایوں: دیکھیے یہ قلعہ کب تک فتح ہوتا ہے۔

بیرم خاں: جہاں تک میری اطلاعات کا تعلق ہے قلعہ آج شام تک

فتح ہو جانا چاہیے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک قاصد آیا اُس نے زمین بوس ہوکر سلام کیا اور کہا۔

قاصد : قلعہ چتوڑ کی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ قلعہ کی غربی دیوار گر گئی ہے۔ اور سلطان بہادر کی فوجیں قلعہ میں داخل ہو چکی ہیں اور راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ چکا ہے۔

بیرم خاں : شہنشاہ مکرم۔ آپ کو قلعہ چتوڑ کی لڑائی کا اختتام مبارک ہو۔ ایک دشمن اپنی موت مر چکا۔ دیکھیے دوسرا دشمن اب کدھر کا رُخ کرتا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : کیا تمھارے خیال میں سلطان بہادر گجراتی بڑا مغرور انسان ہے۔ وہ پہلے بھی شاید نہیں آیا تھا۔ لیکن اب چتوڑ جیسے مضبوط قلعہ پر قبضہ اس کے کاسۂ سر کو نخوت و غرور سے بھر دے گا اور وہ شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے گریز کرے گا۔ اس کے گزشتہ طرزِ عمل اور موجودہ تحریر سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بہت سے امراء اور دوسرے لوگ شہنشاہ کے سلام کے لیے آ گئے۔ بیرم خاں سلام کر کے شاہی خیمے سے نکلے اور افتخار مرزا کے خیمے کا رُخ کیا۔

بیرم خاں کو افتخار مرزا کے سپاہیوں اور نوکروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی طبعیت خراب ہے۔ اس لیے وہ افتخار مرزا کی مزاج پُرسی کے لیے جا رہے تھے۔ انھوں نے قصداً مصاحبین اور ملازمین کی فوج کو رخصت کر دیا اور تنہا افتخار مرزا کے خیمے میں داخل ہو گئے۔

افتخار مرزا اپنے پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اُس کا جسم گرم تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ گزشتہ رات اُن کے آقا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بیرم خاں افتخار کے سرہانے بیٹھ گئے۔ اور اُس کا شانہ ہلایا۔

افتخار مرزا نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا کہ بیرم خاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر بیرم خاں نے اُس کو روک دیا اور پوچھا۔

بیرم خاں : افتخار۔ اب طبیعت کیسی ہے؟

افتخار مرزا : اچھا ہوں۔

بیرم خاں : مگر تمہارا جسم تو آگ ہو رہا ہے۔ تم کو بخار معلوم ہوتا ہے۔ تم نے طبیب کو نبض دکھائی۔

افتخار مرزا : نہیں میں بالکل اچھا ہوں۔ آپ مطلق فکر نہ کریں۔

بیرم خاں : اگر میں فکر نہ کروں تو پھر اور کون فکر کرے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا چست انسان پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ افتخار میں جانتا ہوں۔ یہ سب محبت اور فراقِ محبوب کا کرشمہ ہے۔

افتخار مرزا کی آنکھیں اس پُرخلوص اور ہمدردانہ گفتگو سے پُرآب ہو گئیں۔ اُس نے بڑی حسرت سے افتخار مرزا کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

بیرم خاں : افتخار جی کو سنبھالو۔ اُٹھو منہ ہاتھ دھو اور سیر تفریح سے اپنا دل بہلاؤ۔ تم مرد ہو کر عنانِ ہمت کو اپنے ہاتھ سے چھوڑے دے رہے ہو۔ تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہاری جُدائی سے ناہید کے غریب دل

پر کیا صدمے گزرتے ہوں گے۔ لیکن قدرت نے اس معاملہ میں عورت کو زیادہ متحمل بنایا ہے۔ وہ کڑی سے کڑی مصیبت جھیل لیتی ہے اور زبان سے اُف تک نہیں کرتی۔ اگر یہی لیل و نہار رہا تو میں کس طرح شہنشاہ مکرم سے تمھاری سفارش کر سکوں گا۔

بیرم خاں کے بہت کچھ اصرار پر افتخار مرزا نے منہ ہاتھ دھویا کچھ ہلکا سا ناشتہ کیا اور دونوں بیٹھ کر حالات حاضرہ پر گفتگو کرنے لگے۔

بیرم خاں: کیا تم کو معلوم ہُوا کہ رانا چتوڑ بھاگ گیا ہے اور قلعہ پر شام تک سلطان بہادر کا قبضہ ہو جائے گا۔

افتخار مرزا: اچھا۔ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔

بیرم خاں: ایک دوسری اس سے بھی اہم خبر سنو۔

افتخار مرزا: ضرور سنائیے!

بیرم خاں: سلطان احمد گجراتی کا ایک خط شہنشاہ مکرم کے پاس آیا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ قلعہ چتوڑ کی مہم سر کرنے کے بعد شہنشاہ کی خدمت عالی میں حاضر ہو جائے گا۔

افتخار مرزا: اچھا۔ اور آپ اس تحریر کی صداقت پر ایمان لے آئے۔

بیرم خاں: ہاں تمھارا کیا خیال ہے؟

افتخار مرزا: میرے خیال میں یہ صرف سلطان احمد گجراتی کی ایک شاطرانہ چال ہے کہ شہنشاہ ہمایوں تلور ہی میں اس کی آمد کے منتظر رہیں اور وہ کہیں اور نکل جائے۔ یا خود قلعہ چتوڑ میں بند ہو جائے۔

بیرم خاں : میں تمھاری رائے کی پُر زور تائید کرتا ہوں اور یہی بات میں نے نہایت واضح طریقہ پر شہنشاہ ہمایوں کے گوش گزار کر دی۔

افتخار مرزا : پھر ظلِ سبحانی نے کیا کہا۔

بیرم خاں : جہاں پناہ نے کہا کہ اب ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ اس کی آمد کا تلور میں انتظار کریں گے۔ اس لیے اُس کی نیّت کا حال جانتے ہوئے بھی ہم اس کو ایک موقع اور دیں گے اور اپنے وعدہ کو پُورا کریں گے۔ اگر سلطان نے تلور کے علاوہ کسی اور طرف کا رُخ کیا تو ہم اس پر فوج کشی کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

افتخار مرزا : میرے خیال میں مناسب یہی تھا کہ قلعہ کے فتح ہوتے ہی اس کو نرغہ میں لے لیا جاتا اور اس کو اطاعت یا جنگ پر مجبور کر دیا جاتا۔ اگر اب وہ ہاتھ سے نکل گیا تو ہم کو اپنے علاقہ میں جا کر بے حد پریشان کرے گا۔

بیرم خاں : میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر ظلِ سبحانی راضی نہ ہوئے۔

افتخار مرزا : خیر یہی خدا کا شکر ہے کہ قلعہ چتوڑ کا قضیہ ختم ہو گیا اب ہم کو یہاں زیادہ عرصہ تک بلا مقصد نہیں رہنا پڑے گا۔

بیرم خاں : ہاں اب دو چار دن میں کوئی فیصلہ کن بات ہو جائے گی۔ اچھا، وہ آپ کے ہونے والے خسر۔ یعنی صفدر خاں علیہ الرحمۃ کہاں ہیں۔

افتخار مرزا : (ہنستے ہوئے) وہ برابر کے خیمہ میں ہیں۔ اگر کوئی کام ہو تو بُلاؤں۔

بیرم خاں : ہاں بھئی اُن سے بڑے بڑے کام لینا ہیں اُن کو ضرور بُلاؤ۔

افتخار نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ صفدر خاں کو بلا لائے تھوڑی دیر میں صفدر خاں خیمے میں داخل ہوئے انھوں نے آتے ہی افتخار مرزا کی مزاج پُرسی کی اور بیرم خاں کی تعظیم بجا لائے۔

بیرم خاں : کہیے خاں صاحب کیسے مزاج ہیں ؟

صفدر خاں : میں تو خدا کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں۔ لیکن یہ مرزا صاحب کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ کچھ کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ کھانا بھی بہت کم کھاتے ہیں۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ کبھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ہزاروں مرتبہ پوچھا کہ اس پریشانی اور اُلجھن کا سبب کیا ہے۔ لیکن وہ کبھی کچھ نہیں بتاتے آپ ان کے دوست ہیں۔ آپ خدا کے لیے مجھے یہ بتائیے کہ اُن کا چہرہ زرد کیوں رہتا ہے۔ وہ پریشان اور اس عالم محویت میں کیوں رہتے ہیں۔ وہ کون سی فکر ہے جو ان کو لاحق ہوگئی ہے۔ وہ کون سا صدمہ ہے جس نے ان کو گھلا دیا ہے۔ اگر میں جان دے کر بھی افتخار کے کام آسکوں تو یہ میرے لیے انتہائی مسرت کی بات ہوگی۔

بیرم خاں : آپ کو افتخار مرزا سے واقعی بہت محبت ہے۔

صفدر خاں : کیوں نہ ہو۔ انھوں نے اپنے اخلاق، شرافت، انسانیت ہمدردی اور احسانات سے مجھے اپنا بندۂ بے دام بنا رکھا ہے۔ میں ایک پٹھان ہوں اور وہ پٹھان جس نے تمام عمر مغلوں سے نفرت کی لیکن اس

شخص نے میری فطرت کو بدل دیا۔ میرے خیالات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ اب میں مغلوں کی صف میں شامل ہوں اور اُن پر اپنی زندگی قربان کر رہا ہوں۔

بیرم خاں : صفدر خاں آپ بہت بلند انسان ہیں۔ آپ بڑے صاف گو بیباک اور اچھے آدمی ہیں۔ افتخار مرزا نے افغانوں کی صف سے جس لعل کو منتخب کیا وہ بے بہا ہے۔

صفدر خاں : ہاں تو میں آپ سے افتخار کی بیماری کا سبب معلوم کر رہا تھا۔

بیرم خاں نے ہنستے ہوئے افتخار مرزا پر ایک نظر ڈالی اور کہا یہ خود تو کچھ کہتے نہیں مگر قرائن اور حالات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

صفدر خاں : ارے کیا واقعی ؟ میں ایک سپاہی آدمی ہوں۔ اس لیے یہ سوچ بھی نہ سکا کہ ایک نوجوان کو یہ بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ میں تمام عمر اس مہلک مرض سے الگ رہا۔ مگر یہ تو کوئی مشکل بات نہیں۔ اگر یہ صرف اس لڑکی کا نام و پتہ بتلا دیں تو میں خود بحیثیت باپ کے لڑکی کے والدین سے رشتہ طلب کروں گا۔ اور میرے افتخار میں کوئی ایسی کمی نہیں کہ کوئی اچھے سے اچھا بڑے سے بڑا انسان رشتہ دینے میں پس و پیش کرے۔

افتخار مرزا نے گھور کر بیرم خاں کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی درخواست کی۔

بیرم خاں : بزرگ۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ کہو افتخار اب تو تم مطمئن ہو گئے ؟۔

افتخار مرزا : قبلہ۔ آپ بیرم خاں کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیں ۔ یہ میرے بڑے بے تکلف دوست ہیں اس لیے اس قسم کی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں بالکل اچھا ہوں اور چند دن میں انشاء اللہ تندرست ہو جاؤں گا۔

بیرم خاں : ڈرپوک بزدل کہیں کے ۔ ارے صاف صاف اقرار کیوں نہیں کر لیتے کہ تم کسی کے تیرِ مژہ کے بسمل ہو۔ کیوں خاں صاحب اس بات سے تو آپ بھی متفق ہوں گے کہ یہ بالکل اچھے ہیں اور اچھے ہونے کے بجائے ان کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں ہم ان حضرت کی تشخیص مرض پر عمل نہیں کر سکتے۔

صفدر خاں : جی ہاں۔ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ مجھے تو یہ روز بروز کمزور ہی نظر آ رہے ہیں ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔

بیرم خاں : آپ ان کے بہت کام آ سکتے ہیں۔

صفدر خاں : وہ کیسے ؟

افتخار مرزا کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں بیرم خاں ہر بات صاف صاف صفدر خاں کو نہ بتا دیں۔ بیرم خاں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

بیرم خاں : بات یہ ہے بزرگ کہ یہ بچپن میں ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہو گئے تھے اور آج تک ان کی زندگی میں یہی خلا تھا۔ لیکن آپ نے اس خلا کو بھر دیا۔ جس شخص کو دوبارہ ایسا شفیق بزرگ مل جائے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو جھیل سکتا ہے۔

صفدر خاں: نہیں میں خالی محبت کا قائل نہیں مجھے تو آپ کوئی ایسی تدبیر بتایئے جس سے یہ جلد شفایاب ہو سکیں۔

بیرم خاں: خان صاحب جس مرض میں ہمارا دوست مبتلا ہے وہ لاعلاج ہے۔ مگر اگر آپ کی نظر کرم ہو گئی تو کم ضرور ہو جائے گا۔ میں جنگ کے خاتمہ پر آپ سے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کروں گا۔ ممکن ہے مجھے آپ سے کسی قیمتی شے کا سوال کرنا پڑے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ افتخار مرزا کے لیے قیمتی سے قیمتی شے کو قربان کر سکتے ہیں۔

صفدر خاں: آپ دونوں کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ میں ایک سپاہی اور پھر پٹھان ہوں۔ جب تک کوئی بات مجھ سے صاف الفاظ میں نہ کی جائے میں اس کو سمجھ نہیں سکتا۔

بیرم خاں: عنقریب یہ سب باتیں اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آجائیں گی۔

بیرم خاں اور افتخار مرزا، صفدر خاں کے ساتھ شکار کو چلے گئے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ لیکن نہ تو سلطان بہادر گجراتی کا کوئی ایلچی آیا اور نہ ان کے خود تشریف لانے کی کوئی خبر آئی۔

ایک دن علی الصبح تمام شاہی کیمپ میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ سلطان بہادر قلعہ چتوڑ کو اپنے امراء کے حوالے کر کے گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس خبر سے لشکر میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا کیونکہ اس کے

معنی یہ تھے کہ سلطان نے اپنے عہد کو توڑا اور شہنشاہ ہمایوں سے بغاوت اور سرکشی کی۔ اب جلد لشکر سلطان بہادر کو سزا دینے روانہ ہوجائے گا۔ اس خبر کے سنتے ہی شاہی کیمپ میں بڑی رونق آگئی۔ ہر سپاہی اپنے خیمے سے نکل کر ٹولیوں میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کرنے لگے۔ بہت سے لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں خریدنے بازار کی طرف لپکے۔ بہت سے لوگوں نے خیمہ شاہی کا رُخ کیا۔ کچھ لوگ اپنا منتشر اور بکھرا ہُوا سامان ٹھیک کرنے میں مشغول ہوگئے۔ زائد چیزوں کو بکسوں میں بند کرکے خرگاہ میں پہنچا دیا گیا۔ ہر سپاہی جنگ پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ ادھر شاہی امراء وزراء وغیرہ بھی شاہی خیمے کی طرف گام زن نظر آرہے تھے۔

تھوڑی دیر میں خیمہ شاہی مہمانوں سے اور خیمے سے باہر کی تمام جگہ تماشائیوں اور سپاہیوں سے بھر گئی۔ ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیے ان حالات کے پیشِ نظر شہنشاہ ہمایوں کیا فیصلہ کرتے ہیں اور خدا معلوم فوج کا آئندہ اقدام کیا ہوگا۔

سب لوگ خیمہ شاہی میں بیٹھ چکے تھے کہ شہنشاہ ہمایوں تشریف لائے اور رونق آرائے تخت ہُوئے۔ ان کے بیٹھتے ہی تمام دوسرے حضرات بھی حسب منصب اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ شہنشاہ ہمایوں نے مجمع کو خطاب کرتے ہُوئے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : آپ حضرات نے سُن لیا ہوگا کہ سلطان بہادر گجراتی فرار ہوگیا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہماری اطاعت کرنے

اسی مقام پر آئے گا۔ لیکن ادھر آنے کے بجائے اس نے گجرات کا رُخ کیا ہے۔ اس وقت آپ حضرات کو اس لیے جمع کیا گیا ہے کہ آپ ہم کو اپنے زریں مشورے دیں کہ ایسی صورت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے۔

مغل بیگ : جہاں پناہ سلطان بہادر نے کھلی بغاوت کی ہے اس لیے اس کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ ہمیں فوراً اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔

کوک علی : میں مغل بیگ کی تائید کرتا ہوں۔ اس سرکش کا سر فوراً کچل جانا چاہیے۔ اس کو اتنی سخت سزا ملنی چاہیے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔

ٹھٹھہ بیگ : میں بھی مغل بیگ اور کوک علی کی تائید کرتا ہوں۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار مرزا تمھاری کیا رائے ہے؟

افتخار مرزا : جہاں پناہ، میں ان تمام امراء کی تائید کرتا ہوں۔

شہنشاہ ہمایوں : اور بیرم خاں تم؟

بیرم خاں : جہاں پناہ تمام امراء کی یہی رائے ہے۔ اور یہ تمام امرا اپنے اپنے سرداروں اور لشکروں کی رائے پیش کر رہے ہیں۔ ہر سپاہی کی یہی تمنا ہے کہ اس غدار اور دھوکہ باز کو ضرور سزا ملنی چاہیے۔

شہنشاہ ہمایوں : ہم تم لوگوں کے مشورہ سے بہت خوش ہوئے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فوراً سلطان بہادر کا تعاقب کیا جائے۔

تمام امراء کورنش بجا لائے اور اپنے اپنے مقامات پر آگئے۔ ابھی اس فیصلہ کو ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ پیش خیمہ دوسری منزل پر جا کر لگا دیا گیا اور چند گھنٹے میں فوج نے اپنے خیمے، بازار، ساز و سامان بار کیا اور

یہ لشکر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ سلطان بہادر کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

جب شاہی فوج تعاقب کرتی ہوئی مقام لودی پہنچی تو معلوم ہوا کہ سلطان بہادر کی فوج نے تمام راستوں کو بند کر دیا ہے۔ اور ایک مناسب اور محفوظ مقام دیکھ کر پہاڑوں کے وسط میں پڑ گیا ہے۔ شاہی لشکر کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اس راستہ کے چاروں طرف ان پہاڑوں میں پھیلا دیا تھا اور شہنشاہ ہمایوں کی فوج بغیر بہت بڑا خطرہ مول لیے ادھر سے نہیں گزر سکتی تھی۔ کیونکہ سلطان بہادر کی فوج شاہی فوج پر چاروں طرف سے تیر برسا کر اس کو تباہ کر سکتی تھی۔

یہ صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔ شہنشاہ ہمایوں نے پھر اپنے امراء کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق بہتر رائے دی۔ آخر میں بیرم خاں نے یہ مشورہ دیا کہ شاہی فوج اسی وادی میں ان پہاڑوں سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ڈیرے ڈال دے۔ اس کے بعد ان پہاڑوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ اور ایسی سخت ناکہ بندی کی جائے کہ سامان رسد و خوراک دشمن تک نہ پہنچے۔ اس طرح دشمن بغیر جنگ کے ہتھیار ڈالنے اور اطاعت کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

تمام امراء اور خصوصاً شہنشاہ ہمایوں کو بیرم خاں کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اور انھوں نے کوک علی، ٹھٹھہ بیگ اور مغل بیگ جیسے بڑے امراء اور تجربہ کار افسروں کو خاص طور پر اس کام کے لیے منتخب کیا۔ شروع میں خیال تھا کہ یہ محاصرہ زیادہ عرصہ تک نہ رہے گا اور

روزانہ اس پر غور و خوض کیا جاتا تھا۔ پہلے مہینے میں اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ لیکن دوسرے مہینے ہی سے اس کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے۔ سلطان بہادر کی فوج کے بہت سے آدمی شاہی کیمپ میں آ گئے۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ لیکن سلطان بہادر بڑے عزم و ارادہ کا انسان تھا۔ اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اور برابر بھوک پیاس کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن تیسرے مہینے تمام فوج باغی ہو گئی۔ لوگ بھوک پیاس۔ موسم کے تغیرات اور جنگل کی زندگی سے عاجز ہو گئے اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت خوراک اتنی گراں ہو گئی کہ ایک سیر غلہ کی قیمت چار پانچ تنکہ تک پہنچ گئی۔ سلطان بہادر نے حکم دیا کہ تمام کوتل گھوڑے ذبح کر دیے جائیں۔ اس طرح کچھ دن گزارا ہُوا۔

اب سپاہیوں کی قوت برداشت ختم ہو چکی تھی۔ کچھ سپاہی جو بھوک، پیاس، گرمی، سردی، بارش اور دشمن کی فوجوں سے لڑتے لڑتے عاجز آ گئے تھے انھوں نے سلطان بہادر کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان بہادر نے رومی خاں کو جو توپ خانہ کا انچارج تھا حکم دیا کہ ان باغیوں کو توپ سے باندھ کر ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن رومی خاں نے لیلیٰ اور مجنوں نام کی دو مشہور اور زبردست توپوں میں بہت سی بارود بھر کر توڑ دیا۔ اُس سے اتنا زبردست دھماکہ ہوا کہ سارا جنگل لرز گیا اور شاہی کیمپ تک میں سپاہی اُچھل پڑے۔ اب سلطان بہادر کے آدمیوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ سلطان کے لیے بھی کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ

بھی کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لیلیٰ و مجنوں کے دھماکہ سے آدھی رات کو شہنشاہ ہمایوں کی آنکھ کھل گئی۔ خیمہ میں اُس وقت علاقلی موجود تھا۔ شہنشاہ نے دھماکے کا سبب پوچھا۔ علاقلی نے بتایا کہ سلطان بہادر بھاگ گیا ہے۔ شہنشاہ نے اس وقت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور دیر تک مناجات الٰہی میں مشغول رہا۔

صبح کو بادشاہ بہ نفسِ نفیس بہادر شاہ گجراتی کے تعاقب میں روانہ ہُوا۔ لوگ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے مگر کہیں امان نہ ملتی تھی۔ شاہی فوج نے اُن کا بڑی دُور تک تعاقب کیا۔ بے شمار آدمی قتل ہُوئے۔ لیکن سلطان بہادر کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

دوسرے دن بادشاہ نے تعاقب ختم کر دیا۔ فوج بے شمار مالِ غنیمت لے کر واپس لوٹی۔ سپاہیوں نے کمریں کھولیں اور اطمینان کا سانس لیا، پھر پُرسکون زندگی کے نشانات خیموں میں پائے جانے لگے۔

اس عرصہ میں رومی خاں شاہی دربار میں پیش ہُوا شہنشاہ نے اس کو معاف کر دیا اور شاہی فوج میں ملازم رکھ لیا۔

شہنشاہ ہمایوں ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ کدھر کا رُخ کریں کہ ان کو اطلاع ملی کہ سلطان بہادر مندو میں پناہ گزین ہے۔ شہنشاہ ہمایوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی فوج کو مندو کی طرف بڑھنے کا حکم دے دیا۔ فوج نے مندو کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد سلطان بہادر یہاں سے بھی نکل کر بھاگ گیا اور قلعہ چنپانیر میں جا کر مقیم ہُوا۔ سلطان بہادر کے جانے

ہی مندو کا قلعہ مغلیہ فوج نے سر کر لیا۔ اس مقام پر مغلیہ فوج کو بے شمار مالِ غنیمت ملا۔ لیکن شہنشاہ ہمایوں نے مالِ غنیمت پر سلطان بہادر کے تعاقب کو ترجیح دی اور قلعہ چنپانیر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اور فوراً قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ چنپانیر بہت مضبوط قلعہ تھا۔ اور اس میں محصورین نہایت محفوظ تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شخص شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ اگر مجھ غریب پر اعتماد فرمائیں تو میں حضور کو ایک راستہ سے قلعہ کے بالائی حصہ میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تاکہ قلعہ نہایت آسانی سے فتح ہو جائے۔ شہنشاہ ہمایوں نے اس کی بات مان لی اور چیدہ چیدہ افسروں کو لے کر اُس کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ کمندیں لگائی گئیں اور ایک ایک کر کے لوگ قلعہ کی فصیل پر چڑھنے لگے۔ ابھی تیس آدمی اوپر گئے تھے کہ خود شہنشاہ ہمایوں نے کمند میں پاؤں ڈال دیا۔ بیرم خاں ابھی شہنشاہ کے پاس نیچے ہی کھڑے تھے۔ وہ یہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ شہنشاہ مکرم دشمنوں میں اکیلے پہنچ جائیں اور وہ کھڑے دیکھتے رہیں۔ انھوں نے بڑھ کر عرض کی۔ جہاں پناہ ذرا مجھے یہ دیکھ لینے دیجیے کہ کمند مضبوط بھی ہے یا نہیں۔ یہ سُن کر شہنشاہ ہمایوں نے اپنا پاؤں کمند سے ہٹا لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ بیرم خاں آگے بڑھے انھوں نے کمند میں اپنا پاؤں ڈالا اور جھٹ پٹ قلعہ کی فصیل پر پہنچ گئے۔ اور عام حالات میں یہ سخت بد تہذیبی کی بات تھی کہ شہنشاہ کو ہٹا کر خود کوئی کام کرنا بے ادبی ہے۔ لیکن یہ منزل ہی دوسری تھی۔ یہاں موت کی آغوش میں جانا اور جان پر کھیلنے کا مسئلہ تھا۔ اس لیے شہنشاہ ہمایوں نے جو اس کے

بعد ہی فصیل پر پہنچ گئے تھے۔ بیرم خاں کی دانشمندی، وفاداری اور بہادری کی بہت تعریف کی۔ اس طرح قلعہ کی چھت پر بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ طبل اور بگل بجانے والے دو آدمی بھی شہنشاہ نے اپنے ہمراہ رکھ لیے تھے۔ جب یہ چند جاں بازوں کی جمعیت قلعہ میں داخل ہوئی تو شہنشاہ ہمایوں نے موقع پاکر طبل و بگل بجانے کا اشارہ کیا۔ ان کے بجتے ہی افسران اور وہ شجاع و بہادر سپاہی جو سر سے کفن باندھ کر آئے تھے۔ قلعہ کے ہر حصہ پر ٹوٹ پڑے۔ اس اچانک حملہ میں بہت سے محصورین بے دریغ قتل ہوئے۔ بہت سے لوگ موقع پاکر فرار ہو گئے۔ ان بھاگنے والوں میں سلطان بہادر بھی تھا جس کو قسمت نے ایک مرتبہ پھر فرار ہو جانے کا موقع دے دیا اور جس نے پھر بندرگاہ سورت میں جاکر دم لیا۔ بادشاہ نے اس روز قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن خزانہ و جواہرات ہاتھ نہ آئے۔ یوں تو مالِ غنیمت کی کمی نہ تھی۔ صفدر خاں اس جنگ میں شدید زخمی ہوئے سلطان بہادر کا ایک افسر عالم خاں اپنی مرضی سے شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ نے عالم خاں سے بہت سے سوالات کیے کہ وہ سلطان بہادر کے خزانے کا پتہ بتلا دے۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر امراء نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ عالم خاں کو گرفتار کر لیا جائے اور یہ حکم دیا جائے کہ جب تک وہ خزانے کا پتہ نہ بتائے اسے قید میں رکھا جائے گا لیکن شہنشاہ ہمایوں نے کہا کہ وہ شخص خود میرے پاس آیا ہے اور اُس نے امان طلب کی ہے اس لیے میں یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ اس پر سختی کروں۔ اس لیے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک دعوت

میں عالم خاں کو مدعو کیا جائے اور جب شراب کا دَور چلے تو اس سے خزانہ کا حال معلوم کیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ شراب کے نشہ میں خزانے کا پتہ بتا دے۔ اس حکم پر امراء نے ایک بزم آراستہ کی۔ قلعہ کے وسط میں حوض کے چاروں طرف خُوش نما شامیانے نصب کیے گیے۔ اس میں زر دوزی کی جھالریں آویزاں کی گئیں۔ شیشہ آلات اور خوشبویات سے اس کو زینت دی گئی۔ حوض میں چراغ جلائے گئے۔ اور چاروں طرف سے حسین و خوب رو کنیزیں رقص کرنے پر معمور تھیں۔ ان تمام باتوں نے مل کر ایک سماں باندھ دیا۔ عالم خان نے کبھی کاہے کو دولت حسن، خوبصورتی اور خوش نمائی کو اس طرح ایک جگہ جمع دیکھا تھا اور جب اس کو یہ معلوم ہُوا کہ بزم اُس کے اعزاز میں ہو رہی ہے تو وہ خُوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ وہ حیرت و مسرت کے ملے جُلے جذبات سے ہر گانے والی اور ناچنے والی حسین کنیز کو دیکھ رہا تھا۔ جن کی ایک ہی نگاہ کی جنبش اس کے خرمن دل کو جلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور ہزاروں نشتر اُس کی جانب آ رہے تھے۔ وہ مست ہُوا جا رہا تھا۔ اتنے میں ناچنے والیوں نے ایک ہاتھ میں جامِ بلوریں اور دوسرے میں صراحی اُٹھائی اور رقص کر کے اُس کے سامنے آ گئیں۔ ہر ایک حسینہ اپنا پیالہ شراب سے بھرتی اور عالم خاں کو پیش کرتی اُب عالم خاں پہ ایک اور ہی عالم طاری تھا۔ وہ عالمِ آب و گِل سے اب عالمِ قدس میں پہنچ چکا تھا اور جنت کی سیر کر رہے تھے۔ مگر اس عالم میں بھی وہ ان نازنینوں سے شراب کا جام لے لے کر پی رہے تھے۔ اب امراء نے مہمان سے کہا۔

تردی بیگ : دیکھو عالم خاں۔ شہنشاہ ہمایوں کو تمھارا کس قدر خیال ہے؟

عالم خاں : ہاں میں آج ان کی سخاوت کا قائل ہو گیا۔ انھوں نے ایک ذرہ کو آفتاب بنا دیا۔ کاش میں جہاں پناہ کے کچھ کام آسکتا۔

مغل بیگ : عالم خاں اگر تم شہنشاہ کو سلطان بہادر کے خزانہ کا پتہ بتا دو تو وہ تم سے اور بھی زیادہ خُوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس خُوشی میں تم کو پنج ہزاری یا ہفت ہزاری کا عہدہ مل جائے۔

عالم خاں شہنشاہ ہمایوں کے جاہ و جلال واکرام سے بہت کچھ مرعوب ہو چکا تھا اور اس کی عنایات بے بہا کی وجہ سے خُوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا اُس نے کہا۔

عالم خاں : اگر میرے شہنشاہ مکرم کی یہی تمنا ہے تو میں خزانے کا پتہ بتائے دیتا ہوں۔ یہ جو سامنے حوض بہہ رہا ہے اور اپنی ظاہری آب و تاب سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ اگر اس کا پانی نکال دیا جائے تو اس تہہ میں وہ بیش بہا خزانہ چھپا ہُوا ہے جس کو دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

امرا نے شہنشاہ کو اس بات کی اطلاع دی۔ حکم ہُوا کہ حوض کا پانی نکال دیا جائے۔ اب کیا تھا۔ لوگ ڈولچیاں لے کر پہنچ گئے اور پانی نکالنے میں مشغول ہو گئے۔ اتفاق سے اس وقت عالم خاں بھی گھومتا ہُوا اسی طرف آ گیا۔ جب اُس نے ہزاروں آدمیوں کو پانی نکالتے ہُوئے دیکھا

تو کہا۔ اس طرح یہ حوض کبھی خالی نہ ہوگا۔ مجھے اس کا گر معلوم ہے۔ آپ لوگ سُن کر اُس پر عمل کریں۔ تمام سپاہی عالم خاں کے گرد جمع ہوگئے۔ عالم خاں نے کہا اس کی ایک جانب بدرو پوشیدہ ہے۔ اُسے کھود کر صاف کیا جائے تو پانی نہایت آسانی سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اسی طرح کیا اور تمام پانی بڑی آسانی سے نکل گیا۔ جب حوض خالی ہُوا تو اُس کی تہہ سے بیش بہا خزانہ نکلا۔ جو فوراً تمام فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر ایک سپاہی کو ڈھال بھر کر سونا چاندی کے سکے اور جواہرات ملے۔ اس کے بعد ایک اور کنواں دریافت ہُوا جو سونے اور چاندی سے مملو تھا۔ اُسے فوج میں تقسیم نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد شہنشاہ ہمایوں نے تردی بیگ کو قلعہ چنار کا حاکم بنایا اور خود سلطان بہادر کے تعاقب میں شہر کھمبائت کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس عرصہ میں شہنشاہ ہمایوں نے ایک مشاورتی کونسل کی اور تمام امراء کو اس میں دعوت دی۔ جب سب امراء جمع ہوگئے تو شہنشاہ نے ان کو خطاب کرتے ہُوئے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : آپ حضرات جانتے ہیں کہ سلطان بہادر گجراتی تین مرتبہ ہمارے ہاتھ میں آکر نکل گیا وہ ضرور فتنہ و فساد کرے گا۔ اس لیے سوچنا یہ ہے کہ اس کا مزید تعاقب کیا جائے یا نہیں ؟

ہندو بیگ : جہاں پناہ۔ خدائے بزرگ نے آپ کو سلطان بہادر پر، فتح عنایت فرمائی۔ سلطان بہادر کو شہنشاہ مکرم نے پے در پے شکستیں دیں۔ قلعہ مندو پر قبضہ کیا۔ قلعہ چنپانیر فتح کیا۔ سلطان بہادر کئی مرتبہ اپنی جان

بچا کر بھاگا۔ یہی نہیں۔ بلکہ وہ شہنشاہ کے ڈر سے ملک گجرات چھوڑ کر چلا گیا یہ سب حضور کے اقبال کا کرشمہ ہے۔ اب سلطان بہادر کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آگئی کہ جگہ بند بابر اور شہنشاہ عالم پناہ سے ٹکرانا آسان نہیں اور وارث تخت مغلیہ سے بغاوت کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ جہاں پناہ۔ دوسرے یہ کہ سلطان بہادر حضور والا کی فوج کشی سے اب اس قدر کمزور ہوگیا ہے کہ وہ دوبارہ مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لیے میری ناقص رائے میں مناسب ہے کہ ایک سال کی تنخواہ فوج کو پیشگی دے دی جائے۔ اور باقی بطور امانت جمع رکھی جائے کہ آئندہ کی شدید ضرورت میں کام آسکے۔ آپ نے سلطان بہادر پر غلبہ پا لیا ہے اور دشمن پر غلبہ پاکر اس کو معاف کر دینا انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اگر اس وقت جہاں پناہ سلطان بہادر کو معاف کر دیں گے تو وہ آپ کا بندۂ بے دام ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں پناہ اس کو معاف کر دیجیے۔ تاکہ وہ جہاں پناہ کا حلقہ بگوش بن جائے۔ جہاں پناہ کی یہ فیاضی اور شاہانہ عنایت۔ جہاں پناہ کے لیے باعثِ شہرت اور نیک نامی ہوگی۔ اس طرف سے فارغ ہو کر جہاں پناہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت آگرہ میں جہاں پناہ کی موجودگی انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ مختلف ذرائع سے معلوم ہُوا ہے کہ سلطان مرزا ہندال اور مرزا شاہ میر نے بغاوتیں برپا کر دی ہیں۔ اور قنوج سے لے کر جون پور تک قلعوں پر قبضہ کر کے وہ اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر رہے ہیں۔ اس لیے

حضور سلطان بہادر کے تعاقب کے خیال کو ختم کر دیں۔ بادشاہ نے چند امرا سے اور رائے لی۔ سب نے ہندو بیگ کی تائید کی اس پر شہنشاہ بہت برہم ہوا اور اُس سے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : ہم نے اس علاقہ کو بزور شمشیر فتح کیا ہے۔ یہ بیش قیمت علاقہ جو زر و جواہر اور مال و دولت کی بنا پر بے مثل ہے چھوڑ دیں۔ نہیں۔ نہیں۔ ہم اس پر قبضہ رکھیں گے اور اس کو سلطنت دہلی سے ملحق کریں گے۔

چند امرا نے جب یہ دیکھا کہ شہنشاہ ان کا مشورہ قبول نہیں کرتے تو خود بھی شہنشاہ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک طرف شہزادہ عسکری مرزا کو صوبہ دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے اُکسایا اور دوسری طرف شہزادہ یادگار ناظر مرزا کو چنپانیر کی طرف متوجہ کیا جس نے تردی بیگ کے پاس جا کر (جس کو ابھی حال ہی میں شہنشاہ نے قلعہ چنپانیر کا حاکم بنایا تھا) کہا شہنشاہ نے مجھے قلعہ کا حکمران بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا تمام شہر اور خزانہ کا جائزہ دو۔ تردی بیگ نے شہزادہ یادگار ناصر مرزا کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور شہنشاہ کو اطلاع دی کہ شہزادہ یادگار ناصر شہر اور خزانہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ میں جو حضور حکم دیں گے عمل کیا جائے گا۔

اس وقت شہنشاہ اپنی قلیل جماعت کے ساتھ شہر کھمبائت میں ٹھہرا ہوا تھا۔ تمام لشکر، گجرات کے علاقے میں جگہ جگہ متعین تھا جب

شہنشاہ نے دیکھا کہ شہزادہ اور امراء متحد ہو کر اُس کے خلاف سازش کر رہے ہیں تو اس نے بھی احمد آباد کی طرف کوچ کیا اور گرد و نواح سے تمام فوج کو اکھٹا کیا اور کھمبائت سے احمد آباد پہنچ گیا۔ بادشاہ کے احمد آباد آنے کی خبر سُن کر بعض فوجی ادھر اُدھر سے جمع ہو کر شاہی لشکر سے آملے۔ فوجیوں سے سلطان مرزا اور اس کے بیٹوں کی بغاوت کی خبر سُن کر بادشاہ بھی اپنے مستقر یعنی آگرہ کی جانب روانہ ہُوا۔ سلطان بہادر کو جب یہ معلوم ہُوا کہ شاہی جماعت منتشر امراء مخالف بادشاہ آگرہ کی جانب گام زن ہے تو وہ بھی پرتگالیوں سے صلح کر کے چھ ہزار حبشیوں کی مدد لے کر کھمبائت سے احمد آباد واپس ہوا ان مسلسل حملوں، کامیابیوں اور بغاوتوں نے افتخار مرزا اور بیرم خاں کو بہت زیادہ مصروف کر دیا۔ ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ قلعہ چنپانیر پر قبضہ کرنے کے موقع پر صفدر خاں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ لیکن افتخار مرزا کو اتنی فرصت نہ ملی کہ ان کی طرف توجہ کر سکیں۔ افتخار مرزا کا ذہن اب ہر وقت لڑائیوں میں لگا رہتا ان گوناگوں مصروفیات میں وہ ناہید کو بھی بھول گیا۔ لیکن جب کبھی آرام کی کوئی گھڑی آتی تو ناہید آنکھوں میں آنسو لیے ان کے سامنے آجاتی اور کہتی "کیوں افتخار کیا تم نے ہم کو بالکل بھلا دیا۔ تم تو کہتے تھے کہ ہم تم کو کبھی فراموش نہ کریں گے اور افتخار مرزا اس تصور پر تڑپ جاتا۔ وہ سوچتا۔ خدا معلوم ناہید سے کب ملاقات ہو۔ میں جب ایک گتھی سلجھاتا ہوں تو دوسری اُلجھ کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم کس کام کے لیے آئے تھے اور کس ہنگامہ میں پھنس گئے۔ سال بھر کے قریب ہو گیا کہ ناہید کی موہنی شکل نگاہوں سے اوجھل ہے۔

ہائے اب تو اتنی بھی فرصت نہیں کہ اس غریب کی تسکین خاطر کے لیے ایک خط بھی لکھ سکوں۔ ناہید مجھے معاف کرنا۔ میں بالکل مجبور ہوں ورنہ میرا دل آج بھی محبت کی آگ سے آتش کدہ بنا ہوا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں کے چند امراء نے جب سے بغاوت کی ہے ان کا اعتماد ہر شخص پر سے اُٹھ گیا۔ وہ سوائے میرے اور بیرم خاں کے اب کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ہائے اس نگاہ ہمایونی نے منتخب کر کے مجھے میری ناہید کی نگاہوں سے گرا دیا۔ میں صفدر خاں کو کل ہی روانہ کر دوں گا۔ تاکہ ناہید اکیلی نہ رہے۔ یہ خیال آتے ہی افتخار مرزا فوراً اپنے خیمے سے نکل کر صفدر خاں کے خیمے میں گئے۔ صفدر خاں باوجود نقاہت و کمزوری کے تعظیم کے لیے اُٹھے۔ مگر افتخار مرزا نے بڑھ کر اُن کو پلنگ پر لٹا دیا۔

افتخار مرزا : کہیے قبلہ۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

صفدر خاں : افتخار تم اتنے عرصہ کہاں رہے۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف تم سے نہ ملنے کی تھی۔

افتخار مرزا : ارے آپ تو بے حد کمزور ہو گئے ہیں۔

صفدر خاں : بیٹا خون کے کثرت سے نکل جانے سے یہ کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ میں انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔

افتخار مرزا : کیا آپ کے زخم مندمل ہو گئے۔

صفدر خاں : نہیں ابھی سر کا زخم تکلیف دے رہا ہے۔

افتخار مرزا : قبلہ۔ مجھے اس بات کا تصور بھی نہ تھا کہ آپ اتنے شدید

بیمار ہیں۔ میں بہت مصروف تھا۔ اس لیے نہ آسکا۔ اب میں آپ کو فوراً آگرہ بھیج رہا ہوں۔ آپ چلے جائیں۔

صفدر رخاں : افتخار ناہید مجھے اس حال میں دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا جائے گی۔ اس لیے مجھے ابھی نہ بھیجیے۔ میں آپ کے ہمراہ جاؤں گا۔ جب تک میرے جسم میں اتنی طاقت آجائے گی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کے قابل ہو جاؤں اور گھر میں اپنے پیروں سے داخل ہوں۔ اس وقت تک میں گھر جانا نہیں چاہتا۔

افتخار مرزا : قبلہ آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔ وہ گھر پر ہی مل سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس معمولی سی درخواست کو نہ ٹھکرائیں گے۔

صفدر رخاں : اگر تمھارا یہی حکم ہے تو میں جانے کو تیار ہوں افتخار نے فوراً ایک پالکی۔ چند نوجوانوں اور نوکروں کا انتظام کیا اور یہ مختصر سا قافلہ گجرات سے آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہنشاہ ہمایوں نے بھی چند دن احمد آباد میں قیام کیا اور پھر دارالسلطنت آگرہ کا رُخ کیا۔ راستہ میں جو خبریں گوش ہمایوں تک پہنچیں وہ بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھیں۔ شہنشاہ ہمایوں ابھی گجرات ہی میں تھا کہ اس کو مہا سلطان مرزا کی بغاوت کا علم ہُوا۔ اس کو معلوم ہُوا کہ مہا سلطان مرزا نے شہنشاہ کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر ان تمام علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا جو دریا گنگا کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ اس نے بلگرام کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور الغ مرزا کو جون پور اور شاہ مرزا کو کڑہ مانک پور کے علاقہ کو فتح کرنے کے لیے

بھیجا ہے۔ اور بذات خود بلگرام میں مقیم ہے۔

طغلان بیگ نے جو اس وقت پرگنہ بلگرام کا حاکم تھا بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ وہ چپ چاپ مرزا ہندال۔ شیخ پھول محمد کوکناش اور دوسرے امرا کے پاس گیا اور ان کو تمام صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ اُس نے ان لوگوں کو بتایا کہ اس وقت مہا سلطان مرزا تنہا بلگرام میں پڑا ہے۔ اس کی فوج مختلف مقامات پر لگی ہوئی ہے۔ اگر ہم سب مل کر اس کی سرکوبی کے لیے جائیں تو خدا کے فضل وکرم سے ہم کو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ سب امراء کو طغلان بیگ کی یہ رائے پسند آئی اور مرزا ہندال۔ شیخ پھول اور بہت سے دوسرے امراء متحد ہو کر قنوج کی طرف مہا سلطان مرزا کی گوشمالی کے لیے روانہ ہوئے۔ جب یہ لوگ دریائے گنگا کے کنارے پہنچے تو مہا سلطان مرزا کو اس کی اطلاع ملی کہ مرزا ہندال لشکر جرار لے کر قنوج تک پہنچ گیا ہے۔ مہا سلطان مرزا نے فوراً الغ مرزا اور شاہ مرزا کو خطوط کے ذریعہ اطلاع دی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے مدد کے لیے آ جاؤ۔ کیونکہ مرزا ہندال نے قنوج فتح کر لیا ہے۔ اطلاع ملتے ہی یہ دونوں اپنی اپنی فوجیں لے کر بلگرام میں داخل ہوئے اور مہا سلطان کی معیت میں دریائے گنگا کے شمالی جانب خیمہ زن ہوئے۔ ایک عرصہ تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ ایک روز مرزا ہندال نے کہا کہ ہمارے پاس اتنی بھی کشتیاں نہیں کہ ہم سب ایک ہی وقت میں دریا کو عبور کر جائیں۔ طغلان بیگ کوکا نے عرض کیا کہ یہ علاقہ پہلے میری جاگیر میں تھا۔ اگر حکم ہو تو دریا کا پایاب دریافت کروں۔ مرزا ہندال نے خوش ہو کر طغلان کو خلعت سے سرفراز کیا اور

کہا کہ اس سے بہتر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ اسے ضرور انجام دو۔ طقلان بیگ مرزا ہندال سے رخصت ہو کر گرد و نواح میں گیا۔ کشتی بانوں کو طلب کیا گیا اور انہیں انعام و اکرام دے کر کہا کہ اگر دریا کا پایاب دریافت کروگے تو دس ہزار تنکے بطور انعام دیے جائیں گے۔ اب کیا تھا۔ انعام کے لالچ میں کشتی بانوں نے دریا کو گھنگھول ڈالا۔ دو روز کے اندر مرزا کے لشکر سے کل دس میل کے فاصلے پر پایاب دریافت ہو گیا۔ طقلان بیگ نے حاضر ہو کر مرزا کو مبارکباد پیش کی۔ اور کہا کہ شہنشاہ ہمایوں کے اقبال سے دریا کا پایاب دریافت ہو گیا ہے۔ مرزا ہندال نے شیخ پھول کو طلب کیا۔ فاتحہ پڑھی اور حکم دیا کہ ہمارے خیمے اسی حالت میں رہنے دیے جائیں تاکہ دشمن کو ہماری نقل و حرکت کا علم نہ ہو سکے۔ فوج کو چاہیے کہ وہ اپنے اسلحہ وغیرہ سے لیس ہو کر دریا کو عبور کر جائے۔ ایک پہر رات گزری تھی کہ سپاہیوں نے دریا کو عبور کرنا شروع کیا اور ایک پہر رات باقی تھی کہ پورا لشکر بہ حفاظت تمام دریا کو عبور کر گیا۔ مرزا ہندال نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ صبح ہوتے ہی لشکر اپنے ہتھیاروں سے آراستہ رہے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے جنگ شروع کر دی جائے۔

یہ خبر مہا سلطان مرزا کو بھی ملی کہ مرزا ہندال اپنی فوج کو لے کر دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اس کی فوج جنگ پر آمادہ ہے۔

دونوں لشکروں میں لڑائی شروع ہوئی۔ ابھی ایک پہر دن گزرا تھا کہ جنوب سے ناگاہ ایک زبردست طوفان اُٹھا۔ ایسی غضبناک آندھی آئی کہ تمام دشت تیرہ و تار ہو گیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اتنا گرد و غبار

اٹھا کہ سارا میدان تاریک ہوگیا۔ مہا سلطان مرزا کے سپاہی اس طوفان سے اتنے خوف زدہ اور سراسیمہ ہوگئے کہ وہ دوست دشمن میں تمیز نہ کر سکے۔ اس لیے ان کے پاؤں میدان سے اُکھڑ گئے اور مہا سلطان مرزا شکست کھا کر فرار ہوگیا۔

شاہی لشکر نے الغ مرزا کا تعاقب کیا اور جون پور کی طرف روانہ ہوا مرزا ہندال بیگ نے طفلان بیگ کو پرگنہ بلگرام کا حاکم مقرر کیا اور کہا کہ تم نے حق خدمت ادا کر دیا جب شہنشاہ معظم جنگ سے واپس آئیں گے تو میں تمھاری سفارش کروں گا۔

اس کے بعد یہ لشکر فتح وظفر کے پھریرے اُڑاتا ہوا مہا سلطان مرزا کے تعاقب میں اودھ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں الغ مرزا مہا سلطان مرزا سے آملا۔ اور دونوں مل کر پھر مرزا ہندال سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ دونوں فوجیں دو ماہ تک ایک دوسرے کے مقابلے میں پڑی رہیں۔ مرزا ہندال چاہتا تھا کہ جلد از جلد عام یلغار کر دی جائے۔ مگر شیخ پھول اس عجلت کے خلاف تھا۔ مہا سلطان نے جب یہ سُنا کہ شہنشاہ ہمایوں عنقریب آگرہ پہنچنے والے ہیں تو گھبرا کر میدان میں نکل آیا۔ الغرض دونوں لشکروں کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی۔ کیونکہ شہنشاہ ہمایوں کا اقبال بلند تھا اس مرتبہ بھی مرزا ہندال کو فتح نصیب ہوئی۔ مہا سلطان مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور اپنے بیٹوں سمیت میدان سے بھاگ گیا اور بہار کی پہاڑیوں میں کہیں روپوش ہوگیا۔

جنگ کا مطلع صاف ہوتے ہی مرزا ہندال جون پور پہنچا۔ اس عرصہ میں شاہی لشکر آگرہ کے قریب پہنچ گیا۔ جب مرزا ہندال کو یہ معلوم ہوا کہ شہنشاہ

ہمایوں دارالخلافہ کے قریب پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی اپنی فوجیں لے کر شہنشاہ کے استقبال کے لیے جون پور سے آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس طرح آگرہ ایک مرتبہ پھر ایک عرصہ کے بعد شہنشاہ ہند کی قدم بوسی کے لیے آراستہ کیا گیا اور حکومت کا مرکز گجرات سے پھر آگرہ منتقل ہو گیا۔ جہاں ناہید ایک سال سے افتخار مرزا کی جُدائی کے صدمے سہ رہی تھی۔

باب ۱۳

بیرم خاں اور ابو القاسم کی داستانِ محبت

آگرہ آج بھی سلطنت مغلیہ کا پایۂ تخت ہے۔ دریائے جمنا آج بھی اس کے قدموں پر اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے۔ ہوائیں آج بھی خوش گوار ہیں۔ وہی بازار، وہی شاہی محلات، وہی باغات وہی لوگ، وہی مقام۔ لیکن اب ہر بزم سونی ہر گھر اُداس ہر جگہ بے کیفی۔ ہر مقام پر لطفی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شہنشاہ ہمایوں عرصہ دراز سے گجرات کو آباد کیے ہُوئے ہیں۔ اہلِ شہر اُداس ہیں۔ شہر پر بے رونقی طاری ہے۔ دو عیدیں گزر گئیں۔ وہ بھی شہر میں کوئی زندگی نہ پھونک سکیں۔ اس کی روح تو شہنشاہ تھے۔ وہ ہوتے تو عید کے موقع پر نقاروں پر چوٹ پڑتی شہنشاہ کی سواری عیدگاہ جاتی۔ راستے سجائے جاتے۔ در و بام آراستہ ہوتے۔ لاکھوں روپیہ شہنشاہ اور شہزادوں پر تصدق کیے جاتے۔ اس کے بعد دربارِ عام ہوتا۔ نذریں گزاری جاتیں۔ خلعت تقسیم ہوتے۔ دریائے فیض جاری ہوتا۔ عہدے بٹتے۔ منصب دیے جاتے۔ جاگیریں عطا ہوتیں۔ عہدوں پر ترقی ہوتی۔ ہر شخص کو اپنی قسمت کے مطابق مل جاتا۔ نئے لباس تقسیم کیے جاتے۔ عیدی بٹتی اور گھر گھر چراغاں کیا جاتا۔ خوشیاں منائی جاتیں۔ دولت تقسیم ہوتی۔ کھانے کھلائے جاتے بیوہ و یتیموں کو وظیفے ملتے۔ لیکن اب کون تھا کہ ان کی خوشی

میں شریک ہوتا۔ شہنشاہ کے قیام کے دوران میں ہر دن روزِ عید اور ہر شب شبِ برات ہوتی تھی۔ کبھی کسی شہزادے کی شادی کا جشن ہفتوں منایا جارہا ہے۔ کبھی کوئی سفیر آرہا ہے اور شہر میں مہینوں پہلے سے آئینہ بندی ہو رہی ہے۔ کبھی کسی جنگ کی فتح کی خبر آرہی ہے اور زر و جواہر لٹائے جارہے ہیں۔ کبھی عید ہے۔ کبھی رمضان، کبھی کسی کی سال گرہ ہے۔ غرض اہلِ شہر ان ہنگاموں کے عادی تھے۔ انھیں ہنگاموں سے بازاروں کی رونق تھی۔ ایران۔ توران۔ اصفہان۔ کشمیر۔ ترکی وغیرہ سے آئے ہوئے تاجر ایسے ہی موقع پر مالا مال ہوجاتے تھے۔ دوسرے فوج خرید و فروخت اور شہری زندگی کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ وہ بھی باہر تھی۔ امراء اور بڑے جاگیردار بھی۔ شہنشاہ والا بار کے ہمرکاب تھے۔ اُن کا دم بھی اہلِ شہر کے لیے بہت غنیمت تھا۔ ہر امیر اپنی جگہ ایک چھوٹا سا بادشاہ تھا۔ اس کا دربار لگتا، ہزاروں ملازم ہوتے۔ سیکڑوں حاجت مند آتے اور مراد پاتے تھے۔ ہزاروں لوگوں کی روزی کا یہی سلسلہ تھا۔ خصوصاً، شعراء، اہلِ علم، اہلِ صنعت اور ادیبوں کی یہ لوگ بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور ذرا ذرا سی خوش نما چیزوں اور باتوں پر بڑا انعام دیتے تھے۔ وہ لوگ جو شہنشاہ تک جانے کی مقدرت نہیں رکھتے تھے وہ ان امرا کے پاس چلے جاتے تھے۔ اس طرح امراء کا فیض بھی اہلِ شہر کے لیے عام تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کسی نہ کسی حیثیت سے لڑائی پر گیا ہُوا تھا اور لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی جُدائی سے پریشان تھے۔

اس اُجڑے ہوئے آگرہ اور اُجڑے ہوئے شاہی محلات کے قریب ایک محل میں ہماری غم نصیب ناہید، بے کیف زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ اس نے یہ تمام وقت رو رو کر گزارا تھا۔ پہلے کچھ اُمید تھی۔ وہ صبح سے شام تک ہزاروں مرتبہ بالاخانہ پر جاتی اور دُور فضائے بسیط پر دیکھتی کہ کسی لشکر کے آنے کے نشانات ہیں یا نہیں؟ اس کو بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا کہ شاہی لشکر فتح کے شادیانے بجاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اس لشکر میں سب سے آگے اس کا محبوب افتخار مرزا ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار علم لشکر ہاتھ میں لیے بڑھا چلا آرہا ہے۔ اس کا سینہ فخر و مسرت کے جذبات سے کھل اٹھتا۔ اور مسرت کے چند آنسو اُس کی پلکوں پر رقص کرنے لگتے۔ لیکن یہ سب سراب ہوتا تھوڑی دیر میں اس کو دُور سے کوئی اونٹوں کا قافلہ نظر آتا اور وہ مایوس ہو کر پلٹ آتی۔ وہ گھر جس میں دُنیا کی آسائش و آرام کا سب سامان موجود تھا اس کو کاٹے کھاتا تھا۔ وہ کشادہ کمرے، وہ اس کی آرائشیں، وہ پائیں باغ، وہ گلوں کے تختے وہ حوض اور وہ باغ کی حسین روشیں سب چیزیں اس کو زہر لگ رہی تھیں۔ اس کا دل نہ خوبصورت کنیزیں بہلا سکتی تھیں نہ نوکروں کی ریل پیل۔ وہ اس تمام آرائش و مسرت میں بھی پریشان تھی۔ بعض اوقات وہ سوچتی کہ اس نئی مصیبت سے تو وہ مصیبت ہی اچھی تھی جو اس نے عالم غربت میں اپنی ماں کے ساتھ اٹھائی تھی۔ اس وقت، وہ ان تمام مصائب میں اکیلی نہ تھی بلکہ اس کی ماں بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس وقت صرف پیٹ کی آگ کا مسئلہ تھا۔ ہم دونوں صبر و شکر کرکے

ابا حضور کو یاد کر لیا کرتے اور خدا سے ان مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی دُعا مانگا کرتے تھے۔ ایک سے دوسرے کو ڈھارس تھی۔ ایک دوسرے کا رفیق تنہائی اور مونس و غم خوار تھا۔ اگر امی زیادہ پریشان ہوتیں تو میں اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر دوسری طرف متوجہ کر دیتی۔ اگر میں زیادہ افسردہ ہوتی تو امی جان مجھے گلے سے لگا کر پیار کرتیں۔ کتنا ابدی سکون ملتا تھا۔ مجھے ان کی آغوش میں کیسی مسرت ملتی کہ بھوک و مفلسی کا احساس جس سے ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ روپیہ کی ریل پیل یہ سامانِ آسائش کی بھرمار یہ سونے چاندی کے ڈھیر۔ یہ خوبصورت درو دیوار' یہ شیشہ آلات' یہ دیوار گیریاں' یہ چشمے یہ حوض مچھلیاں، باغات، پھول، یہ سب بیکار ہیں جب یہ میرے دل کو اپنی طرف کھینچنے کے قابل نہیں۔ یہ سب محض فریب ہے۔ مرکزی مسرت اگر دولت ہوتی تو میں یہاں کیوں اتنی غم زدہ اور بے چین ہوتی۔ ہائے اس سے زیادہ آرام و سکون تو مجھے اس جھونپڑے ہی میں تھا۔ یہ سب چیزیں میرے لیے بیکار ہیں۔ کیونکہ وہ میرے افتخار کو مجھ سے نہیں ملا سکتیں میرے دل کی آگ کو یہ چیزیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں۔ افتخار کاش میں تم سے نفرت کرتی تو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ افتخار تم مجھے بھول گئے۔ کہاں گیا وہ تمہارا عشق۔ کہاں گئے وہ تمہارے پیمانِ وفا۔ تم کو ایک غریب لڑکی سے کیا محبت ہو سکتی ہے۔ تم خود شہنشاہ ہمایوں کے محبوب ہو۔ مگر ہائے تم نے مجھے اپنی محبت میں کیوں گرفتار کیا۔ تم کو مجھے اس طرح تڑپانے سے کیا ملا تم نے میرے وجود میں کیوں بجلیاں بھر دیں۔ مجھے میرے گھر کی دربانی

کیوں سونپ دی۔ میرے دل میں کیوں محبت کے چراغ روشن کر دیے۔ بتاؤ افتخار، محبت میرے دل میں آفتاب کی پہلی کرن کی طرح داخل ہوئی اور تم شبنم کے موتیوں کی طرح میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ بتاؤ افتخار میں اس ویرانے میں کہاں جاؤں، کس کو پکاروں، کیا کروں، تم نے مجھ پر نگاہ کرم کی تو بڑا کرم کیا ورنہ میری مثال تو اس غریب عورت کی طرح ہے جو حضرت یوسف کے حسن کا شہرہ سن کر ان کو خریدنے کا جذبہ بلند لے کر آ گئی تھی۔ حالانکہ مال دنیا میں اس کے پاس ایک سوت کے گولے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جب کہ یوسف کے خریدار خود عزیز مصر تھا۔ افتخار میرے پاس تو تم کو خریدنے کے لیے ایک سوت کا گولہ بھی نہیں۔ اور تم بھی ایک بادشاہ کے محبوب ہو۔ بتاؤ یہ زندگی کیسے گزرے گی ناہید اب وہ اگلی سی ناہید نہ تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بال پریشان رہتے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے نہ اس کی چال میں کبک دری کی چال نظر آتی نہ اس کی آنکھیں اب کیف و مستی کی بارش کر رہی تھیں۔ وہ اب ایسا وجود تھی جس کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت پلنگ پر لیٹے رہنے یا کتابیں پڑھنے میں گزرتا۔ ایک دن ناہید حسب دستور افسردہ و مغموم لیٹی ہوئی تھی کہ سامنے سے گل رخ اور انجمن آرا ہنستی ہوئی داخل ہوئیں۔ جب سے ناہید یہاں آئی تھی اس کی دوستی گل رخ سے اور بعد کو انجمن آرا سے ہو گئی تھی۔ یہ چونکہ ہم مذاق تھیں اور ایک ہی مرض میں گرفتار تھیں۔ اس لیے بہت جلد ایک دوسرے سے مانوس ہو گئیں۔ انجمن آرا نے آتے ہی ناہید کو

جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

انجمن آرا: کہیے مولانا مجنوں، آپ کے کیسے مزاج ہیں۔ اس پر ناہید بے اختیار ہنس پڑی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

ناہید: آپ کو کیا۔ آپ تو اپنی محبت میں لگی رہیے۔

انجمن آرا: مولانا مجنوں دُنیا میں محبت کون نہیں کرتا۔ لیکن آپ کی طرح جو نچلے شاید ہی کوئی دوسرا کرتا ہو۔ تمھارے ایک ہم نام نجد میں مارے مارے پھرتے تھے بیچارے کے لیلیٰ یا سگ لیلیٰ نے کاٹ کھایا تھا۔

ناہید: مگر تم کو تو ایک مردوئے نے کاٹ کھایا ہے۔

انجمن آرا: خوب، کاٹا مجھے ہے اور تڑپ آپ رہی ہیں — بہن گُل رخ ذرا تم ہی فیصلہ کرو۔ ہم دونوں میں عاشق کون نظر آتا ہے اور معشوق کون ہے؟

گُل رُخ: تم بڑی چرب زبان ہو۔ آکر نہ غریب ناہید کا حال پوچھا نہ خیریت معلوم کی۔ اور وہی دل لگی، وہی بیہودگی، یہ غریب دل میں کیا کہتی ہوگی؟

انجمن آرا: (گُل رُخ سے خطاب کرکے) میں اس لیے ایک عدد امّی جان کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔ امی جان، دیکھیے ہماری سہیلی غریب ناہید کا کیا حال ہے؟ اب تو سُنا ہے کہ حرارت بھی رہنے لگی ہے۔ ہائے کتنی اچھی لڑکی تھی۔ حسین مہ جبین، ہزاروں میں ایک۔ لاکھوں میں فرد۔ اس

پر ضرور دس بیس ہزار جنوں اور دو چار ہزار پریوں کا سایہ ہوگیا ہے۔

گل رُخ اور ناہید دونوں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔

انجمن آرا : دیکھیے امی جان اگر آپ نے چٹکی لی تو پھر ہونے والے ابا جان سے شکایت کروں گی۔ میں قاسم کے باپ سے نہیں ڈرتی"

(ابوالقاسم)

ناہید : خدا بچائے اس عورت سے زبان ہے کہ خندق، جو کچھ منہ میں آتا ہے بکے چلی جاتی ہے۔

گل رُخ : ہاں یہ ہمیشہ کی تیز زبان ہے۔

انجمن آرا : کہہ لو۔ میری جان۔ خوب دل بھر کر کہہ لو ابھی ماشاءاللہ تم جوان ہو۔ اب قتل نہ کروگی تو کب کروگی۔ ابھی تو میں تمھارے تین یا دس خون معاف کر سکتی ہوں۔

ناہید : میرے خیال میں ناشتہ کر لیا جائے۔ اور پھر باغ میں چل کر خوش گپیاں کی جائیں۔ کہو انجمن آرا تم کاہے کا ناشتہ کروگی۔

انجمن آرا : مہ دو ہفتہ و معشوق چہار دہ سالہ

ہمیں بس است مرا ناشتۂ صبح پدید

گل رُخ : مگر یہ چیزیں تم کو یہاں تو نہیں مل سکتیں۔

انجمن آرا : اگر میں نابینا ہوتی تو بے شک تمھاری بات مان لیتی۔ ہائے میری جان گل رُخ "مہ دو ہفتہ تم ہو" اور اے" ناہید" معشوق چہار دہ سالہ" تم ہو۔ تم ہی ایمان سے کہہ دو کہ تم دونوں کے ملنے کے بعد کس

کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

گُل رُخ : صرف بیرم خاں کی۔ ورنہ بیچارے ابوالقاسم میں کیا بُرائی تھی۔

انجمن آرا : بیچارہ قاسم کا کنوارا باپ (ابوالقاسم) میرے عشق میں مرا جاتا تھا لیکن مجھ سے تمہاری حالت دیکھی نہ گئی۔ اور میں نے اپنی بلا تمہارے گلے میں بہ رضا و رغبت ڈال دی۔

ناہید : ارے یہ کیا مسئلہ ہے۔

انجمن آرا : یہ بھی عشق ہی کا چکّر ہے۔ یہ بھی "حکایت مہر و وفا" ہی ہے۔ اُس نے ہر مرد اور عورت کو مبہوت کر دیا ہے۔ ناہید نے خادمہ کو آواز دی۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھایا گیا اور اس پر انواع و اقسام کے پھل اور مشروبات چُن دیے گئے انجمن آرا۔ ناہید اور گُل رخ نے ناشتہ کیا اور یہ تینوں پائیں باغ میں حوض کے کنارے بیٹھ گئیں۔ صبح کا وقت سنگ مرمر کا حوض، صاف و شفاف پانی۔ جو موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ حوض میں رنگین مچھلیاں، فواروں کا رقص اور سبزہ کا چمن۔ ان تمام رنگینیوں کے ساتھ۔ ناہید۔ انجمن آرا اور گُل رُخ کا وجود۔ ان تمام چیزوں نے پائیں باغ کے حسن و دل کشی میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تین چاند حوض کے کنارے اتر آئے ہیں۔ جن کا عکس پانی میں پڑ کر حسن کو اور بڑھا رہا تھا۔ لطیف ہوا کے جھونکے آرہے تھے اور سرو اس حسین قافلہ کو دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ انجمن آرا۔ ناہید اور گُل رُخ نے پاؤں

حوض میں لٹکا دیے۔ ان کی گوری گوری رانیں شفاف پانی میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھیں۔ انجمن آرا نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

انجمن آرا : ایسے ماحول میں مجھے یا تو شدید قسم کا شاعری کا موڈ آتا ہے یا پھر بے اختیار عشق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا تو میں عاشق بنتی ہوں اور ناہید تم معشوق بنو۔ یا ہم تینوں بزمِ سخن آراستہ کریں اور فطرت کو اس کے حُسن کی داد دیں۔

ناہید : مجھے تو تمھاری عاشقی پسند ہے۔

انجمن آرا : اجی آپ افتخار کو چھوڑ کر مجھ غریب پر کیوں نظر کرم کر سکتی ہیں۔

گُل رُخ : کوئی آپ کی شکل اور حلیہ دیکھے۔

انجمن آرا : عاشقوں کی شکل اور حلیہ دیکھا نہیں جاتا ورنہ دُنیائے عاشقی میں مجنوں سب کے امام ہیں۔ اُن کی شکل ایسی نورانی اور پاکیزہ تھی کہ لیلیٰ کو بہت پہلے سر پھوڑ کر مر جانا چاہیے تھا۔ اب رہا حیلہ کا سوال تو۔ ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

آج بھی ان کے جسم پر گز بھر کپڑا نہیں مل سکتا۔ اس لیے اگر میں عاشق بنوں تو شکل اور حلیہ میں عاشق اعظم سے کسی طرح کم نہ رہوں گی۔

ناہید : مگر عورتیں عاشق نہیں۔ معشوق ہی ہُوا کرتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ معشوق ہی ہونے پر اکتفا کریں تو بہتر ہے۔

انجمن آرا : یہ تو مردوں نے عورتوں کو ذلیل کرنے کے لیے ہزاروں من گھڑت باتوں کی طرح ایک یہ حماقت بھی کر دی ہے کہ عاشق مرد ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مرد جیسا مطلبی خود غرض، اور بے وفا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لفظ عشق کو بدنام کرے اور عشق کرے۔ یہ سہرا عورت کے پاکیزہ دل و دماغ کا ہی ہے جس کو مردوں نے مارے شوق کے خود اپنے سر سے باندھ لیا ہے۔

ناہید : میرے خیال میں اگر آپ شاعری شروع کر دیں تو اس عالمانہ گفتگو سے زیادہ بہتر ہے۔

انجمن آرا : مجھے شاعر نہیں شعر پسند ہیں۔

گل رُخ : یہ بات تو بیرم خاں کو بھی نوٹ کرانا پڑے گی۔

انجمن آرا : کیوں؟

گل رُخ : اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو بیرم خاں شاعر پسند ہے یا اُن کے اشعار پسند ہیں۔

انجمن آرا : اس سے تمھارا مطلب کیا ہے؟

گل رُخ : اگر تم کو بیرم خاں کے اشعار پسند ہیں تو ان کا ایک خوبصورت سا دیوان تمھارے حوالے کر دیں گے۔

انجمن آرا : اور بیرم خاں کا تم کیا کرو گی۔شاید اس کو پھر اپنے گلے میں ڈالنا چاہتی ہو۔

گل رُخ : خدا نہ کرے۔ابھی خدا خدا کر کے ان سے نجات ملی ہے۔

تم پھر ان کو میرے سر منڈھے دے رہی ہو۔

ناہید : اچھا انجمن ۔ تم ذرا انجمن آرائی کرو۔

انجمن آرا نے حضرت امیر خسرو کی یہ غزل چھیڑ دی۔

غزل

اے صبا باز بمن گوئے کہ جاناں چوں است
آں گل تازہ و آں غنچہ خنداں چوں است

انجمن آرا کی سُریلی آواز۔ حضرت امیر خسرو کا مطلع واقعات قلبی کا بیان، گُل رُخ اور ناہید دونوں ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچ گئیں۔ انجمن آرا نے جو غزل چھیڑی وہ موقع کے اعتبار سے بے مثل تھی۔ ناہید کا محبوب افتخار۔ گُل رخ کا حبیب ابوالقاسم اور خود انجمن آرا کے دل کا شگفتہ پھول بیرم خاں تینوں جنگ پر گئے تھے۔ تینوں لڑکیاں اپنے محبت کرنے والوں کی جُدائی سے بیتاب تھیں۔ اور فراق کے صدمے سہہ رہی تھیں۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ تینوں کے عاشق جنگ پر گئے تھے۔ جہاں انسان کے سروں کا سودا ہوتا ہے۔ لوگوں کی محبتوں کو ذبح کیا جاتا ہے عورتوں کا سہاگ لوٹا جاتا ہے اور جنگ کے شعلوں میں تمام اخلاقی سماجی، مذہبی عظمتوں کو جھونک دیا جاتا ہے۔ ایسے عالم میں سب سے اہم مسئلہ محبوب کی سلامتی کا ہوتا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے صبا مجھے ایک مرتبہ پھر یہ بتا کہ میرا محبوب کس حال میں ہے۔ وہ گل تازہ اور گل خنداں

کس عالم میں ہے۔ کیونکہ تینوں لڑکیوں کے دل ناوک عشق سے فگار تھے تینوں فراق کی گھڑیاں گزار رہی تھیں۔ تینوں کے محبوب جنگ کے شعلوں میں گھرے تھے جن کی ہر لحظہ خیریت معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ہر دل نے یہی سمجھا کہ یہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اور شاعر نے اس کے موجودہ جذبات ہی کو نظم کر دیا ہے۔

گُل رُخ : خدا کے لیے اس مطلع کو پھر پڑھو۔ ہائے اس ظالم نے ہمارے دل کی دھڑکنوں اور ہمارے موجودہ جذبات کو نظم کر دیا ہے۔

ناہید : بہن انجمن آرا یہی مطلع پڑھے جاؤ۔

انجمن آرا : اب وہ شوخ، بیباک اور الھڑ انجمن آرا نہ تھی۔ وہ خود اس کلام سے سب سے زیادہ متاثر نظر آ رہی تھی۔ وہ نہایت ہی غمگین لہجہ میں پڑھ رہی تھی۔

اے صبا باز بہ من گوئے کہ جاناں چوں است
آں گلِ تازہ و آں غنچۂ خنداں چوں است

بڑی دیر تک انجمن آرا اس مطلع کو پڑھتی رہی۔ خزاں نصیب ناہید کی آنکھوں سے اب پھر اشک رواں ہو گئے تھے اور گُل رُخ و انجمن آرا کی پلکوں پر بھی موتی آ کر رُک گئے تھے۔ فضا پر رنج و الم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انجمن آرا نے بہت دیر کے بعد اس غزل کے دوسرے اشعار پڑھے

روز ہا شد کہ دلم رفت و در آں زلف بماند
یارب آں یوسفِ گم گشتہ بہ زنداں چوں است

ہم بہ جان و سرِ جاناں کہ کم و بیش مگوئے

گوہمیں یک سخن راست کہ جاناں چون است

آخری شعر پر پھر کہرام مچ گیا۔ انجمن آرا آخری مصرعہ کو بار بار پڑھتی رہی اور گل رُخ اور ناہید کا اصرار بڑھتا رہا۔

گوہمیں یک سخن راست کہ جانا چون است

بڑی دیر کے بعد یہ غزل ختم ہوئی۔ شاعری نے اپنا سحر توڑا تو انجمن آرا کی زندہ دلی پھر لوٹ آئی۔

انجمن آرا : اگر آج حضرت امیر خسرو زندہ ہوتے تو ضرور خوشی سے دیوانے ہو جاتے۔

گُل رُخ : کیوں ؟

انجمن آرا : اس لیے کہ حضرت امیر خسرو کی اس غزل کو کبھی اتنے خوبصورت دیوانوں نے کاہے کو پڑھا ہوگا۔

گُل رُخ : تم سمجھتی ہو کہ شاید تم ہی اہلِ دل ہو۔

انجمن آرا : تمھارے ہوتے ہوئے۔ میں بھلا یہ دعویٰ کیسے کر سکتی ہوں۔

ناہید : میں بیرم خاں اور ابوالقاسم کے نام سُن رہی ہوں۔ لیکن اب تک مجھ کو یہ نہ معلوم ہُوا کہ آپ دونوں کا ان دونوں سے کیا تعلق ہے ؟

انجمن آرا : یہ تو وہی مثل ہُوئی کہ ساری زلیخا پڑھ گئے۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ زلیخا مرد ہے یا عورت۔

ناہید : خیر کچھ بھی ہو۔ مگر میں تم دونوں کی داستانِ عشق ضرور سنوں گی۔

انجمن آرا: پہلے آپ ہی اپنا قصّہ درد سنائیں۔

ناہید: مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اچھا سنیئے۔ میری داستان ایک غمگین داستان ہے جس میں کہیں بھی مسرت یا شادمانی کی کرن نہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے میرے والد ابراہیم لودھی کی فوج میں پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھے۔ اسی آگرہ میں ہم صاحب عزت اور صاحب حیثیت تھے اور ہمارا شمار امراء میں تھا۔ ابھی میں نے لڑکپن سے جوانی میں قدم نہ رکھا تھا کہ وہ عیش و عشرت کے سب ہنگامے ختم ہو گئے۔ ابا حضور روپوش ہو گئے۔ مکان اور جاگیر ختم۔ میں اور میری والدہ اسی شہر میں بے گھر اور بے در ہو گئے۔ ۵ سال ہم نے خطرناک مفلسی میں گزارے۔ ابا حضور کبھی کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ وہ مغلوں کے باغی تھے۔ اس لیے ادھر اُدھر چھپ کر مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جد و جہد میں مشغول تھے۔ میں ایک باغی لڑکی تھی۔ میں نے جس طرح زندگی گزاری ہو گی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتی ہیں۔ اس مسلسل مفلسی اور فاقہ کشی نے میری والدہ کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد میں اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ میں اکیلی کسی طرح بھی زندگی کے دن نہیں گزار سکتی تھی۔ مجھے ابھی یہاں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ مغلوں اور افغانوں کی جنگ میں افغانوں کو پھر شکست ہوئی اور ابا حضور شہید کر دیے گئے۔ اس خبر کے سنتے ہی میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ایک دن ایک نوجوان مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا اور میری زندگی میں داخل ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے کسی مرد سے

محبت نہ کی تھی۔ وہ میرے باپ کا محسن تھا۔ میرا محسن تھا۔ اُس نے مجھے محبت کے خُوش نما لفظ سے آشنا کیا۔ میرے دل میں عشق کی آگ کو روشن کیا۔ اس نے مجھ پر اکرام پر اکرام اور احسان پر احسان کیے۔ اب میں اُسی شخص کے انتظار میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہی ہوں۔ اب میں تم دونوں سے درخواست کرتی ہوں کہ تم بھی مجھے اپنی داستانِ محبت سُناؤ۔

گُل رُخ : ہم دونوں کی داستانِ محبت دنیا کی عشقیہ داستانوں سے مختلف ہے میرے والد شہزادہ ہندال کے اتالیق تھے اور اس لیے میں قلعہ میں آیا جایا کرتی تھی۔ میرے تعلقات بیگمات کے ساتھ بڑے دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ اسی طرح انجمن آرا کے والد مرزا عسکری کو پڑھانے پر مامور تھے ہم دونوں کی ملاقات قلعہ میں شہزادیوں کے جھرمٹ میں ہوئی۔ شہزادیوں پر انجمن آرا کا جادو خوب چلتا تھا۔ مجھے بھی اس کے زندہ فقرے، جان دار جملے خوبصورت باتیں، چنچل اور شوخ طبیعت اتنی پسند آئی کہ میں نے انجمن آرا کی طرف دوستی کا قدم بڑھایا۔ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے۔ انجمن آرا میرے گھر آجاتی یا میں انجمن آرا کے یہاں چلی جاتی اور پھر ہم دونوں مل کر گلبدن بانو یا شہزادی سلطانہ بیگم کے پاس محل میں چلے جاتے۔ کیونکہ شہزادی گلبدن بانو بڑی مہذب، بڑی پاکیزہ مذاق اور شعر و شاعری کی دل دادہ ہیں۔

ایک دن میں اور انجمن آرا پالکی میں سوار گھر سے گلبدن بانو کے پاس جارہے تھے۔ میرا گھر شہر سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہاں سے ایک غیر آباد

سڑک پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ بڑے اطمینان سے اپنا سفر کہاروں کے کاندھے پر طے کر رہے تھے کہ انجمن آرا نے سامنے کچھ شور وغل سُنا۔ لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ انجمن آرا نے جھانک کر دیکھا تو اُس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ میں نے بھی باہر جھانک کر دیکھا، میں بھی خوف کی وجہ سے کانپنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ ایک مست ہاتھی شہر کی جانب سے چلا آ رہا ہے۔ لوگ اس کے ڈر سے ادھر اُدھر گوشۂ عافیت ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہاتھی نے قیامت مچادی ہے۔ جو چیز سامنے آتی ہے اُس کو سونڈ میں اُٹھاتا ہے اور پاؤں سے روند ڈالتا ہے۔ اُس نے بہت سے پیڑوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ بہت سے آدمیوں کو پاؤں کے نیچے کچل ڈالا۔ اور اب وہ خاک اڑاتا، چیختا، چنگھاڑتا ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ جب وہ ہمارے بالکل سامنے آگیا تو پالکی اُٹھانے والے پالکی زمین پر رکھ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گئے۔ جب ہاتھی نے دُور پالکی پر پڑا ہُوا سُرخ کپڑا دیکھا تو وہ اور بپھرا۔ اور ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اس حیرانی اور پریشانی میں ہم سر و پابرہنہ اپنی جان بچانے کے لیے پالکی سے نکل کر بھاگے۔ اتنی دیر میں ہاتھی پالکی کو اپنی سونڈ میں اُٹھا کر زمین پر پٹک چکا تھا اور اس کے ٹکڑے زمین پر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ اب ہاتھی ہمارے تعاقب میں آگے بڑھا۔ ہم دونوں پوری شدت سے بھاگ رہے تھے۔ لیکن اچانک میرا پاؤں پاجامہ میں اُلجھا اور میں دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ انجمن آرا مجھ سے آگے بھاگی جا رہی تھی جب اُس نے

مجھے یوں زمین پر گرتے ہُوئے دیکھا تو دوڑ کر میرے پاس آئی اور کہا۔ بہن جلدی اٹھو۔ تکلیف اور چوٹ کی پرواہ نہ کرو۔ جان بچانا ضروری ہے۔ لیکن میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ اتنی دیر بھاگنے سے میرا سانس پھول گیا تھا اور اس چوٹ کی وجہ سے میرا تمام جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ انجمن آرا مجھ میں اُٹھنے کی سکت باقی نہیں۔ مجھے چھوڑ دو اور تم دوڑ کر اپنی جان بچاؤ۔

انجمن آرا : نہیں گُل رُخ یہ نہیں ہو سکتا۔ جب زندگی میں ساتھ رہے تو مر کر بھی ساتھ رہیں گے۔ میں نے لاکھ انجمن آرا کی خوشامد کی لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہُوئی۔ ہاتھی اب ہم سے مشکل سے سو قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہم دونوں موت کے خوف سے رو رہے تھے اور لرزہ ہم دونوں کے جسم پر طاری تھا۔ اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ ہماری پشت سے دو سوار آئے۔ انھوں نے اس نازک صورت حال کا فوراً جائزہ لیا۔

پہلا سوار : دوست اس وقت دو کم سن لڑکیاں خطرہ میں ہیں۔ میں اس ہاتھی کو روکتا ہوں۔ تم اس ہاتھی کے پاس جاؤ۔

دوسرا : نہیں میں ہاتھی کو روکتا ہوں۔ آپ پیچھے رہیں۔

پہلا : تم ہر وقت بحث کرتے ہو۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔

یہ کہہ کر وہ سوار آگے بڑھا اس کے پیچھے دوسرا سوار بھی بڑھا۔ اُس نے کہا ہم دونوں مل کر ہاتھی کو ہلاک کر دیں گے دونوں نے تلواریں

میان سے کھینچ لیں اور ہمارے اور ہاتھی کے بیچ میں آ کر کھڑے ہوگئے۔ ہم لوگ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے لیکن اب امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ ہم نے سمجھا کہ خدا نے دو فرشتے ہماری امداد کے لیے بھیج دیے ہیں۔ ہاتھی نے جب سواروں کو دیکھا تو چنگھاڑتا ہوا ان کی جانب بڑھا۔ اُس نے اپنی سونڈ بڑھائی اور پہلے سوار کو معہ گھوڑے کے اٹھانے کی کوشش کی۔ گھوڑا الف ہوگیا اور سوار نے بڑی مشکل سے اس پر قابو پا کر اسے روکا اور کاوے پر ڈال دیا اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس نے پینترا بدل کر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ۔ ہاتھی کی سونڈ پر مارا۔ تلوار نے پہاڑ کے اس حصہ کو کاٹ کر پھینک دیا۔ اب ہاتھی نے انتہائی غیض وغضب کے عالم میں اس سوار پر حملہ کیا اور اس کو کچل دینا چاہا اور قریب تھا کہ سوار اور گھوڑا ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آجاتے کہ دوسرے سوار نے بڑھ کر ہاتھی کے ماتھے پر پوری شدت سے بھالا مارا۔ یہ بھالا اس طاقت سے مارا گیا کہ ہاتھی کی پیشانی میں پیوست ہوگیا اور وہ پیچھے کی جانب بے ساختہ چنگھاڑتا ہوا بھاگا اور کچھ دُور جا کر یہ پہاڑ ایک مرتبہ جھکا اور دھم سے زمین پر گر گیا۔

اب ہم دونوں کی جان میں جان آئی۔ ذرا ہوش وحواس درست ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں نوجوان ہمارے سر پہ کھڑے تھے۔ ہم کو اب اپنی حالت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے سر کھلے تھے۔ دوپٹے ہمارے سینوں سے ڈھلکے ہوئے تھے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور جگہ

جگہ سے ہمارا جسم کھلا ہوا تھا۔ ہم دونوں جلدی سے اُٹھے اور دوپٹے ٹھیک کرکے ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ انجمن آرا نے کہا۔

انجمن آرا : میں اور میری بہن گل رُخ آپ دونوں کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ حضرات نے ہماری جان بچائی۔

سوار : یہ تو ہمارا اخلاقی فرض تھا۔ اس میں شکریہ کی کیا ضرورت ہے۔

انجمن آرا : کیا میں اپنے محسنوں کا نام دریافت کر سکتی ہوں۔

سوار : ضرور۔ میرا نام بیرم خاں ہے اور یہ میرے دوست ابوالقاسم ہیں۔

انجمن آرا نے پہلی ہی نظر میں بیرم خاں کا جائزہ لیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیرم خاں کا رنگ گورا۔ قد و قامت متوسط۔ اعضا متناسب چہرہ پر جواں مردی۔ شرافت، نیک نیتی۔ اور اولوالعزمی کے نقوش نمایاں ہیں۔ انجمن آرا پہلی نظر میں۔ بیرم خاں کی محبت میں گرفتار ہوگئیں۔ لیکن بیرم خاں نے انجمن آرا کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہ کی۔ بلکہ میری جانب متوجہ ہوگئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا" آپ کا نام گل رُخ ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بیرم خاں نے کہا۔ آپ کے چوٹ لگی ہے اور آپ کے پاس سواری کا کوئی بندوبست نہیں۔ ہم ابھی آپ کو آپ کے گھر تک پہنچائے دیتے ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ انجمن آرا اس تمام عرصہ میں بیرم خاں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن۔ بیرم خاں مجھ ہی سے مخاطب رہے۔

لیکن میری نظریں ابوالقاسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے یہ شکیل و وجیہہ انسان بے حد پسند آیا۔ اُس نے مجھ سے بڑی پیاری پیاری باتیں کیں اور بڑی دیر تک میری دل جوئی کرتا رہا۔ میں ابوالقاسم کو اسی وقت اپنے ذہن کی گہرائیوں اور قلب کی کیفیتوں کا مرکز بنا چکی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ابوالقاسم کی نگاہیں کسی اور کا تعاقب کر رہی ہیں۔ فوراً پالکی کا انتظام ہُوا اور ہم دونوں اس پر سوار ہو کر گھر پہنچ گئے۔ اس حادثہ کی خبر سُن کر سارے عزیز و اقارب اکٹھے ہو گئے۔ سب نے ان خوبصورت نوجوانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ہر شخص ان دونوں کی جرأت اور بہادری کی تعریف کر رہا تھا۔ ہم لوگ زنان خانہ میں چلے گئے۔ فوراً حکیم صاحب آئے اور مرہم پٹی کی۔ دونوں جوان تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ لیکن ابوالقاسم میرے دل میں محبت کی آگ لگا کر چل دیے۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو اپنے لیے منتخب کیا۔ لیکن سب نے اپنا جُداگانہ انتخاب کیا۔ لیکن دوسرے کے جذبات و خیالات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس دلچسپ حماقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم چاروں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن ہمارا زاویۂ فکر بالکل جُدا تھا۔ ہماری صورت یہ تھی کہ :

گُل رُخ : ابوالقاسم سے

ابوالقاسم : انجمن آرا سے

انجمن آرا : بیرم خاں سے

اور بیرم خاں۔ گُل رُخ سے محبت کرتے۔ اس عجیب حادثہ کا یہ انجام

ہُوا کہ ہم ایک طویل عرصہ تک ایک دوسرے کو بناتے رہے اور اس سے بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ لیکن آخر میں ابوالقاسم نے یہ محسوس کیا کہ انجمن آرا میرے بجائے بیرم خان سے محبت کرتی ہے اور گل رُخ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے تو انھوں نے اپنا زاویۂ نظر بدلا اور میری طرف متوجہ ہُوئے جب بیرم خاں کو یہ معلوم ہُوا کہ ابوالقاسم اور گل رُخ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان کو بڑی سخت مایوسی ہُوئی اور انھوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ابوالقاسم کے لیے یہ قربانی کی کہ خود میدان سے ہٹ گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اب کبھی عشق و محبت کے چکر میں نہ پڑیں گے۔ لیکن ہم لوگ اتنے بلند اور اتنے اچھے آدمی کو بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ خصوصاً ہماری بہن انجمن آرا تو اس فیصلہ سے بے حد خوش ہُوئیں۔ انھوں نے عشق کے میدان کو خالی پاکر سرپٹ گھوڑے دوڑانا شروع کر دیے اور حالانکہ بیرم خاں غریب بہت بھاگتے رہے۔ لیکن ان کو اپنی زد میں لے لیا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ بیرم خاں پھر سر کے بل کوچۂ عشق میں آگئے ہیں۔ ہم لوگ ابھی انھیں ہنگاموں میں پھنسے ہُوئے تھے کہ شہنشاہ ہمایوں گجرات چلے گئے اور ہم یہاں ان کی واپسی کا انتظار کرنے کے لیے اکیلے رہ گئے۔

ناہید : واقعی تم دونوں کی داستانِ عشق بڑی انوکھی اور دلچسپ ہے۔

گل رُخ : میں کبھی فرصت میں ہوں گی تو تم کو سناؤں گی کہ اس تماشہ میں کتنا لطف رہا۔ کتنے آنسو اور کتنی آہیں صرف ہُوئیں۔ اور

کتنی بدگمانیاں پیدا ہوئیں ۔ لیکن جس طرح بیرم خاں اور ابوالقاسم کی دوستی ایک مثالی دوستی ہے اسی طرح انجمن آرا کی دوستی کا بھی جواب نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی پیچیدہ گتھی اس خوبصورتی سے سُلجھ گئی۔ تم کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ انجمن آرا نے بیرم خاں کا نام فیل افگن رکھا ہے۔

ناہید : خوب فیل افگن اچھا نام ہے۔

انجمن آرا : بہن جب کوئی شخص شیر کو مارتا ہے تو اس کو شیر افگن کہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں شیر سے زیادہ دشوار کام مست ہاتھی کا مارنا ہے۔ اس لیے اس مجاہد کو فیل شکن یا فیل افگن کہا جائے تو کیا بُرا ہے۔؟

یہ لوگ اسی قسم کی گفتگو میں مشغول تھے کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ کنیزوں باندیوں، اور خادماؤں کے جھرمٹ میں یہ حسین قافلہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ دستر خوان بچھایا گیا اور اس پر انواع و اقسام کے کھانے چُن دیے گئے۔

ابھی ناہید نے بسم اللہ کہہ کر پہلا لقمہ ہی اُٹھایا تھا کہ ایک کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور گھبرائی ہوئی سی ناہید کے سامنے خاموش کھڑی ہوگئی۔

ناہید اُس کی اس حالت کو دیکھ کر سخت متعجب ہوئی اور پوچھا۔ کیا بات ہے ؟

کنیز : حضور وہ شاہی رسالہ

ناہید : کیسا شاہی رسالہ ۔ آخر تم منہ سے کیوں نہیں بولتی۔

کنیز: میں کہہ رہی تھی کہ شاہی رسالے کے سپاہی آئے ہیں۔

ناہید: پھر کیا ہُوا؟

کنیز: وہ آپ کے ابا حضور۔

ناہید کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ پڑا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اُس نے پوچھا۔

ناہید: کیا ہُوا ابا حضور کو۔

کنیز: حضور آپ کے ابا حضور لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے۔ سپاہی ان کو لے کر آئے ہیں۔

ناہید: کمبخت جلدی سے ابا حضور کو زنان خانہ میں لے کر آ۔

یہ خبرِ وحشت اثر سُن کر گل رُخ اور انجمن آرا نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لیکن ناہید نے انھیں قسمیں دلا کر دستر خوان پر بٹھایا اور خود جا کر ڈیوڑھی پر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں گھر سے چارپائی گئی۔ صفدر خاں کو سپاہیوں نے بڑے آرام سے پلنگ پر لٹا دیا۔ اور پلنگ لے کر زنان خانہ کی طرف بڑھے۔ ناہید نے جب والد کو اس طرح گھر میں آتے دیکھا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے ہی سپاہی رخصت ہوئے وہ دوڑ کر اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

ناہید: ابا حضور۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ ہائے آپ کتنے کمزور ہو گئے۔ ہائے اب آپ اُٹھنے بیٹھنے کے بھی قابل نہیں۔

صفدر خاں: بیٹی۔ لڑائی میں میرے کئی زخم آ گئے تھے۔ اس

سے خون کے نکل جانے سے میں کمزور ہو گیا۔ اب انشاء اللہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔

ناہید نے فوراً حکیم صاحب کو طلب کیا اور خود صفدر خاں کو ایک نہایت آرام دہ مسند پر لٹا دیا۔ اتنی دیر میں گل رُخ اور انجمن آرا بھی کھانے سے فارغ ہو کر برابر والے کمرے میں آگئیں، اور صفدر خاں کی حالت پوچھی۔

گُل رُخ : ناہید۔ اپنے ابا حضور سے یہ پوچھیے کہ جنگ کب ختم ہو گی۔

صفدر خاں : بیٹا جنگ ختم ہو گئی ہے اور شاہی لشکر ہفتہ عشرہ میں آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ سُن کر دونوں کے گلاب جیسے چہرے شگفتہ ہو گئے۔ سب نے لڑائی کے ختم ہونے کی ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔

گُل رُخ اور انجمن آرا ناہید سے گلے مل کر رخصت ہوئیں اور ناہید اپنے باپ کی تیمار داری میں مشغول ہو گئی۔

باب ۱۴

صفدر خاں کی وفات

صفدر خاں کو جنگ سے آتے ہُوئے دس دن گزر گئے تھے۔ ناہید بذاتِ خود اپنے باپ کی تیمار داری میں مشغول تھی لیکن صفدر خاں کی طبیعت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ان کی کمزوری میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ بالکل بستر سے لگ گئے۔ ناہید اپنے والد کو اس نازک حال میں دیکھتی اور آنسو بہاتی رہتی تھی۔ بہتر سے بہتر حکیم علاج پر متعین تھے۔ رات رات بھر ناہید خود بیٹھ کر اپنے شفیق باپ کی تیمار داری کرتی۔ لیکن جتنی دوا زیادہ ہو رہی تھی۔ اس شدت سے صفدر خاں کا مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ صفدر خاں کو اپنی اس حالت کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ روزانہ ناہید سے پوچھتے۔ میرا بیٹا افتخار آگیا۔ کوئی قاصد آیا یا نہیں۔ شہنشاہ ہمایوں کب آرہے ہیں۔ فوجیں کب واپس ہو رہی ہیں اور ناہید ہر بار آنسو پونچھتے ہُوئے ایک ہی جواب دیتی۔ نہیں ابا حضور ابھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔

ایک دن صفدر خاں جب صبح کو اُٹھے۔ تو اُن کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ انھوں نے ناہید سے کہا۔ بیٹی مجھے ذرا سہارا دے تاکہ میں جا کے نماز

جاکر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت کرسکوں۔

صفدر خاں کو جائے نماز پر پہنچا دیا گیا۔ وہ بڑی دیر تک اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہے۔ پھر ایک نظر باغ کو دیکھا۔ وہ ایک کمروں میں آہستہ آہستہ سہارے سے گئے اور چیزوں کو دیکھتے رہے آخر میں انھوں نے ناہید سے کہا۔

صفدر خاں : ناہید۔ اب میں بالکل اچھا ہو گیا ہوں۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ وہ بھی دُور ہو جائے گی۔

ناہید اپنے والد کی طبیعت میں یہ انقلاب دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد صفدر خاں اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ ان کو چلنے سے کچھ تکان ہو گئی تھی۔ ناہید بھی اپنے والد کے سرہانے بیٹھ گئی۔

صفدر خاں نے کہا : ناہید اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے تم میری ان چند باتوں کو غور سے سُنو۔

ناہید : ابا حضور آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اب آپ خدا کے فضل سے پہلے سے بہت اچھے ہیں۔

صفدر خاں : نہیں بیٹی۔ ناہید مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے اپنی حالت کا خوب اندازہ ہے۔ بٹیا بہتر تو یہی تھا کہ میں چلتے وقت تیرا ہاتھ کسی افغان کے ہاتھ میں دیتا۔ مگر حالات اس کے متقاضی نہیں۔ ابھی تک افغانوں کا مستقبل تاریک ہے۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ افغان قوم پھر شیر خاں یا کسی اور افغان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر اپنی آزادی کے لیے

جد و جہد کریں گے یا نہیں۔ اور یہ کہا نہیں جا سکتا۔ کہ وہ مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب بھی ہوں گے یا نہیں۔ بیٹی عمر بھر مغلوں سے نفرت کرنے والے اور ان سے جنگ کرنے والے کی قسمت میں آخری وقت میں سلطنت مغلیہ کی غلامی لکھی تھی۔ بیٹی جمال خاں کا بھی کوئی پتہ نشان نہیں۔ اس کمبخت نے کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ کاش وہ ہوتا مگر۔ اب کیا ہوتا ہے۔ وقت گزر گیا اور گزر جائے گا۔ اب کوئی بھی ایسا نہیں جس کو تو اس دنیا میں اپنا کہہ کر پکار سکے۔ میں تمہارے لیے افتخار مرزا کو منتخب کر چکا ہوں۔ کہو بیٹی تم کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض تو نہیں۔

ناہید : ابا حضور۔ میں حضور کے حکم اور خوشی کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہوں۔

صفدر خاں : بیٹی۔ افتخار بہت اچھا آدمی ہے۔ اگر اُس کے ہم پر احسانات نہ بھی ہوتے تب بھی وہ اتنا نیک اور شریف تھا کہ میں تمہارا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے فخر محسوس کرتا۔ اب تو اس نے ہم دونوں پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ ہماری گردن خم ہو گئی ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو تم کو اختیار ہے کہ اس کو اپنا بنا لینا۔

ناہید : ابا حضور۔ آپ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ میرا سینہ غم و الم سے پھٹا جاتا ہے۔ آپ یہ تو بتایے کہ مجھے اس عالم غربت میں کس پر چھوڑ جائیں گے۔ نہ میری ماں زندہ ہے۔ نہ کوئی عزیز اقربا۔ نہ کوئی بھائی بہن۔ نہ رشتہ دار۔ آخر میں کس طرح تنہا اپنی زندگی کے دن گزاروں

گی۔ ابا حضور آج آپ کی طبیعت میں بہت افاقہ ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ چند دن میں آپ مکمل تندرست ہو جائیں گے۔

صفدر خاں : بیٹی میں تم کو خدا کے سپرد کر رہا ہوں۔ وہی بے سہاروں کا سہارا ہے۔ وہی خالقِ کُل ہے۔ وہی رب العالمین ہے۔ وہی سب کا آسرا ہے۔ اسی سے لَو لگاؤ اُسی کو مدد کے لیے پکارو۔

ناہید : ابا حضور۔ خدا کے لیے آپ ان باتوں کو ختم کر دیجیے۔

صفدر خاں : بیٹی انسان دنیا کی دلچسپیوں میں گُم نہیں ہوتا۔ اُس کو ہر وقت اپنی حقیقت کا علم رہتا ہے۔ دُنیا میں جو شئے خلق ہوتی ہے سب کو فنا ہونا ہے ۔

اول و آخر فنا۔ ظاہر و باطن فنا

بیٹی، موت ایک زبردست طاقت اور ایک زندہ حقیقت ہے۔ زندگی مواصلت روح و بدن کا دوسرا نام ہے۔ اور موت۔ مفارقت روح و بدن ہے۔ جب انسان کے جسد بے جان میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ تو یہی مٹی کا پُتلا اشرف المخلوقات بن جاتا ہے۔ اس کے اندر چلنے پھرنے، بات چیت کرنے اور خصوصاً فکر کی بلندیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ قدم قدم پر ہنگامے برپا کرتا ہے۔ ہر وقت شور قیامت مچاتا ہے اور اتنا بھاگتا دوڑتا ہے کہ اپنے آگے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا۔ کہیں یہ فرعون بن کر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور کہیں ہلاکو اور چنگیز بن کر انسان کے خون کو اپنے اوپر حلال اور جائز کر لیتا ہے۔ اور کہیں سکندر اعظم بن کر دنیا کو

فتح کرنے کے لیے بڑھتا ہے۔ ان کی ہمت اور جرأت کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کی صلاحیتیں بے پناہ ہیں۔ اس کی فتوحات کا دائرہ نہایت ہی وسیع اس کے خیالات بے پایاں۔ یہ روانی میں دریاؤں کو شرماتا ہے۔ یہ کائنات کو مسخر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے ہواؤں اور سمندر کی موجوں پر اپنا تسلط جما لیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ زمین کے سینے کو شق کرنے اور وہاں سے لعل بے بہا نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن جس لمحہ روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو یہی جسم بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ وہی آنکھیں ہوتی ہیں۔ لیکن دیکھ نہیں سکتیں۔ وہی کان ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو ہلا تک نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اس کو دوسرے اٹھائیں۔ دوسرے نہلائیں اور دوسرے اپنے کاندھے پر قبرستان تک لے جا کر اس کی منزل آخر پر چھوڑ آئیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں انسان سراپا مجبور و بے کس نظر آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شہنشاہ اپنے تخت سے اُتر جاتا ہے اور مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ یہ حکومت، یہ شوکت، یہ خدم و حشم، یہ جاہ و جلال سب خاک میں مل کر رہ جاتے ہیں۔ بیٹا میرا وقت آخر قریب ہے۔ یہ وقت سب کو آنا ہے۔ اس سے انسان کو ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔

اچانک نقارے بجنے اور توپیں سر ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور ایک کنیز بھاگی بھاگی ناہید کے پاس آئی۔

ناہید: آج یہ توپیں کیسی چھوٹ رہی ہیں؟

کنیز: بیگم صاحبہ شہنشاہ معظم ہمایوں گجرات کے بادشاہ کو شکست دے

کر خوشی کے شادیانے بجاتے اور فتح وظفر کے پھریرے اُڑاتے دارالخلافہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اہلِ شہر شہنشاہ ہمایوں کی پیشوائی کے لیے شہر سے باہر گئے ہیں۔ بازار سجائے گئے ہیں اور شہر میں چراغاں کا انتظام ہے۔ شاہی لشکر کچھ دیر میں شہنشاہ معظم کی معیت میں شہر میں داخل ہونے والا ہے۔

صفدر خاں : ناہید کیا فوج واپس آگئی؟

ناہید : جی ہاں۔ ابا حضور۔

صفدر خاں : افتخار نہیں آیا؟

ناہید : آتے ہی ہوں گے

ناہید کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے افتخار کے متعلق سوچنے لگی دوسرے ہی لمحہ جب اس کی نظر اپنے ضعیف و بیمار باپ کے چہرے پر پڑی تو وہ پھر افسردہ ہوگئی۔ پھر بھی وہ اشتیاقِ دید میں دروازے پر جاکر کھڑی ہو جاتی۔ لیکن جب باپ کے کراہنے کی آواز اس کے کانوں میں بجتی تو وہ دوڑ کر باپ کے سرہانے آ جاتی۔

تھوڑی دیر میں فوج اپنے تمام خدم وحشم اور جلال وجمال کے ساتھ شہر میں داخل ہوئی۔ سب سے آگے ایک فوجی بینڈ تھا۔ جو ہر سننے والے کے دل میں ایک عجیب ولولہ، جوش، خوشی اور مسرت پیدا کر رہا تھا۔ اس کے بعد خاص شاہی رسالہ نہایت ہی نفیس گھوڑوں پر سوار تھا۔ جن پر مرصع زینیں تھیں اور جن کا لباس نہایت قیمتی تھا۔

اس کے بعد شہنشاہ ہمایوں، ایک ہاتھی پر جس میں سونے کی عماری رکھی ہوئی تھی۔ جلوہ فگن تھے۔ ہاتھی کو طرح طرح کی جھولوں اور دوسری چیزوں سے سجایا گیا تھا۔ شہنشاہ کے پیچھے امراء، وزراء، علماء، ومشائخ اور دوسرے منصب دار گھوڑوں پر سوار تھے۔ اس کے پیچھے عام فوج تھی۔ اس کے بعد بار برداری کا سامان گھوڑوں، اونٹوں اور ہاتھیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو جنگی سازوسامان اور خیموں و خرگاہ وغیرہ کو اُٹھائے ہوئے تھے ہزاروں لوگ دورویہ قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پھول تھے اور وہ فرطِ عقیدت سے پھول لٹا رہے تھے عورتیں اور بچے۔ چھتوں پر بیٹھ کر پھولوں کی بارش کر رہے تھے اور ہر طرف خوشی و مسرت کا دور دورہ تھا۔ شہنشاہ ہمایوں اس شان و شوکت سے شہر میں داخل ہو رہے تھے اور رعایا فرطِ عقیدت سے بچھی جا رہی تھی۔ شہنشاہ ہمایوں کی سواری ناہید کے گھر سے گزری ناہید دریچے سے لگی کھڑی تھی اس نے دیکھا کہ افتخار مرزا نے دریچہ کی جانب تجسس نظریں ڈالیں اور اشارہ کیا۔ دونوں کی نگاہیں دور سے ٹکرائیں اور اپنے اپنے مقام پر واپس آگئیں۔

ناہید ابھی صفدر خاں کے پاس بیٹھی اُس کو فوج کی واپسی کی تفصیل سُنا رہی تھی کہ اچانک صفدر خاں کو ایک قے ہوئی۔ ناہید نے دیکھا کہ اس میں تھوڑا سا خون شامل ہے۔ اس کے بعد اس کو دوسری قے ہوئی۔ یہ سب خون تھا اس قے کے ساتھ صفدر خاں کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ ادھر ناہید کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس نے جلد ہی حکیم صاحب کو بُلوایا اور اپنے باپ کے

سرہانے بیٹھ کر اپنی بیکسی پر آنسو بہانے لگی۔

ابھی اس واقعہ کو ایک گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ افتخار مرزا فوجی لباس زیب تن کیے۔ گھر میں داخل ہُوا۔ وہ انتہائی رومانی موڈ میں تھا۔ وہ راستہ بھر یہی سوچتا چلا آرہا تھا کہ ناہید اس طرح بڑھ کر اس کا استقبال کرے گی۔ جب وہ جائے گا تو ناہید سراپا انتظار ڈیوڑھی پر کھڑی ہوگی۔ لیکن مکان میں قدم رکھتے ہی خوفناک خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ افتخار مرزا کا ماتھا ٹھنکا۔ نوکر چاکر سب خاموش۔ اُداس اور سر جھکائے ہُوئے تھے۔ اُس نے فوراً ایک کنیز سے پوچھا۔

افتخار مرزا : کہو ناہید بی بی کیسی ہیں۔؟

کنیز : ناہید بی بی اچھی ہیں۔ لیکن اُن کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے۔

یہ سُنتے ہی افتخار مرزا زنان خانہ کی طرف لپکا۔ راستہ میں اُس کو حکیم صاحب سر جھکائے نکلتے ہُوئے ملے۔ افتخار مرزا کو دیکھتے ہی حکیم صاحب تعظیم کے لیے جُھک گئے۔

افتخار مرزا : حکیم صاحب، صفدر خاں کی طبیعت کیسی ہے ؟

حکیم صاحب : حضور وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اُن کی دوا کا نہیں بلکہ دُعا کا وقت آگیا ہے۔

افتخار مرزا : نہیں۔ حکیم صاحب آپ کو صفدر خاں کو بچانا ہوگا۔ آپ کوئی بھی تدبیر کریں مگر اُن کو بچا لیجیے۔

حکیم صاحب : حضور جو کچھ میرے بس میں تھا۔ میں کر چکا۔ مشیت

کے آگے انسان بے بس و لاچار ہے۔ ہمارا علم اس سے زیادہ ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا۔

افتخار مرزا: اب کوئی امید نہیں۔

حکیم صاحب: خدا بڑا قادر ہے۔ وہ مُردے میں جان ڈال سکتا ہے۔ شاید وہ ان کو اچھا کر دے۔

افتخار مرزا یہ سُنتے ہی دوڑتا ہُوا صفدر خاں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ گھر کی تمام کنیزیں، باندیاں، لونڈیاں اور اور خادمائیں خاموش صورت نقش بدیوار کھڑی ہیں۔ صفدر خاں بے حس وحرکت پلنگ پر پڑے تھے اُن کی سانس برائے نام چل رہی تھی۔ اور ناہید تصویرِ غم بنی ہُوئی کبھی باپ کی پیشانی چھوتی تھی اور کبھی نبض دیکھتی تھی۔ کبھی ابا حضور۔ ابا حضور کہہ کر پکارتی ہے اور پھر رونا شروع کر دیتی ہے۔ افتخار مرزا کے آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے خاموشی میں ایک زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ افتخار نے بڑھ کر صفدر خاں کی پیشانی کو چھُوا۔ پھر اُن کی نبض دیکھی۔ پھر ناہید سے پوچھا۔

افتخار مرزا: ان کی یہ حالت کب سے ہو گئی؟

ناہید نے روتے ہُوئے جواب دیا: ابا حضور صبح سے بالکل ٹھیک تھے۔ انھوں نے خلاف معمول خود وضو کیا اور خود نماز پڑھی۔ اس کے بعد بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ جب شاہی فوج ادھر سے گزر رہی تھی تو ان کو بڑی خُوشی تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ان کو ایک خون کی قے ہُوئی۔ جب ہی سے ان پر غفلت طاری ہے۔ اب تو وہ نہ بولتے ہیں نہ

آنکھیں کھولتے ہیں۔ ہائے میرے ابا حضور کو کیا ہو گیا۔

ناہید کی گفتگو سے افتخار مرزا کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ تمام خادمائیں بھی آہستہ آہستہ رو رہی تھیں۔

افتخار مرزا صفدر خاں کے سرہانے بیٹھ گئے۔ صفدر خاں کو لخلخا سنگھایا گیا۔ صفدر خاں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور نحیف آواز میں پوچھا۔

صفدر خاں: ناہید افتخار آیا۔

افتخار مرزا: جی ہاں میں آ گیا ہوں۔

صفدر خاں: آؤ بیٹا۔ میں تمہارا ہی منتظر تھا۔ یہ روح تمہاری وجہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ افتخار میرے قریب آؤ۔

افتخار مرزا صفدر خاں کے بالکل قریب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی مدھم آواز میں ناہید کو پاس بلایا۔ اور کہا۔ بیٹی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔

ناہید نے اپنا ہاتھ اپنے باپ کے ٹھنڈے اور بے حس ہاتھ میں دے دیا۔ صفدر خاں نے ناہید کا ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے افتخار کے ہاتھ میں دیا اور کہا:

میں اپنی یتیم بچی کو تمہارے .... اس کے بعد صفدر خاں کے لب کچھ دیر تھرتھرائے۔ اُن کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ منکا ڈھل گیا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے ایک ہچکی آئی اور وہ عالم آب و گل سے عالم ارواح میں پہنچ گئے۔

ناہید باپ کے اوپر گر پڑی اور پچھاڑیں کھانے لگی۔ ابا حضور ابا حضور۔ آپ مجھے کس پر چھوڑ گئے۔ کیا آپ اپنی ناہید سے خفا ہو گئے۔ ابا حضور آنکھیں کھولیے۔ دیکھیے آپ کی ناہید رو رہی ہے ابا حضور اٹھیے۔ دیکھیے کون آیا ہے۔ ابا حضور نہ جائیے۔ خدا کے لیے اکیلے نہ جائیے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے۔ ناہید نے اپنا سر پٹی سے دے مارا۔ سارا سر لہو لہان ہو گیا۔

افتخار مرزا نے ایک چادر صفدر خاں کو اڑھا دی اور ناہید کو جو اب نیم غشی کے حالت میں پڑی تھی۔ اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ گھر میں کہرام مچا تھا۔ نوکر چاکر، کنیزیں سب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انجمن آرا اور گل رُخ بھی آ گئی تھیں۔ ناہید کبھی غشی سے چونکتی اور پھر ابا حضور کہہ کر چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی اُس کے بَین سُن کر سارا گھر ماتم کدہ بنا ہُوا تھا۔

افتخار مرزا ناہید کو سمجھا رہے تھے۔ ناہید صبر کرو۔ تمہارے والد ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں، جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ اگر ان کو خُوش کرنا ہے تو اِن کے لیے کارِ خیر کرو۔

دُوسرے دن صفدر خاں کی لاش پورے فوجی اعزاز سے اٹھائی گئی۔ جنازے میں ہزاروں فوجی اور اہلِ شہر شریک تھے صفدر خاں کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہی باغ میں سپرد قبر کر دیا گیا۔

باب ۱۵

جمال خاں کی شرارت

بادشاہ ہمایوں کے آگرہ پہنچنے کے بعد شہزادہ مرزا ہندال شیخ پھول اور دیگر امراء اپنی مہم سے واپس آکر چند روز کے بعد دربارِ شاہی میں پیش ہوئے۔ شہنشاہ ہمایوں نے اُن کا بہت شاندار استقبال کیا۔ شہزادہ اور اُس کے دوسرے ساتھیوں کو طرح طرح کے خلعتوں سے سرفراز کیا۔ شہنشاہ مہا سلطان مرزا کی مہم سر کرنے کے سلسلہ میں ان لوگوں سے بہت خُوش تھے۔ شہنشاہ ہمایوں اپنے بھائی مرزا ہندال کی وفاداری سے اس درجہ خُوش ہُوا کہ اس کی شادی بھی کر دی۔ اس شادی میں شہنشاہ نے اتنی دلچسپی لی اور اس دھوم دھام سے جشن منایا کہ اہلِ شہر اس جشن کو بڑے عرصہ تک نہ بھول سکے۔ طلسمی مکان میں جشن کے دن شہنشاہ نے سب کو حکم دیا کہ سب لوگ سا یحق کے تحفے لائیں۔ چنانچہ شہنشاہ کے حکم کے بموجب جب سب لوگ تحفے لے کر آئے تو ظلِ سبحانی نے حکم دیا کہ سا یحق کے تین حصے کرو۔ چنانچہ تین خوان اشرفی اور چھ خوان شہ رخی کے ہُوئے۔ آپ نے ایک خوان اشرفی اور دو خوان شہ رخی کے ہندو بیگ کو دیے اور کہا کہ یہ حکومت کا حصہ ہے۔ اسے

شہزادوں امراء وزراء میں بانٹ دو اور دو خوان شہ رخی اور ایک خوان اشرفی ملا محمد کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ حصۂ سادات ہے۔ اسے اکابرین شرفا، علماء، شعراء، مشائخ درویشوں میں تقسیم کر دو۔ اور ایک خوان اشرفی اور دو خوان شہ رخی کے متعلق فرمایا کہ یہ حصہ مراد ہے۔ یہ ہمارا ہے اسے ہمارے روبرو پیش کرو۔ چنانچہ تینوں خوان پیش کیے گئے۔ شہنشاہ مکرم نے کہا کہ اس کو گننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اپنا دستِ مبارک بڑھا کر کچھ اشرفیاں اپنی مٹھی میں لیں اور فرمایا کہ ایک خوان اشرفی اور ایک خوان شہ رخی بیگمات کے پاس لے جاؤ۔ وہ سب اس میں سے ایک ایک مٹھی لے لیں۔ اور باقی دو خوان شہ رخی اور ایک خوان اشرفی جس میں پانچ ہزار کے قریب اشرفیاں اور پندرہ بیس ہزار چاندی کے سکے تھے۔ ان کو اپنے ہاتھ سے لٹا دیا۔ ہر ایک کے حصے میں سو سو اشرفیاں اور کئی کئی سو دوسرے سکے آئے اور جو لوگ حوض پر تھے ان کو اور بھی زیادہ ملے۔

مرزا ہندال کی دلہن کا نام سلطانہ بیگم تھا۔ اور یہ سید مہدی خواجہ کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ سلطانہ بیگم کی عمر دو سال کی تھی کہ آکا خانم نے انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ وہ سلطانہ بیگم سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اُنھوں نے سلطانہ بیگم کی شادی خود اپنے اہتمام سے کی اور جہیز میں سلطانہ بیگم کو ۹ گلے کے جڑاؤ ہار، ایک چارقب، چار تکمہ دار صدریاں، ایک جوڑی لعل کی بالیاں، ۹ گھوڑے مع مرصع زین، ۹ روسی حبشی غلام اور تین زنجیر ہاتھی دیے۔ اس کے علاوہ سید مہدی خواجہ اور شہنشاہ ہمایوں نے جہیز میں بے پناہ

چیزیں دیں۔ ایک ہفتہ شہر میں جشن رہا ..... چراغاں ہُوا غریبوں کو کھلایا گیا اور اس جشن کی خُوشی میں ایک مہینہ تک نوبت و نقارے بجتے رہے۔

اس عرصہ میں شہنشاہ نے مرزا عسکری کو سنبھل کا حاکم مقرر کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ مہا سلطان مرزا اور اُس کے بیٹوں کا تعاقب اُس وقت تک کرتے رہیں جب تک ان کو زندہ یا مُردہ شکل میں دربار میں نہ پیش کیا جائے۔

شہزادہ عسکری مرزا نے شہنشاہ سے عرض کیا کہ مجھے اس کام کے لیے ایک نہایت ہوشیار اور لائق انسان کی ضرورت ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : تم جس کو چاہو اس مہم کے لیے منتخب کر سکتے ہو۔

شہزادہ عسکری : اگر آپ کچھ عرصہ کے لیے افتخار مرزا کو میرے ہمراہ بھیج دیں تو یہ کام بخوبی انجام پا جائے گا۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار مرزا کا آگرہ میں قیام بہت ضروری تھا مگر چونکہ ہم نے پہلے وعدہ کر لیا تھا اس لیے ہم اس مہم کے لیے افتخار مرزا کو تم کو دے رہے ہیں۔

یہ خبر تمام آگرہ میں پھیل گئی کہ مہا سلطان مرزا کی مہم سر کرنے کے لیے شہنشاہ ہمایوں نے افتخار مرزا کا انتخاب کیا ہے۔ اور وہ جلد شہزادہ عسکری مرزا کے ہمراہ چلے جائیں گے۔

جب افتخار مرزا نے یہ سُنا تو اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کے لیے یہ حکم نہ تھا، موت کا پیغام تھا۔ اب وہ پہلے والا افتخار مرزا نہ تھا کہ شہنشاہ ہمایوں کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنا خون بہانے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس کو

جتنی سخت مہم اور جتنے ذمہ داری اور وفا داری کے کام پر لگایا جاتا۔ اتنا ہی وہ خوش ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ تنہا نہ تھا۔ بلکہ ناہید بھی اس کے ساتھ تھی۔ اور اس کا ہاتھ اُس کے باپ نے مرتے وقت اُس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ افتخار مرزا نے شادی و غم کا یہ عجیب امتزاج دیکھا تھا۔ جب سارا شہر اور خود افتخار شہزادہ ہندال کا جشن شادی منانے میں مشغول تھا۔ تو اس وقت اس کی محبوبہ ناہید کے اوپر رنج والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ہر طرف شہزادہ ہندال کی شادی کا غلغلہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ خوشی بھی ناہید کی قسمت میں نہ تھی۔ اس کے باپ کو مرے ہوئے ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے۔ وہ کیسے اپنے سوگ کو بُھلا کر شاہی جشن اور رنگ رلیوں میں مشغول ہو جاتی۔ کئی مرتبہ افتخار مرزا گل رخ اور انجمن آرا نے کوشش کی کہ اس کو کسی بزم میں لے جائیں۔ لیکن وہ غم نصیب کسی بھی طرح تیار نہ ہوئی۔

ناہید کے والد کے انتقال کے بعد اس کا اکثر وقت گھر ہی پر گزرتا۔ اس نے انجمن آرا اور گل رخ کو بھی اپنے یہاں بلا کر بطور مہمان رکھ لیا تھا اور یہ سب مل کر ناہید کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ناہید کا غم کوئی مصنوعی غم نہ تھا کہ سامان عیش اور روپیہ کی ریل پیل سے ختم ہو جاتا۔ اس کے برخلاف وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ اگر اس کے گوشۂ دل میں افتخار مرزا کی محبت کا چراغ نہ جل رہا ہوتا تو یقیناً وہ شدتِ غم سے ہلاک ہو جاتی۔

لیکن جب شہنشاہ معظم نے افتخار مرزا سے سنبھل جانے کے لیے کہا تو

وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہو گیا وہ نہ تو شہنشاہ کے حکم کو ٹال سکتا تھا اور نہ اس عالم میں وہ ناہید کو تنہا چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس گتھی کو سلجھاتا رہا۔ لیکن بہت کچھ سوچنے کے بعد وہ یہی محسوس کرتا کہ وہ جہاں سے چلا تھا وہیں آ گیا ہے۔ آخر اس کو حکم شاہی کے آگے جھکنا پڑا۔ چونکہ شہنشاہ نے مرزا عسکری سے وعدہ کر لیا تھا۔ اس لیے شہنشاہ سے درخواست کرنا بیکار تھا۔ اسے اپنی مجبوری پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ دوسرا مسئلہ ناہید سے اجازت کا تھا۔ اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ناہید سے اجازت لے۔ اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ناہید سے اس عالم میں جُدا ہو، مگر حالات نے اُس کو بالکل مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے اس کام کے لیے گل رُخ کا انتخاب کیا۔ گل رُخ نے بڑے حسن سے ناہید کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ ناہید کے لیے اب کوئی مصیبت نئی نہ تھی۔ وہ مصیبتیں اٹھاتے اُن کی عادی سی ہو گئی تھی اس لیے ساری مشکلیں اس پر آسان ہو گئی تھیں۔ اُس نے کمالِ صبر و ضبط سے یہ تمام واقعات سُنے اور گل رُخ سے کہا۔

ناہید : گُل رُخ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ جس نے گلستانِ حیات سے صرف کانٹے چُن لیے ہوں۔ اُس کی آغوش میں پھول کہاں سے آ سکتے ہیں۔ جس نے دُنیا میں غموں کو اپنے لیے منتخب کر لیا ہے اُسے خُوشی و مسرت کون دے سکتا ہے۔ جس نے آنسوؤں کے موتیوں سے رشتہ جوڑا ہے اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کون بکھیر سکتا ہے۔

میں بدنصیب ہوں مجھ کو نہ دو خوشی اتنی
کہ میں خوشی کو بھی لے کر خراب کردوں گی

خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

گُل رُخ : نہیں ناہید۔ میں تم کو اکیلا نہ چھوڑوں گی۔ تم میرے ہمراہ رہو گی۔ افتخار مرزا حکم شاہی سے واقعی مجبور ہیں۔ ورنہ وہ تم کو اس حالت میں چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتے تھے۔

ناہید : نہیں گُل رُخ یہ سب میری محبت کے امتحان ہیں۔ میں اس آزمائش اور امتحان میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔

گُل رُخ نے افتخار مرزا کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ افتخار مرزا کو روانگی کا حکم مل چکا تھا۔ اس کے لیے ٹھہرنا محال تھا۔ وہ بڑی دیر تک اپنی اور ناہید کی حالت پر آنسو بہاتا رہا اور اسی رات ناہید کو تڑپتا چھوڑ کر وہ مرزا عسکری کے ہمراہ سنبھل کی جانب روانہ ہو گیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دُنیا نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔ دُنیا کے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم اور خوفناک سکوت طاری تھا لیکن ناہید جاگ رہی تھی اور کیوں نہ جاگتی جب کہ اس کا مقدر سو گیا تھا۔ وہ کبھی اپنی تنہائی اور باپ کی موت پر آنسو بہاتی کبھی افتخار مرزا کی اچانک جدائی اُس کو تڑپا دیتی۔ وہ بستر پر نہیں انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس کا پلنگ ایک کھڑکی سے لگا ہوا تھا جو پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی۔

ناہید نے کچھ آہٹ محسوس کی۔ حالانکہ وہ دلیر تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے تمام جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اُس نے دروازہ اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ وہ اس کو اپنا واہمہ سمجھ کر بھولنے ہی والی تھی کہ اُس نے کھڑکی میں ایک متحرک سایہ کو دیکھا۔ ناہید ڈر گئی۔ اُس کی آواز حلق میں رُک کر رہ گئی۔ اُس کو پسینہ آگیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑکی کے ذریعہ کمرے میں داخل ہُوا اور اب آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے یہ دیکھ کر اُس کی افغانی غیرت و شجاعت جاگ گئی۔ وہ پلنگ پر سے کود کر کھڑی ہو گئی اور اس آنے والے سے مخاطب ہوتے ہُوئے پوچھا۔

ناہید : کون ہو تم۔ اور تم میرے کمرے میں چوروں کی طرح کیوں داخل ہُوئے ہو۔

نوجوان نے جو ایک سیاہ نقاب سے اپنا منہ چھپائے ہُوئے تھا بڑے سکون سے جواب دیا۔

اچھا۔ ابھی تک آپ جاگ رہی ہیں۔ شاید کسی کی محبت نے آپ کی آنکھوں سے نیند کو چھین لیا ہے۔ میں نے سوچا تھا آپ کو بیدار کرنا پڑے گا۔ خیر یہ اچھا ہی ہُوا کہ آپ میرے استقبال کو آگئیں۔ اب آپ کو اپنی شکل دکھانا ہی پڑے گی۔ یہ کہہ کر نوجوان نے نقاب اُلٹ دی۔ ناہید نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک دم چونک کر بولی۔

ناہید : جمال تم ؟

جمال : ہاں ، میں ہی ہوں۔

ناہید : تم اتنے دن کہاں رہے۔ میں تو تم سے مایوس ہو چکی تھی۔ میرا یہی خیال تھا کہ شاید تم بھی لڑائی میں شہید ہو گئے۔

جمال : میں تنہا شہید نہیں ہوں گا۔ بلکہ بہت سے لوگوں کو ٹھکانے لگا کر مروں گا۔

ناہید : پھر بھی تم اتنے عرصہ کہاں غائب رہے؟

جمال : جہنم میں۔

ناہید : مبارک ہو۔ مگر اب اس طرف آنے کی کیوں زحمت گوارا کی۔

جمال : میں تیرے افتخار مرزا کا سر لینے آیا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اسے قتل نہ کروں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔

ناہید : تم گھاس تو نہیں کھا گئے ہو جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

جمال : زبان بند رکھ۔ بتا افتخار کا بچہ کہاں ہے؟

ناہید : افتخار آگرہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ آج ہی باہر گئے ہیں۔

جمال : تو جھوٹ بکتی ہے۔

ناہید : مجھے جھوٹ بولنے سے کیا حاصل ہو گا؟

جمال : تو اپنے یار کو بچانا چاہتی ہے

ناہید : کیا تیرا خیال ہے کہ تو افتخار کو قتل کر دے گا۔

جمال : ہاں۔

ناہید : اُن کی خطا۔

جمال : اس سے بڑھ کر اور کیا رذالت اور کمینگی ہو سکتی ہے کہ اُس

نے میری منگیتر کو اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ میں اسے قتل کرکے اپنے دل کی آگ بجھاؤں گا۔

ناہید : جمال بکواس بند کرو۔ میں بہت دیر سے طرح دے رہی ہوں مگر تو برابر بکے چلا جا رہا ہے۔ تجھے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔

جمال : بڑی شرم کی بچی بنی ہے۔ بتا تیرا باپ کہاں ہے؟

ناہید : تو ان کو کس لیے پوچھ رہا ہے۔

جمال : میں انھیں بھی قتل کرنے آیا ہوں۔

ناہید : تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ بھلا اُنھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔

جمال : تیرا باپ غدار تھا۔ اس نے افغان قوم کے ساتھ غداری کی اور حکومت مغلیہ کا ملازم ہوگیا۔ اُس نے اپنی نوکری اور دولت کے لالچ میں تجھے مغلوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ ایسے بے غیرت، بے حیا اور ذلیل انسان کی سزا صرف موت ہے۔

ناہید : خاموش، ذلیل انسان تو حدود سے آگے بڑھا جا رہا ہے تو نے ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ میرا بس چلتا تو تیری زبان گدی سے کھینچ لیتی۔ تو جان بوجھ کر میرے ابا حضور پر طوفان اٹھا رہا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ صفدر خان ایک زندہ قوم کے ایک زندہ فرد تھے۔ انھوں نے افغان قوم کے ساتھ غداری کی تو وہ ایسی غداری تھی جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے شکستہ دل اور مردہ قوم میں زندگی پھونک دی۔ اور اس کو کبھی بددل نہ ہونے دیا۔ جب سب افغانوں نے

نے بارگاہِ بابری میں اپنی پیشانیاں جھکا دیں۔ اس وقت ایک صفدر خاں ہی تھا جس نے بابری جاہ و جلال کو ٹھوکر مار دی۔ وہ تنہا لڑتا رہا۔ اس نے پانچ سال تک مغلوں سے جنگ کی۔ اس کے بیوی بچے فاقہ کرتے رہے۔ کہاں گئی تھی تمہاری قومی غیرت اس وقت جب میری ماں بھوک و پیاس کے صدمے برداشت کرتے کرتے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔ کہاں گئی تھی تمہاری غیرت اس وقت جب میں ماں کی وفات کے بعد ایک اکیلے گھر میں دشمنوں کے بیچ میں یکہ و تنہا رہ گئی تھی اور دُنیا والوں کے رحم و کرم پر تھی۔ کہاں گئی تھی تیری غیرت، جب میں اکیلی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ کیا اُس وقت میں تیری منگیتر نہ تھی۔ کیا اس وقت تجھ میں غیرتِ قومی نہ تھی۔

جمال : تھی اور اسی لیے میں تجھے لینے آیا تھا۔

ناہید : تُو جھوٹا ہے تُو بزدل اور کمینہ ہے تو صرف ابا حضور کے حکم سے مجھے پیسے دینے آیا تھا۔ تجھ میں کبھی اتنی ہمت بھی پیدا نہ ہو سکی کہ تو دن کے وقت کبھی میرے پاس آجاتا تُو مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جا سکتا تھا۔

جمال : پہلے تو خیر مجھ سے غلطی ہوئی میں اس مرتبہ میں یہ غلطی نہ کروں گا اور تجھے اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ بتا۔ تیرا باپ کہاں ہے۔

ناہید : جمال تو اتنی گستاخی سے ان کا نام لے رہا ہے جیسے تیرا ان سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

جمال : ہاں۔ غداروں اور کمینوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

ناہید تڑپ گئی اُس نے ایک طمانچہ زور سے جمال کے چہرے پر مارا اور کہا بدتمیز تو یہ کس کی شان میں کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ کر ناہید کا دل بھر آیا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ابا حضور۔ دیکھیے آپ کے جاتے ہی دُنیا کیسی بدل گئی۔ وہ شخص جو آپ کے سامنے کبھی مجھ سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ آج مجھے اکیلا سمجھ کر میرے اوپر ظلم پر ظلم کر رہے ہیں۔

جمال : اپنا چہرہ سہلاتے ہُوتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا ہُوا وہ کمبخت مر گیا۔ اب تو بھی تیار ہو جا۔

ناہید : تو مجھے کہاں لے جائے گا۔

جمال : جہاں بھی میرا دل چاہے گا۔ میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ تجھے زمین میں زندہ دفن کر دوں لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ تو ایک مغل کا پہلو گرم کرے۔

ناہید : جمال۔ شاید تیری موت تجھ کو یہاں کھینچ کرلے آتی ہے۔ تجھے میری طاقت کا اندازہ نہیں۔

جمال : ہے اور اچھی طرح ہے۔ اسی لیے میں نے ایک ایسا وقت منتخب کیا جب تیرا یار باہر جا چکا تھا۔ تمام محل کو میرے سپاہیوں نے گھیر لیا ہے اور اب میں تجھے اپنے ہمراہ لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔

ناہید : مجھے یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا، ابا حضور نے مرتے وقت میرا ہاتھ افتخار مرزا کے ہاتھ میں دیا ہے۔ اس لیے مجھ پر فرض ہے کہ میں ابا حضور کی وصیت کا احترام کروں۔

جمال : ناہید، کاش تیرے ابا حضور زندہ ہوتے تو میں اُن کا وہ ہاتھ قلم کر دیتا جس سے انھوں نے تیرا ہاتھ ایک مغل کے ہاتھ میں دے کر عزت قومی کو ذبح کر دیا۔

ناہید : دیکھ میں تجھ سے ایک مرتبہ پھر کہہ رہی ہوں کہ تو ابا حضور کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال نہ کر۔

جمال : وہ تیرا یار کب آرہا ہے؟

ناہید : لعنت ہے تجھ پر۔ تو اسے گالیاں دے رہا ہے جس نے میری اور میرے باپ کی جان بچائی۔ تو اپنا ہے اور ہمارا سر کاٹنے آیا ہے۔ وہ غیر ہے لیکن اس نے ہم کو عزت و دولت سے سرفراز کیا۔ انھوں نے ابا حضور کی خدمت کی۔ ایک تو ہے کہ جب سے آیا ہے بیہودہ بکواس میں لگا ہوا ہے۔

جمال : باتیں نہ بنا اور میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جا۔

ناہید : میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔

جمال : تو نہیں جائے گی۔ تو تیری لاش جائے گی۔ تلوار نکال کر اُس کی نوک ناہید کے سینہ پر رکھ دیتا ہے۔

ناہید : تو یہ تلوار میرے سینے میں اتار دے لیکن میں یہاں سے نہ جاؤں گی۔

جمال نے اشارہ کیا۔ چند آدمیوں نے ناہید کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک ظالم نے کوئی چیز زور سے ناہید کے سر پر ماری۔ ناہید

اس صدمہ سے بیہوش ہوگئی۔ ان آدمیوں نے اس کو رسی میں مضبوط جکڑ لیا اور کمند کے ذریعہ ناہید کو لے کر جدھر سے آئے تھے اسی طرف سے فرار ہوگئے۔

دوسرے دن تمام محل میں ہنگامہ مچ گیا۔ نوکر چاکر پہرہ دار سب حیران تھے۔ ناہید کی گم شدگی سب کے لیے ایک معمہ بن گئی تھی۔ گھر کا ہر فرد مغموم و پریشان تھا۔ کنیزیں، خادمائیں آنسو بہا رہی تھیں۔ سب کو اس سے انتہائی محبت تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انتہائی اخلاق و شرافت سے پیش آتی تھی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ باپ کی وفات کے بعد ناہید نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی غیر کا احسان لے، اس لیے جب افتخار مرزا گھر پر موجود نہ تھا وہ فائدہ اٹھا کر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ لیکن گل رُخ اور انجمن آرا کا یہی اصرار تھا کہ کوئی ناہید کو یہاں سے زبردستی لے گیا ہے۔ یا اسے کسی فریب میں مبتلا کر کے بُلایا گیا ہے۔ ورنہ وہ افتخار مرزا کی محبت میں اس بُری طرح جکڑی ہوئی تھی کہ وہ خود ان زنجیروں کو نہیں توڑ سکتی تھی۔

گل رُخ نے فوراً ایک صبا رفتار قاصد افتخار مرزا کے پاس سنبھل بھیجا۔ جب قاصد افتخار مرزا کے پاس پہنچا تو اس کی مہم قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ مہا سلطان مرزا پہاڑوں میں روپوش ہو گیا تھا اور اس کی اطلاع افتخار مرزا نے شہنشاہ ہمایوں کو دے دی تھی کہ ایسی صورت میں مہا سلطان مرزا کا تعاقب بیکار ہے۔ وہ خود زندگی سے عاجز آ کر پہاڑوں میں سر ٹکرا رہا ہے۔ اس پر شہنشاہ ہمایوں نے فرمان بھیجا تھا

کہ افتخار مرزا بہ سرعت تمام آگرہ پہنچ جائیں۔ ابھی افتخار مرزا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آگرہ جا کر ناہید کے شعلہ حسن پر پروانہ وار تصدق ہو جائے گا کہ یہ قاصد ناہید کی گم شدگی کا پیغام لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ فوراً آگرہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر وہ اس واقعہ کو برابر سوچتا رہا اور ہر ممکن طریقے سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کوئی واضح چیز اس کے سامنے نہ آسکی۔ کیونکہ کبھی اس کے سامنے ناہید یا صفدر خاں نے کسی ایسے دشمن کا ذکر نہ کیا تھا جو بعد میں اُس کو پریشان کرنے پر آمادہ تھا۔ اس لیے حکایت کے دوسرے اہم ٹکڑے۔ یعنی یہ خیال کہ کوئی محل میں گھُس کر اُس کی ناہید کو زبردستی لے جائے گا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ناہید خود چلی گئی۔ لیکن اگر وہ جاتی تو بغیر مجھے مطلع کیے ہرگز ایسا اقدام نہ کرتی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ مسئلہ کسی طرح اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

آگرہ پہنچ کر افتخار مرزا نے سب سے پہلے اپنے تمام ملازمین کو اکٹھا کیا اور ان سب سے سوالات کیے۔ لیکن اس سے ناہید کا کچھ سراغ نہ لگ سکا۔ اس کے بعد وہ گُل رُخ اور انجمن آرا کے پاس گیا۔ انجمن آرا نے کہا۔

انجمن آرا : میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ناہید خود نہیں گئی ہے بلکہ اُس کو کوئی اور یہاں سے زبردستی اُڑا لے گیا ہے۔ وہ کون ہے اس کا پتہ لگانا آپ کا کام ہے۔ اگر آپ یہی سوچتے رہے کہ ناہید

خود چلی گئی ہے تو آپ سوچتے رہ جائیں گے اور خدا معلوم ناہید کس ظالم کے پنجے میں پھنس کر کیا کر بیٹھے۔

افتخار نے ایسے موقع پر اس کی پرانی سہیلی اکبری کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تم کسی ایسے مرد سے واقف ہو جو ناہید کے پاس اس زمانہ میں آتا جاتا ہو۔

اکبری : جی ہاں۔ آپ کے آنے سے کچھ عرصہ پیشتر تک ناہید ایک افغان سے منسوب تھی۔ اور اس کا نام شاید جمال خان تھا۔ وہ صفدر خان کا کچھ عزیز بھی تھا۔ وہ اکثر صفدر خان کا پیغام لے کر ناہید کے پاس آیا جایا کرتا تھا اور جس رات کو ناہید کی ماں کا انتقال ہوا وہ اشرفیوں کی ایک تھیلی بھی ناہید کو دے گیا تھا جس کو ناہید نے میرے پاس بطور امانت رکھوایا تھا۔

اب افتخار مرزا کے ذہن کے اوراق جلدی جلدی اُلٹنے لگے۔ اس کو گل رخ اور انجمن آرا کی بات میں صداقت نظر آئی۔ اور اُس کے دل سے تمام بدگمانیاں ختم ہوگئیں۔ اُس کے دل کا تمام غبار اس طرح چھٹ گیا جس طرح ابر کے ٹکڑے آسمان پر چھٹ جاتے ہیں اور صاف و شفاف نیلگوں آسمان چمکنے لگتا ہے۔ اُس کا دل ناہید کی طرف سے صاف ہوگیا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ ناہید خود نہیں گئی بلکہ زبردستی لے جائی گئی ہے۔ بدگمانی نے اب خوف و ہراس کی جگہ لے لی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہیں مغلوں کی وفاداری کی قیمت اور صفدر خان کا انتقام، میری پیاری ناہید سے نہ لیا جائے۔ وہ افغان قوم سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ خیال آتے ہی اُس کے تمام جسم میں کپکپی پیدا ہوگئی۔

اُس نے فوراً انجمن آرا، گل رخ، بیرم خاں اور ابوالقاسم کو اپنے گھر دعوت دی اور صورتِ حال کو ان کے سامنے پیش کیا۔ سب نے افتخار مرزا کے خیالات کی تائید کی۔ اس پر بیرم خاں نے کہا۔

بیرم خاں: میرے خیال میں تمام افغان سرداروں اور سپاہیوں کو بلا کر پوچھنا چاہیے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جمال خاں کو جانتا ہوگا۔

سب نے بیرم خاں کے اس مشورہ کو پسند کیا اور افتخار مرزا نے اس قسم کا حکم نامہ فوراً فوج میں نشر کرادیا کہ جو کوئی سپاہی یا افغان سردار جمال خاں کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائے گا اس کو معقول معاوضہ دیا جائے گا۔

اس اعلان کو ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بہت سے افغان اور مغل سردار افتخار مرزا کے پاس آئے۔ اور انھوں نے جمال خاں کے متعلق جملہ معلومات افتخار مرزا کو بہم پہنچائیں۔ ان اطلاعات کا خلاصہ یہ تھا کہ جمال خاں ایک معمولی سا جاگیردار اور شیر خاں کا پڑوسی تھا۔ وہ عرصہ تک مغلوں کے خلاف جنگ کرتا رہا اور جب سے شیر خاں کا عروج شروع ہوا وہ اس کے ساتھ پہلے بہار اور پھر بنگال چلا گیا اور اس وقت شیر خاں کی فوج میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہے اور قلعہ چنار میں مقیم ہے۔

ان تمام باتوں سے افتخار مرزا یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس کی عدم موجودگی اور صفدر خاں کی وفات سے موقع پاکر جمال خاں زبردستی ناہید کو اس کے محل سے اُڑا لے گیا اور اس کو قلعہ چنار میں لے جاکر نظربند کر دیا ہے۔ بیرم خاں نے افتخار مرزا اور ناہید کی عشقیہ داستان گوش ہمایونی

تک پہنچائی اور جب جہاں پناہ کو یہ معلوم ہُوا کہ جمال خان دار الخلافہ دہلی سے اس کے عزیز دوست، افتخار مرزا کی محبوبہ ناہید کو زبردستی اس کے محل سے اغوا کر کے لے گیا تو اُن کا چہرہ فرطِ غیظ و غضب سے لال ہو گیا۔ اُنھوں نے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں، اس شیر خاں کے حوصلے اب اس درجہ بڑھ گئے ہیں کہ اس کے آدمی امراء شہنشاہ کے ساتھ ایسی گستاخانہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ ہم کو اس افغان شیر خاں کی ضرور گوشمالی کرنی پڑے گی۔

شہنشاہ نے فوراً امراء کو طلب کیا۔ تھوڑی دیر میں دیوانِ خاص امرائے مملکت اور سرفروشانِ تاج و تخت سے بھر گیا۔ بیرم خاں نے بتایا کہ کس طرح شیر خاں نے جنید برلاس کی مدد سے (جو ایک مغل تھے) اپنی کھوئی ہُوئی جاگیر حاصل کی۔ اور کسی طرح ان ہی کی بدولت وہ زندگی میں درجہ بدرجہ کامیابی حاصل کرتا رہا اور بامِ ترقی تک پہنچ گیا۔ اب اسی شیر خاں کے سر میں جو اب تک سلطنت مغلیہ کے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ ملک گیری اور کشور کشائی کا سودا سمایا ہے۔ اس نے قلعہ رہتاس کو فتح کر لیا ہے۔ مدّت سے اُس نے غور پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اب یہ خبر گرم ہے کہ وہ پورے صوبہ کو جلد فتح کر لے گا۔ اس لیے میں امراء مملکت کی جانب سے گوش ہمایونی تک یہ آواز پہنچانا چاہتا ہوں کہ اگر اس سرکش کا سر نہ کچلا گیا تو یہ آئندہ چل کر حکومت مغلیہ کے لیے مستقل خطرہ بن جائے گا۔ اگر اس وقت اس کے خلاف تادیبی کارروائی

نہ کی گئی تو یہ فتنہ اتنا آگے بڑھ جائے گا کہ پھر اس کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔

تمام امراء نے باری باری بیرم خاں کی تائید کی۔

اس پر شہنشاہ ہمایوں نے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں: ہم نے محسوس کیا کہ افغانوں کی سرکشی حد سے بڑھتی جا رہی ہے اور افغان فوج اس مرتبہ پھر شیر خاں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ایک تشویش ناک بات ہے۔ اور اس لیے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس قوت کو جلد از جلد ختم کر دینا ضروری ہے۔ ہم کو قلعہ چنار کی طرف کوچ کرنا چاہیے۔ رومی خاں تمھاری کیا رائے ہے؟

رومی خاں: جہاں پناہ آپ کا خیال درست ہے۔ ہم کو سب سے پہلے قلعہ چنار پر قبضہ کرنا چاہیے اور مجھے حضور کے اقبال سے یقین ہے کہ ہم جلد اس قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

شہنشاہ نے اس کے بعد فوج کو لشکر کشی کا حکم دے دیا اور شاہی فوج آگرہ روانہ ہو کر ۲۷۔ جون ۱۵۳۷ء کو شب برات کے موقع پر قلعہ چنار کے دس میل کے فاصلہ پر جا پہنچی، رومی خاں کے پیش نظر اب سب سے بڑا مسئلہ، قلعہ چنار کی کمزوریوں کا معلوم کرنا تھا۔ قلعہ چنار بڑا مضبوط اور بڑا اچھا قلعہ تھا۔ اس کو اتنی آسانی سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے قلعہ کی کمزوریوں کو معلوم کرنے کے لیے ایک زبردست چال چلی۔ ایک دن اُس نے اپنے ملازم کلا خاں کو اتنا مارا اور اتنے کوڑے لگائے کہ اس کا تمام جسم متورم ہو گیا۔ کوڑوں کے نشانات اس کے تمام جسم پر اُبھر آئے۔ اس

کے بعد اس کو قلعہ کے نیچے پہنچا دیا گیا۔ وہ روتا پیٹتا قلعہ کی جانب بھاگا اور چند افغانوں نے جو اس وقت قلعہ سے باہر ٹہل رہے تھے اسے پکڑ لیا۔ اُس نے ان سے گڑگڑا گڑگڑا کر کہا کہ مغلوں نے مجھے بے گناہ مارا ہے۔ دیکھو میرا جسم کیسا لہو لہان ہو رہا ہے۔ میں اپنی بے عزتی اور چوٹ کا انتقام اس طرح لینا چاہتا ہوں کہ ان کی کمزوریاں۔ افغانوں کو بتاؤں، تاکہ اس جنگ میں مغلوں کو شکست حاصل ہو۔

افغان اس کی باتوں میں آگئے اور اس کو قلعہ کے اندر لے گئے۔ اس کا علاج کیا اور اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ اسی اثناء میں اُس نے چند افغان سرداروں سے راہ و رسم پیدا کی اور کہا میں رومی خاں جیسے توپچی کا غلام ہوں۔ اُس نے مجھے بے گناہ مارا، اسی لیے میں آپ لوگوں کی پناہ میں آگیا ہوں۔ اگر آپ مجھے برج اور قلعہ کا معائنہ کرا دیں تو میں اُس کی حفاظت اور مورچہ بندی کر دوں گا کہ رومی خاں کو اس سے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اور وہ قلعہ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔

افغان اس کے چکمہ میں آگئے اور قلعہ کے ہر مقام کا اسے معائنہ کرا دیا۔ اس طرح وہ چند روز رہ کر اور قلعہ کی تمام کمزوریوں سے واقف ہو کر قلعہ سے فرار ہو گیا اور سیدھا رومی خاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو تمام واقعات بتلائے اس کے بعد اس نے کہا کہ قلعہ کے اس برج کو جو دریا کی جانب ہے نشانہ بنایا جائے اور اسی طرف سرنگ لگائی جائے کہ لوگ قلعہ کے قریب نہ آسکیں اور نہ مورچہ ترتیب دے سکیں۔

رومی خاں نے اپنے غلام کو بہت زیادہ انعام واکرام دیا۔ اس کے بعد اُس نے ایک بہت بڑی توپ برج کے مقابل نصب کی۔ قلعہ کا محاصرہ کیا اور سرداروں کو مختلف مورچوں پر متعین کر دیا۔ اس عرصہ میں ہی سلطان مرزا اور محمد زماں مرزا اپنے بیٹوں کو ہمراہ لے کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے دونوں کو معاف کر دیا اور شاہانہ عنایات سے دونوں کو سرفراز کیا۔

ایک دن رومی خاں نے شہنشاہ سے کہا کہ اگر حکم ہو تو ایک بڑا چوبی مینار کشتی میں نصب کیا جائے۔ تاکہ اس کے ذریعہ قلعہ کے اندر گولہ باری کی جا سکے۔ شہنشاہ مکرم نے حکم دیا کہ جو تدبیر تم بہتر سمجھتے ہو اس پر عمل کرو۔ اس پر رومی خاں نے تین بڑی کشتیوں پر ایک بڑے مینار کی تعمیر شروع کی اور اس کو اتنا بلند کرنا چاہا کہ سارا قلعہ اس کی زد میں آ جائے۔ اور جب برج تیار ہو گیا تو اس کے نصب کرنے کی اجازت شہنشاہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد رومی خاں نے فوجوں کو بتایا کہ جب ہم برج پر سے گولہ باری کریں تو سپاہی چاروں طرف سے جنگ کی یلغار کریں۔ غرضیکہ مینار قلعہ تک پہنچایا گیا اور جنگ کا آغاز ہوا۔ آدھی رات تک لڑائی ہوتی رہی۔ اس میں سات سو مغل کام آئے۔ بہت کوشش کے باوجود قلعہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس جنگ میں اس عظیم الشان چوبی مینار کا ایک حصہ بھی ٹوٹ گیا۔ جس کو دوسرے ہی دن درست کر لیا گیا۔

افغانوں نے جب یہ دیکھا کہ شاہی لشکر طاقتور ہے اور بادشاہ

اور امراء قلعہ فتح کرنے پر تُلے ہُوئے ہیں جو امروز فردا میں اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا تو انھوں نے شہنشاہ سے صلح کر لی۔ محصورین نے صلح کی یہ شرط پیش کی کہ شہنشاہ مکرم اہلِ قلعہ کو امان دیں۔ شہنشاہ ہمایوں نے اہل قلعہ کو عام معافی دے دی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

افتخار مرزا سب سے پہلے قلعہ میں داخل ہُوا۔ اُس نے قلعہ کے ایک ایک کونے کو چھان مارا۔ لیکن ناہید اور جمال کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اُس نے بہت سے افغانوں اور اہلِ قلعہ سے ناہید کے متعلق سوالات کیے لیکن سب نے یہی کہا کہ وہ دونوں صلح سے کچھ دیر پہلے تک قلعہ میں موجود تھے۔ مگر اب ان کا کہیں پتہ نہیں۔ افتخار مرزا کے ساتھ رومی خاں بھی تھا۔ اس کو اہلِ قلعہ کی اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے تین سو توپچیوں کو گرفتار کر لیا اور اُن کے ہاتھ قلم کرا دیے۔ اُن کے پیچھے ابوالقاسم، بیرم خاں اور دوسرے لوگ بھی اسی دُرِ بے بہا کی تلاش میں تھے۔ قلعہ کے ایک ایک حصہ میں سرگرداں و پریشان پھر رہے تھے۔ مگر دُرِ مقصود کا کہیں پتہ نہ تھا۔ افتخار مرزا مایوسی اور نا امیدی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اس نے کہا:

یہ کمبخت نکل کیسے گیا۔

بیرم بیگ : ممکن ہے یہاں کوئی خفیہ راستہ ہو۔

ابوالقاسم : ہاں بہت ممکن ہے۔

افتخار مرزا نے بہت سے قلعہ والوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ اس

قلعہ کا خفیہ راستہ کون سا ہے۔

سب نے لاعلمی ظاہر کی۔

اور قلعہ کے اس مقام پر جہاں یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں اسی قلعہ کے تہ خانہ میں جمال مرزا اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

اب یہاں سے ناہید کو لے کر نکل جانا چاہیے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کو خفیہ راستہ کا پتہ چل جائے اور ہم اُن کے ہاتھوں میں پھنس جائیں۔

ناہید اوپر سے تمام آوازیں سُن رہی تھی اور دُعائیں مانگ رہی تھی کہ کاش میرے افتخار کو میری اس قید کا علم ہو جاتے اور مجھے وہ اس ظالم کے پنجے سے نکال لے۔ ابھی افتخار مرزا سُرنگ کا حال معلوم کر کے اس میں داخل ہوئے ہی تھے کہ جمال خاں سرنگ سے ناہید کو ہمراہ لے کر نکل گیا۔

افتخار مرزا کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر چند اُس کے دوست اس کی تالیف قلب کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس کی دل جوئی کرنے اور ہمت بڑھانے کی جد و جہد کر رہے تھے مگر افتخار مرزا کی بے قراری ہر لحظہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ جب تک قلعہ فتح نہ ہُوا تھا وہ ناہید کو پانے کی امید میں رات دن جد و جہد کر رہا تھا۔ لیکن قلعہ فتح ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

باب ۱۶

بیرم خاں کی مونگیر میں گرفتاری

شہنشاہ ہمایوں کو جتنی مسرت قلعہ چنار کے فتح ہونے کی ہوئی۔ اتنا ہی ناہید کے نہ ملنے کا رنج ہوا۔ انھوں نے افتخار مرزا کو تسلی دی کہ اب وہ شیر خاں کو بہار اور بنگال سے نکال دیں گے اور اس عرصہ میں ناہید کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گی۔ شہنشاہ نے قلعہ فتح ہونے کی خوشی میں جشن کیا۔ ایک شاہانہ مجلس آراستہ کی۔ ارکان دولت کو خلعتوں اور دیگر امراء کو مراتب اعلیٰ سے سرفراز کیا۔ اس اثنا میں شہنشاہ نے رومی خاں سے پوچھا قلعہ چنار کیسا قلعہ ہے؟

رومی خاں: جہاں پناہ یہ قلعہ اپنی ساخت، جگہ اور مضبوطی کے اعتبار سے بے مثل قلعہ ہے۔ اگر میرے قبضہ میں ہوتا تو کوئی اس کو فتح نہ کر سکتا۔

شہنشاہ ہمایوں: اچھا رومی خاں، تمھاری رائے میں اس قلعہ کا حاکم کس کو مقرر کیا جاتے۔

رومی خاں: جہاں پناہ مالک ہیں جس کو چاہیں اس قلعہ کا حاکم مقرر کریں لیکن میری رائے میں بیگ میرک اس کام کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دینے کی اپنے اندر صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ بادشاہ اس مشورہ سے

خوش ہوئے اور انھوں نے بیگ میرک کو یہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس واقعہ سے بہت سے امرا۔ رومی خاں کے دشمن ہو گئے اور انھوں نے ایک دن اس کو قتل کر دیا۔

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد شاہی فوج آگے بڑھی جب شاہی لشکر بنارس کے قریب پہنچا تو شہنشاہ نے اپنے امرا۔ سے دریافت کیا کہ شیر خاں کی کیا خبر ہے ؟

رائے بوجا نے عرض کیا کہ شیر خاں نے بنگال کو گھیر لیا ہے اور اس کو خراب کر چکا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ عنقریب بنگال پر قابض ہو جائے گا۔ اس پر بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک افغانی فوج بنگال کی طرف متوجہ ہے۔ ہم کو قلعہ رہتاس اور قلعہ بھرکندہ کو فتح کر لینا چاہیے۔ جب بادشاہ قلعہ رہتاس پر پہنچا تو اس کو یہ دوسری اطلاع ملی کہ شیر خاں نے بنگال کو فتح کر لیا ہے اور تمام خزانہ کو قلعہ رہتاس اور بھرکندہ میں منتقل کر رہا ہے۔ یہ خبر سُن کر شہنشاہ نے فوراً ہی ناصر مرزا کو دہلی کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔ مرزا ہندال کو چند امرا۔ کے ہمراہ آگرہ کی نگرانی کے لیے بھیجا۔ اور خود بہ نفس نفیس بھرکندہ کی جانب روانہ ہُوا۔ جب قلعہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے حسین ترکمان کو سفیر بنا کر اس فرمان کے ساتھ شیر خان کے پاس بھیجا۔

فرمان

شیر خاں کو معلوم ہونا چاہیے کہ شہنشاہ دولت و

اقبال محمد نصیرالدین ہمایوں غازی۔ اُن کی سرکشی
کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور اُس کو حکم دیتے
ہیں کہ وہ چتر و تخت و خزانہ، شاہی دربار
میں لے کر حاضر ہو۔ ملک بنگال اور قلعہ رہتاس
کو خالی کر دے۔ اگر اس نے بارگاہ سلطانی پر
سر اطاعت خم کیا اور شاہی فرمان کو مان لیا تو
وہ اکرام ہمایونی سے فیض یاب ہوگا اور اس
کو اس اطاعت و وفاداری کے صلے میں قلعہ
چنار، شہر جون پور اور ایک اور علاقہ جسے وہ
پسند کرے گا عطا کیا جائے گا۔ ورنہ وہ شاہی
عتاب میں گرفتار ہو جائے گا۔

شہنشاہ ہمایوں بادشاہ غازی

جب سفیر نے یہ شاہی فرمان شیر خاں کو دیا تو اُس نے اس کو قبول
کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے ملک بنگال پانچ سال کی مسلسل
جد و جہد کے اور جان توڑ کوششوں کے بعد بزور شمشیر فتح کیا ہے۔ اس
کے فتح کرنے میں بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میں
اسے کسی دوسرے کو واپس دے دوں۔

اسی اثنا میں شاہ بنگال نے شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں یہ درخواست

روانہ کی کہ حضور مقام گڑھی پر قدم رنجہ فرمائیں۔ تو مناسب ہوگا۔ چنانچہ شہنشاہ گڑھی کی جانب روانہ ہوگئے۔ راستہ میں حسین ترکمان بھی شاہی لشکر سے آملا اور دربار میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ شیر خاں نے فرمان شاہی کی تعمیل سے انکار کر دیا ہے۔ اور وہ خود عقب کے پہاڑی راستوں سے بنگال کی طرف آرہا ہے۔ شاہی لشکر گڑھی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ محمد شاہ والی بنگال بھی افغانوں سے شکست کھا کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا کہ بنگال میں غلّہ کے ذخائر موجود ہیں۔ اگر شہنشاہ مکرم اُن پر قبضہ کر لیں تو ایک عالم کا خراج ہوگا۔ شہنشاہ ہمایوں نے شاہ بنگال کی بڑی دل جوئی کی اور کہا کہ تمھارا ملک فتح کر کے تم ہی کو واپس کر دیں گے۔ مردانہ ہمت سے کام لو۔ مردوں ہی کو دُنیا کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس وقت شہنشاہ ہمایوں نے اپنے امراء کو بلا کر حکم دیا کہ وہ فوراً بنگال کی جانب روانہ ہو جائیں اور گڑھی پر قبضہ کر لیں۔ اس حکم کے ملتے ہی یہ لوگ روانہ ہوگئے۔ جب گڑھی کے قریب پہنچے تو معلوم ہُوا کہ شیر خاں کا بیٹا جلال خاں اس مقام پر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ یہ شاہی دستہ جنگ کے لیے آگے بڑھا اور مقام مذکور کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

جلال خاں نے اس مقام پر اپنی فوج کو اس طرح آراستہ کیا کہ شاہی دستہ کو بجز ایک تنگ راستہ کے اور کوئی راہ نہ ملی جس کے ایک طرف دُور تک دریائے گنگا بہہ رہا تھا اور دوسری طرف پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ جب یہ دستہ اس تنگ راستہ سے گزرنا شروع ہُوا تو

جلال خاں اور اس کے ساتھی ان پر بلائے بے درماں کی طرف ٹوٹ پڑے۔ زبردست معرکہ ہُوا جس میں علی خاں اور حیدر بخش مارے گئے۔ شاہی دستہ شکست کھا کر شاہی لشکر سے آ ملا۔ شہنشاہ کو اپنے سرداروں کے مارے جانے کا بہت غم ہُوا۔ اب وہ بذاتِ خود گڑھی کی جانب متوجہ ہُوا۔ شہنشاہ نے حاجی محمد کوکا کو گڑھی کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے آکر اطلاع دی کہ تمام مال اور خزانہ کو قلعہ رہتاس میں پہنچا کر بھرکندہ کی طرف چلے آؤ۔ شہنشاہ ہمایوں کو ملک کے اندر داخل ہونے دو۔ اس کے بعد جو تدبیر مناسب ہوگی اختیار کی جائے گی۔ جلال خاں کو یہ بھی اطلاع مل چکی ہے کہ شیر خاں خود قلعہ رہتاس میں پہنچ گیا ہے۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ حاجی محمد کوکا اور چند دوسرے امراء نے دربار میں حاضر ہوکر اس بات کی مبارکباد دی کہ جلال خاں گڑھی کو خالی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ اسی وقت بنگال کی جانب روانہ ہو گیا۔ چند روز بعد شاہی لشکر شہنشاہ ہمایوں کی معیت میں راستہ طے کرتا ہُوا اور منزلوں پر منزلیں کرتا ہُوا بنگال پہنچ گیا۔ ملک بنگال ابھی ابھی شیر خاں اور حاکم بنگال کی لڑائی سے تاراج ہو چکا تھا۔ ہر طرف لاشیں پڑی تھیں۔ اور کوچہ و بازار بدبو سے سڑ رہے تھے۔ لوگ یا تو گھروں میں بند ہو گئے تھے یا شہروں کو خالی کر کے دیہاتوں میں چلے گئے تھے۔ شہنشاہ کے قدم مبارک سے کچھ عرصہ میں بنگال کی حالت درست ہوگئی۔ لوگوں کا خوف و ہراس دُور ہُوا۔ دکانیں دوبارہ سجائی گئیں۔ محلے آباد ہُوتے اور پھر تمام بنگال میں انسانی زندگی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔

شہنشاہ نے ملک بنگال کو اپنے امیروں میں تقسیم کیا اور نو مہینے تک بنگال ہی میں مقیم رہا اور ایسا عیش منایا کہ کئی ماہ تک اس کو کسی نے نہ دیکھا کیونکہ وہ محل سرا میں ہمیشہ خلوت میں رہتا تھا۔

اتنے میں یہ خبر آئی کہ شیر خاں نے بنارس پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ چنار اور جون پور پر قبضہ کر لیا اور اپنی فوجوں کو دریائے گنگا تک پھیلا کر قنوج بھی فتح کر لیا۔

افتخار مرزا ناہید کے غم میں ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا بیرم خاں اچانک سخت بیمار ہو گیا ان دونوں آدمیوں کو پریشانیوں نے گھیر لیا اور کوئی شہنشاہ ہمایوں کو صحیح مشورہ دینے والا نہ ملا۔

جب تک بیرم خاں اور افتخار مرزا شہنشاہ ہمایوں کے پاس رہے ان کو ہر جنگ میں کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن جب حالات و واقعات نے ان دونوں کو دامن شاہی سے کچھ دیر کے لیے الگ کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ نو مہینے تک عیش و عشرت میں پڑا رہا اور جو علاقہ کئی سال کی جد و جہد سے افغانوں سے حاصل کیا تھا وہ پھر افغانوں کے پاس چلا گیا۔

اس میں شہنشاہ کی فوجی کمزوریوں کو کوئی دخل نہ تھا کیونکہ شہنشاہ ہمایوں نہایت بہادر مستقل مزاج اور زیرک انسان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی کمزوری اس کی عیش پسندی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے دشمن کی تمام قوت سلب کر دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنی عیش پسندی کی وجہ سے

دشمن کو زیادہ طاقت ور بننے کا موقع دے رہا تھا۔

جب بیرم خاں اور افتخار مرزا نے شہنشاہ ہمایوں کو بتایا کہ آپ نے سالوں کی محنت کو مہینوں میں ختم کر دیا۔ اور شیر خاں کو پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور بنا دیا۔ تو شہنشاہ کو بہت ملال ہُوا۔ پہلے تو شہنشاہ نے ان خبروں کو باور نہ کیا اور کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شیر خاں کی کیا مجال ہے کہ وہ ایسے اقدامات کر سکے اور ہمارے سامنے اس طرح سینہ سپر ہو کر آئے اور ہمارے مفتوحہ علاقوں پر فوج کشی کرے۔ اس کے بعد بیرم خاں کے اصرار پر ایک مجلس خاص منعقد فرمائی۔

شہنشاہ نے امیروں سے دریافت کیا کہ ملک بنگال کس کے سپرد کیا جائے۔ امیروں اور ارکان دولت نے عرض کیا کہ حضرت سلامت جس کسی کو اس کے لائق سمجھیں۔ اُس کو اس عہدے سے سرفراز فرمائیں۔

شہنشاہ نے حکم دیا کہ زاہد بیگ اس عنایت کا مستحق اور امیدوار ہے بہتر یہی ہے کہ بنگال کی حکومت اس کو عطا فرمائی جائے۔

زاہد بیگ نے اس مجلس میں عرض کیا کہ میرے قتل کے لیے بنگال کے علاوہ کیا آپ کو کوئی دوسری جگہ نہ مل سکی۔ اس گستاخانہ بات پر شہنشاہ ہمایوں نہایت غضبناک ہُوا۔ اور حکم دیا کہ اس مردود کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ مگر وہ فوراً مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔

بہت سے امرائ اور خود بیگہ بیگم نے بادشاہ سے سفارش کی کہ زاہد بیگ کا قصور معاف کر دیجیے مگر شہنشاہ کا عتاب کم نہ ہُوا۔ زاہد بیگ

کو بھی یہ معلوم ہو گا کہ شہنشاہ اس کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اُس نے اسی میں عافیت دیکھی کہ راہ فرار اختیار کی۔ لیکن چلتے چلتے وہ حاجی محمد کوکا اور زندار بیگ کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ زاہد بیگ یہاں سے آگرہ پہنچا اور شہزادہ ہندال سے کہا کہ بابری تخت و تاج کو سنبھالنا ہمایوں کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ۹ مہینے عیش و عشرت میں پڑا تھا جس سے تمام خفیہ طاقتیں زور پکڑ گئیں۔ اب آپ خدا کا نام لے کر تخت حکومت پر بیٹھیں۔ سارے امراء نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اور شہزادہ ہندال بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ شہزادے نے یہ کوشش کی کہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے لیکن امیروں نے کہا کہ آپ شیخ بہلول کو قتل کر دیں تاکہ ہم کو یقین ہو جائے کہ آپ واقعی شہنشاہ ہمایوں سے برگشتہ ہیں اور آپ کی اطاعت کر سکیں۔ شہزادہ ہندال نے شیخ بہلول پر شیر خاں کی اعانت کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبریں لاہور میں مرزا کامراں کو پہنچیں۔ کہ ہمایوں بنگال میں الجھا ہُوا ہے۔ ہندال دہلی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوا رہا ہے تو اس کو سخت اذیت ہُوئی۔ کیونکہ وہ عرصہ سے ہمایوں کو ہٹا کر خود وارث تخت و تاج ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس صورت حالات کو دیکھتے ہی لاہور سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہمایوں کے مقدر کا ستارہ گردش میں آ چکا تھا۔ اس کی رحم دلی اور عیش پسندی رنگ لا رہی تھی۔ خود اُس کے بھائی جن پر اُس نے عطا پر عطا اور عنایت پر عنایت کی تھی۔ اس کے درپئے آزار تھے۔ اُس نے

شیر خاں کو اپنی نادانی سے خوب تیاری کرنے کا موقع دے دیا تھا۔ ایسے نازک حالات میں شہنشاہ ہمایوں نے بیرم خاں کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔

بیرم خاں : جہاں پناہ۔ یہ غلام خانہ زاد تو کب سے گوشِ ہمایوں تک یہی آواز پہنچانا چاہتا تھا کہ حضور ایک طرف تو شیر خاں کی بڑھتی ہوئی قوت کا سدباب کریں اور دوسری جانب اپنے بھائیوں کو اپنے خلاف ایک مضبوط طاقت نہ بننے دیں۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں تقدیر کے آگے سب کو سپر انداختہ ہونا پڑتا ہے۔ ہم غیروں سے لڑ سکتے ہیں۔ لیکن اپنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں کیا کریں۔ تم نے دیکھا کہ ہم نے کتنی سُرعت سے سلطان بہادر گجراتی کو شکست دی۔ پھر بنگال پر قبضہ کیا اور اس کی قوت کو ختم کر دیا۔ لیکن انسان مشیت سے کیسے لڑ سکتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ گزشتہ دنوں ہم نے شہزادہ ہندال کی شادی کس خلوص و اہتمام سے کی۔ اپنے ہر بھائی کو ہر طرح کا آرام و آسائش پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن وہی سب ہماری بغاوت پر اُتر آتے ہیں اب ہم کیا کریں۔ کیا ہم اپنی فطری شرافت کو چھوڑ دیں۔ کیا اپنے بھائیوں تک کو اپنا دشمن سمجھیں اور اُن کے رنج کے آزار رہیں۔ نہیں بیرم خاں ہم سے یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ہنگامی اور نازک حالات میں ہم کو کیا اقدام کرنا چاہیے۔

بیرم خاں : جہاں پناہ۔ اس ناچیز کی رائے میں یہ فتنہ و فساد صرف

اس لیے کھڑا ہو گیا ہے کہ حضور ایک عرصہ دراز کے لیے دار الخلافہ سے دُور رہے۔ حضور کی دُوری اور عدم موجودگی نے مفسدوں کو اسکیمیں بنانے اور فتنہ و فساد برپا کرنے کا موقع دے دیا۔ اب بھی اس فتنہ کا واحد علاج ہے کہ حضور فوراً بنگال سے دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ آپ کی آمد کی خبر سُن کر بہت سے لوگ رعبِ سلطانی اور عتابِ حکومت کے ڈر سے مفسدوں کو چھوڑ کر حضور کے کیمپ میں آ جائیں گے۔

شہنشاہ ہمایوں : یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ہم کو کس طرح چلنا چاہیے۔

بیرم خاں : حضور اگر فوج کو تین حصوں میں منقسم کر دیں تو زیادہ مناسب ہے۔ ایک حصہ آگے آگے چلتا رہے دوسرا وسط میں رہے اور تیسرا حصہ بنگال کے ارد گرد و نواح کی حفاظت کے لیے رہے۔

شہنشاہ ہمایوں : ٹھیک ہے۔ ہم کو اس پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔ تم ایک حصہ فوج لے کر افتخار مرزا اور ابو القاسم کے ہمراہ مونگیر کے مقام پر پہنچ کر ہمارا انتظار کرو۔ اتنے عرصہ میں ہم بنگال میں جگہ جگہ بکھری ہوئی فوجوں کو اکٹھا کر کے بھیجتے رہیں گے۔

بیرم خاں : مناسب۔

یہ کہہ کر بیرم خاں شاہی خیمہ سے باہر آئے انھوں نے اپنے اور افتخار مرزا کے لشکروں کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ افتخار مرزا کی طبیعت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچتا کہ یہ شان و شوکت کس کام کی ہے جب اس کے ذریعہ وہ اپنی ناہید کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اس سے بہتر تو یہی ہے کہ وہ فوجی وظیفہ کے بجائے وظیفہ عشق کرے۔ اگر بیرم خاں اور ابوالقاسم نہ ہوتے تو خدا معلوم افتخار اپنے جنون میں کیا کر بیٹھتا۔ لیکن بیرم خاں اور ابوالقاسم اس کا بڑا سہارا تھے۔

بیرم خاں، افتخار مرزا اور ابوالقاسم اپنے اپنے لشکروں کو لے کر مونگیر پہنچ گئے۔ ایک دفعہ رات کو یہ چھوٹا سا قافلہ سو رہا تھا کہ خواص خاں کو ان کی قلت تعداد کا علم ہوگیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ ہمایوں کے میرِ اعلیٰ اور دست راست بیرم خاں اور افتخار مرزا سپاہیوں کی چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ مونگیر میں پڑے ہیں۔ اگر ان کو گرفتار کرلیا گیا تو بادشاہ ہمایوں — بے دست و پا رہ جائے گا۔ اس کو قلبی اذیت ہوگی۔ ممکن ہے وہ ان دوستوں کی گرفتاری سے پریشان ہو جائیں۔

یہ خیال کرتے ہی وہ تیزی سے مونگیر آیا اور شاہی سپاہ پر جو تعداد میں بہت ہی کم تھی۔ اس پر شب خون مار دیا۔ سپاہی ابھی خواب سے بیدار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ خوابِ عدم کو روانہ ہونے لگے۔ بیرم خاں، ابوالقاسم اور افتخار مرزا کی جب آنکھ کھلی تو انھوں نے اپنے آپ کو خواص خاں کی حراست میں دیکھا۔

خواص خاں نہایت خُوش تھا کہ وہ جلد اپنے آقا شیر خاں کو سب سے قیمتی تحفہ پیش کرے گا اور اس کے بدلے دامن امید کو زر و جواہر سے بھرے گا۔

جب یہ خبر شہنشاہ ہمایوں کو پہنچی کہ خواص خاں یلغار کرتا ہوا مونگیر

آیا۔ اُس نے شہر کے دروازوں کو آگ لگا دی۔ بیرم خاں وافتخار مرزا کو زندہ گرفتار کر کے لے گیا تو شہنشاہ کو اتنا صدمہ ہُوا کہ دو وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن دربار نہیں کیا۔ کسی کو شرفِ باریابی نہیں بخشا۔ تمام فوج ان سرداروں کے اس طرح اچانک گرفتار ہو جانے سے بے حد مغموم تھی۔ کیونکہ ہر فوجی اُن کا زیر بار احسان اور اُن کی اخلاقی بلندیوں سے واقف تھا۔ یہ ابرِ کرم تھے جو سیکڑوں لوگوں کو سیراب کر چکے تھے۔ یہ چشمہ جاریہ تھے جس سے ہزاروں اپنی تشنگی بجھا چکے تھے۔

شہنشاہ کی اُداسی نے لوگوں کو اور زیادہ اُداس کر دیا۔ ہمایوں اپنے خیمے میں تنہا ٹہل رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوں۔ لیکن صحیح معنی میں بادشاہ بیرم بیگ تم ہی تھے۔ افتخار تم تھے۔ تم دونوں میرے مشیر اور دست و بازو تھے۔ اے خواص خاں، تو کسی اور کو پکڑ لیتا مگر ان پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کڑی سے کڑی مشکل اور دشوار سے دشوار منزل میں میرے کام آتے ہیں۔ یہی وہ ہستیاں تھیں۔ جو ملک و قوم کی بہبودی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے اور کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ میں اُن سے ناراض ہو جاؤں گا۔

وہ وفا و خلوص کے پُتلے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کو میری وفاداری کے صلے میں قتل کر دیا جائے میں ایسے لعل بے بہا کہاں سے لاؤں گا۔ ہائے جب بھائی بغاوت کریں۔ دھوکہ دیں جنگ پہ آمادہ ہو جائیں تو دوسروں پر انسان کس طرح بھروسہ کر سکتا ہے۔ میرے ان تمام امراء میں کون ایسا

ہے جس کی پیشانی پر بغاوت کا داغ نہیں۔

کتنے ایسے ہیں جو آج بھی موقع کے منتظر ہیں کہ ہم کو چھوڑ کر کسی اور کا دامن پکڑ لیں۔ یہ سب خودغرضی نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ ہر چیز کو زر و جواہر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ لیکن ملک و قوم کی بہبودی کسی کے پیشِ نظر نہیں ہائے وہ دونوں ایسے بُرے وقت میں اسیر ہوئے جب میرے امراء اور شہزادے میرے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر چکے ہیں۔

میں بڑے سے بڑے دشمن سے نہیں گھبراتا۔ لیکن مجھے رونا اس مقام پر آتا ہے جہاں خُون سفید ہو جائے جہاں احسانات کا جواب بغاوت اور سرکشی سے دیا جائے۔ جہاں محبت و خلوص کو حکومت کے پیمانوں سے دیکھا جائے۔

جہاں اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو بے دریغ قتل کر دیا جائے۔

جہاں ذاتی منفعت پر قومی منفعت کو قربان کر دیا جائے۔

افتخار و بیرم تم ایسے افراد تھے جو کبھی زر و جواہر سے خریدے نہیں جا سکتے تھے۔

تم کبھی اپنا مفاد سامنے نہیں رکھتے تھے۔

تم ہم کو ہمارے سگے بھائیوں سے زیادہ عزیز تھے۔

تم وفادار اور وفاشعار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں تم پر اتنا بھروسہ کرتا تھا۔ جتنا اعتماد مجھ کو خود اپنی ذات پر ہے۔ وہی اعتماد تمھارا تھا۔

اب میں کس سے مشورہ لوں۔ کیا کروں۔

شہنشاہ ہمایوں اسی اُدھیڑ بن میں بڑی دیر تک ٹہلتے رہے۔ آخر میں انھوں نے مرزا عسکری کو طلب کیا۔ جب شہزادہ عسکری قدم بوس ہُوئے تو شہنشاہ ہمایوں نے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : مرزا عسکری۔ تم جانتے ہو کہ ہم کو بیرم خاں اور افتخار مرزا کس قدر عزیز تھے۔

شہزادہ عسکری مرزا : جی ہاں ظلِ سُبحانی۔ وہ بڑے عاقل وفادار اور دُور اندیش انسان ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں : عسکری۔ ہم اس وقت ان دونوں کی جُدائی سے سخت پریشان ہیں۔ اس وقت تم ہماری مدد کرو۔ تو ہم تم کو چار چیزیں جو تم طلب کرو گے دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔

مرزا عسکری : جہاں پناہ۔ میں اپنے امراء سے مشورہ کر کے ظلِ سبحانی کو اس کا جواب دوں گا۔

شہنشاہ ہمایوں : بہتر۔

شہزادہ عسکری مرزا : ..... بادشاہ سے رخصت ہو کر اپنے مقام پر آئے اور اپنے امراء کو طلب کیا اور ان کو جملہ حالات سے مطلع کر کے پوچھا کہ اس وقت بادشاہ سلامت سے کیا چیزیں طلب کی جائیں۔

امراء نے کہا کہ ہم سب باہم مشورہ کر کے حضور کو وہ چیزیں بتائیں گے جن کو آپ ظلِ سبحانی سے طلب کریں۔

امراء نے آپس میں بات چیت کر کے یہ طے کیا کہ اس سلسلہ میں پہلے خود شہزادہ عسکری مرزا کی رائے لی جائے۔ اور پوچھا جائے کہ ان کی خواہش کیا ہے۔

دوسرے دن تمام امراء مرزا عسکری کے پاس آئے اور کہا کہ اس سلسلہ میں پہلے آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

عسکری مرزا : دوستو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے مال و اسباب، اجناس بنگال کی عمدہ دستکاریاں چند خوبصورت کنیزیں اور چند خواجہ سراؤں کی ضرورت ہے۔

سب لوگ شہزادہ کی بات سُنکر حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے شہزادہ سے عرض کیا کہ آپ سودا ہمارے خون اور سروں کا کر رہے ہیں اور اس کے بدلے میں چند فضول اور بیکار چیزیں طلب کر رہے ہیں۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

جب شہزادہ عسکری نے دیکھا کہ ان کے امراء نے ان کی اس رائے کو پسند نہیں کیا تو اس نے پوچھا کہ آخر آپ لوگ شہنشاہ مکرم سے کیا لینا چاہتے ہیں۔؟

ایک معمر اور باوقار شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔

شہزادۂ عالم۔ یہ وقت طاؤس و رباب کا نہیں۔ بلکہ جنگ کا ہنگام ہے۔ شہنشاہ ہمایوں پریشان ہیں۔ اور آپ کو اپنی مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ اس وقت شیر خاں کی طاقت کافی بڑھ گئی ہے۔ اور اب حالات

زیادہ نازک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ وقت زر و جواہر یا حسن سے کھیلنے کا نہیں، بلکہ تلواروں سے لڑنے اور اپنے محسن کے کام آنے کا ہے۔ یہ وقت کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے طبیعت بہلانے کا نہیں بلکہ ہماری جاں نثاری اور سپاہ گری کے مظاہرہ کا ہے۔ ہم کو عورتیں نہیں مرد چاہییں۔ جو میدانِ جنگ میں ہمارے دوش بدوش لڑ سکیں۔

اس لیے آپ شہنشاہ سے کہیے کہ ہمارے لشکر میں چند جاں باز سپاہی اور آزمودہ کار افسروں کا اضافہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ کثیر رقم کا بھی مطالبہ کیا جائے اور اس مہم کو ہمارے سپرد کر دیا جائے تاکہ ہم کو اپنی جاں نثاری دکھانے کا پورا پورا موقع ملے۔

پھر ہم دیکھیں گے کہ شیر خاں کتنا بہادر ہے۔ اور کس طرح ہمارے مقابل آتا ہے۔

حالانکہ یہ باتیں بڑی تلخ تھیں لیکن مرزا عسکری نے مصلحتِ وقت دیکھتے ہوئے اس رائے کو پسند کیا۔

اُس نے یہی بات شہنشاہ ہمایوں سے کی۔ شہنشاہ اس گفتگو سے بہت خُوش ہوئے اور اُن کے تمام مطالبات مان لیے۔ اور چیدہ چیدہ جوان، روپیہ وغیرہ دے کر شہنشاہ نے حکم دیا کہ وہ فوراً شیر خاں کی جانب روانہ ہو جائیں۔ شیر خاں سے چوکنّا رہیں اور اس کی جملہ حرکات، کی اطلاع بارگاہ سلطانی میں روانہ کرتے رہیں۔

شاہی حکم ہوتے ہی مرزا عسکری اپنے لشکر کو لے کر کوچ پر کوچ

کرتا ہُوا روانہ ہُوا۔ جب وہ کیگرام پہنچا تو اطلاع ملی کہ شیر خاں کے لشکر نے جون پور اور چنار کے قلعے فتح کر لیے ہیں اور قنوج پر فوج طلب کی جا رہی ہے۔ وہ قلعہ رہتاس کے گرد و نواح میں اپنی جماعت کو لے کر تمام راستے روکے پڑا ہے۔

مرزا عسکری نے شہنشاہ کو اس کی اطلاع دی۔ ہمایوں بھی منزل بہ منزل بڑھتے ہُوئے بہار کی جانب روانہ ہُوئے۔ مونگیر کے مقام پر دریا کے کنارے مرزا عسکری اور اُس کے جملہ امراء شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ شہنشاہ اپنے دوستوں کی جُدائی سے پریشان تھا۔ ادھر شیر خاں نے اور اُس کو پریشان کر رکھا تھا۔ دوسری طرف شہزادہ کامران اور ہندال دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں لگے ہُوتے تھے۔

شہنشاہ نے نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے پھر اپنے امراء کو طلب کیا۔ بندو بیگ نے کہا۔

بندو بیگ: جہاں پناہ موسم برسات میں بہت کم دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ کسی طرح نہایت خوبصورتی سے برسات کا موسم گزر جائے۔ میرے خیال میں اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ فی الحال دریا عبور نہ کیا جائے بلکہ اس کے کنارے کنارے جون پور تک کوچ کیا جائے۔ چند روز شہر میں ٹھہر جائیں۔ تاکہ دہلی سے تازہ دم لشکر اور سامانِ حرب پہنچ جائے۔ پوری فوج جمع ہو جائے۔ اس طرح برسات گزر جانے کے بعد آرام سے جنگ کی جائے۔

فرخ علی: میں بندو بیگ کی پُر زور تائید کرتا ہوں۔ واقعی برسات میں

جنگ کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے ہم کو کسی محفوظ مقام پر برسات کا موسم گزار دینا چاہیے۔

مونّد بیگ : جہاں پناہ۔ بندو بیگ اور ملا فرخ علی کی تجویز بڑی معقول ہے، لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ دشمن کو سامنے رکھ کر یہ تجویز مرتب نہیں کی گئی ہے۔ دشمن شیر خاں سلطنتِ مغلیہ کے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ اس کی اتنی جرأت اور ہمت کہاں کہ شہنشاہ گیتی پناہ سے ٹکرا سکے اگر ہم نے فوراً دریا پار نہ کیا تو وہ اس سے یہی نتیجہ نکالے گا کہ شاہی فوج دریا پار کرنے سے گھبرا رہی ہے۔ اس سے وہ دلیر ہو جائے گا۔ اس لیے ہم کو شیر خاں کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ دوسرے یہ معرکہ گھنٹوں یا چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے لیے برسوں کے پروگرام بنانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

شہنشاہ ہمایوں : مونّد خاں، ہم تمھاری تجویز سے بہت خوش ہوئے۔ ہم کو اتنا موقع نہیں دینا چاہیے کہ جنگل میں آیا ہوا شکار ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لیے ہم کو بسرعت دریا پار کر کے جنگ شروع کر دینی چاہیے۔

بندو بیگ : جہاں پناہ میری تمام عمر جنگ و جدال میں گزری ہے۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس موسم میں لڑائی کا آغاز کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ آپ پر بہت جلد سب کچھ روشن ہو جائے گا۔

لیکن شہنشاہ ہمایوں کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اُن کے دوست اُن سے جُدا ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بادشاہ نے اپنے خیالات کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور فوج کو

حکم دیا کہ دریا کو پار کر لیا جائے۔ لشکر نے دریا کو عبور کر لیا اور کوچ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور گئے تھے کہ یہ خبر معلوم ہُوئی کہ آج افغانی سپاہ شاہی لشکر کے عقب میں نمودار ہُوئی تھی۔ جب اس مقام سے آگے بڑھے تو پھر معلوم ہُوا کہ وہی لوگ اس میں تیر و تفنگ چلاتے ہُوئے نظر آئے۔

تیسرے روز یہ خبر ملی کہ ایک کوہ شکن توپ، جو کشتی پر چڑھائی گئی تھی۔ اُسے افغانی چھین کر لے گئے۔

بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ لوگ مسلح ہو کر آگے بڑھیں۔ چوتھے روز لشکر ہتھیاروں سے لیس ہو کر آگے بڑھا۔ ایک پہر دن گزرا تھا کہ چونسہ کے مقام پر پہنچا۔ ابھی پڑاؤ ڈالنے بھی نہ پائے تھے کہ مشرق سے گرد و غبار اٹھتا ہُوا نظر آیا۔

شہنشاہ نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں یلغار کرتا ہُوا چلا آ رہا ہے۔ اُس نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟

قاسم حسین سلطان نے کہا کہ شیر خاں آج ۹۰ کوس کی مسافت طے کر کے آیا ہے۔ اس کے تمام سپاہی اور گھوڑے خستہ و خراب ہیں۔ ہمارے گھوڑے اور سپاہی تازہ دم ہیں۔ ہم کو آج ہی جنگ شروع کر دینی چاہیے۔ دیکھیے خدا کیا دکھاتا ہے۔

شہنشاہ نے اس بات کو پسند کیا۔ مگر مؤید بیگ نے کہا کہ ہم کو عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بادشاہ نے مؤید بیگ کی بات

مان لی اور حکم دیا کہ عجلت نہ کرو۔۔۔۔ اضطراب ٹھیک نہیں۔

بادشاہ کی زبان سے یہ جواب سُنکر امراء اور سپاہی بددل ہوگئے۔ لشکر نے پڑاؤ ڈال دیا۔ شیر خاں بھی شاہی لشکر کے سامنے پہنچکر رُک گیا۔

دونوں لشکروں نے خندقیں تیار کیں اور دو ماہ تک دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں پڑے رہے، روزانہ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ دو ماہ کے بعد اتنی شدید بارش ہوئی کہ کئی دن سورج کی شکل نہ دکھائی دی۔ اور پانی سے سارا میدان بھر گیا۔ شیر خاں کا پڑاؤ ڈوب گیا۔ وہ وہاں سے اپنے خیمے اُٹھا کر ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہوگیا۔

روزانہ کے مقابلے موقوف ہوگئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ آندھی اور پانی کی مصیبت شاید شیر خاں کو صلح کے لیے مجبور کر دے۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر شیخ خلیل کو جو قطب الاقطاب شیخ الاسلام۔ شیخ فرید شکر گنج رح کی اولاد سے تھے۔ شیر خاں کے پاس بھیجا گیا۔

شیخ مذکور نے شیر خاں کو بہت کچھ نصیحتیں کیں۔ وہ بھی صلح پر آمادہ ہوگیا۔ اور کہا کہ اگر شہنشاہ ہمایوں قلعہ چنار کو میرے حوالے کر دیں تو مجھے صلح منظور ہے۔

شیخ صاحب نے یہی بات شہنشاہ ہمایوں کو لکھ بھیجی۔ لیکن شہنشاہ

اور اس کے مشیروں نے اس میں مصلحت نہ دیکھی کہ ایسے مضبوط قلعہ کو شیر خاں کے حوالہ کر دیا جائے۔

چنانچہ اس مسئلہ پر صلح کی گفتگو ختم ہو گئی۔

باب ۱۷

جنگِ چونسہ

دُنیا بے حد حسین و دل کش ہے اور شاید اس کے حسن و دل کشی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ دُنیا فانی ہے۔ یہ کائنات فانی ہے۔ ہر شے کو فنا ہونا ہے۔ یہی فنا اُن کی بقا کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اگر مے خانۂ کائنات میں بادۂ فنا کے جام نہ چلتے۔ تو اس کی ساری رنگینی۔ مستی اور حسن خاک میں مل جاتا۔ اگر فنا نہ ہوتی تو حُسن و دل کشی نہ ہوتی۔ تغیر نہ ہوتا۔ عروج و زوال نہ ہوتا بلندی اور پستی نہ ہوتی۔ دُنیا ایک حال پر قائم رہتی اور اس میں زندہ رہنا عذاب ہو جاتا۔

اگر آسمان پر ستاروں کی قندیلیں ہمیشہ یوں ہی روشن رہتیں تو اس میں کیا حسن ہوتا۔ اگر آفتاب اسی طرح دمکتا رہتا تو کیا لذت ہوتی۔

اگر ماہتاب میں عروج و زوال کی کیفیت نہ ہوتی تو شبِ ماہتاب میں متاعِ عقل و دل و جان کو کون لوٹ سکتا۔

اگر سمندر میں مدوجزر نہ ہوتا۔

اگر باغ میں خزاں و بہار نہ ہوتی تو گلوں کی مسکراہٹ دائمی پر کون نظر ڈالتا۔

اگر ابر ہمیشہ برستا رہتا - آفتاب ہمیشہ چمکتا رہتا - انسان ہمیشہ زندہ رہتا تو وہ اس زندگی اور اس کے گوناگوں ہنگاموں سے کیسے لطف اٹھا سکتا تھا۔ اسی لیے ہر خوشی کے لیے غم۔ ہر مسکراہٹ کے ساتھ آنسو، ہر نغمہ کے ساتھ نوحہ اور ہر عروج کے ساتھ زوال لگا ہوا ہے۔ تاکہ انسان ایک ہی حالت میں رہتے رہتے اُکتا نہ جائے۔

اگر انسان بچہ رہتا، یا بڑھا، یا جوان ہی رہتا تب بھی اس کے لیے کائنات میں اتنا حُسن نہ ہوتا۔

بقول شاعر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ موت ہو تو جینے کا مزا کیا

اگر موت کا یقین نہ ہوتا تو انسان زندگی سے اتنے کام نہ لیتا۔ ہر دل میں یہی چبھن ہے کہ زندگی ایک عارضی اور جلد ختم ہو جانے والی چیز ہے اس لیے کوئی ایسا کام کر چلو کہ مرنے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک نام باقی رہ جاتے۔ زندگی کے یہ سب ہنگامے موت کے دم قدم سے ہیں۔

یہ حُسن اسی لیے حُسن ہے کہ اس کو بھی فنا ہو جانا ہے۔ دُنیا کی ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ صرف رہنے والی وہی ذات ہے جس نے اس کائنات کو چاند و سورج کی قندیلوں سے روشن کیا۔ آسمان کو بلا ستونوں کے قائم کیا۔ زمین میں پہاڑ گاڑ دیے اور اُن کے سینے سے ہزاروں چشمے بہا دیے جس نے سمندر کو موتیوں، اور دامنِ صحرا کو شبنم کے قطروں، دامنِ گلستان کو

پھولوں اور دامنِ شام کو شفق کے رنگین بادلوں سے آراستہ کیا۔ انسان ساری دُنیا کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہواؤں کو مسخر کرنے میں مشغول ہے۔ وہ فضاؤں پر اپنا جال بچھانا چاہتا ہے۔ اس نے بے شک زمین کے دل کو چیر کر اُس سے لعل بے بہا حاصل کیے۔ اُس نے سمندروں پر اپنا تسلط کیا۔ یہی نہیں بلکہ آج وہ فطرت کے بہت سے رازوں سے باخبر ہو چکا ہے۔ اُس نے فطرت سے بے پناہ فائدے اٹھائے اور اس نظامِ کائنات سے بہت بڑے بڑے کام لیے۔ لیکن وہ ابھی تک اپنی حقیقت سے بے خبر ہے۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس نے یہ زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا ہے اور یہ اس کو کہاں لے جائے گا۔

وہ اپنی حقیقت سے اتنا نا آشنا اور بے بہرہ ہے کہ اُس کو نہ اپنے آنے کی خبر تھی اور نہ جانے کا غم ہے۔ یعنی :

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور تو سب جانے دیجیے۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خود اس کی زندگی کے یہ تمام ہنگامے کس وقت ختم ہو جائیں گے۔ وہ ہزاروں برس کے سامان مہیا کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے عالی شان مکان بنواتا ہے۔

پُر فضا باغات، عورتیں، کنیزیں، باندیاں، اور خدا معلوم کیا کیا اللم غلم اکٹھا کرتا ہے۔ روپیہ حاصل کرنے کے لیے وہ کیسا انسانیت کے معیارِ بلند سے نیچے اُتر آتا ہے۔ حکومت و ثروت حاصل کرنے کے لیے

وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے قتل و غارت گری، لُوٹ مار، اور ظلم وستم، فریب و دغا، غرض کہ اوچھے سے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتا ہے۔ لیکن جب موت آتی ہے تو یہی اقبال، یہی حشم، یہی جلال، یہی جمال ہاتھ جوڑ جوڑ کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ گویا ملک الموت سے کہہ رہے ہیں۔ ہم میں بلا کی دل کشی ہے۔ ہم میں بلا کی مقناطیسیت ہے۔ ہم اپنے اندر بلا کی قوت و قدرت رکھتے ہیں۔

جس انسان سے ہم قریب ہو جاتے ہیں اُس کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن ہماری منزلِ عمل یہیں تک ہے۔ ہمارا کوئی حربہ تم پر نہیں چل سکتا۔ ہم تمھارے معاملات میں بول بھی نہیں سکتے۔ زندگی کا سب ٹھاٹھ یہیں رہ جائے گا۔

حکومت، دولت، اعزا، احباب، بیوی، بچے سب یہیں ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں اور جانے والا چلا جاتا ہے۔ آج جو صاحب تخت و تاج ہیں۔ وہ کل قبر کے کسی گوشے میں پڑے ہوں گے۔ جو آج نخوت و غرور سے زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ اُن کے کاسۂ سر کل در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔

زمانہ اس گردش، انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ سکندر اعظم اور اس کا دُنیا کو فتح کرنے کا جذبہ بلند کہاں ہے۔ فرعون اور اُس کی خدائی کہاں ہے۔ دارا کہاں ہے۔ ہلاکو اور چنگیز کہاں ہے۔ اہلِ روما اور ان کی تہذیب کہاں ہے۔ اہلِ یونان اور اُن کی حکومتیں کہاں ہیں۔ اہلِ مصر اور اُن کا تمدن قدیم کہاں ہیں۔ اہرام مصری کس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ اور کس کس کی عظمتوں کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔

آج بھی دو عظیم الشان لشکر چونسہ کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل پڑے ہوئے ہیں۔ ایک سمت شہنشاہ ہمایوں کا لشکر ہے جن کو نہ صرف اپنے شہنشاہ ہندوستان ہونے پر ناز ہے۔ بلکہ اپنی قوت، اپنی فوجی طاقت اپنے مال و دولت اور اپنی اکثریت پر بھی ناز ہے۔ دوسری سمت شیر خاں کا لشکر ہے جو ہندوستان کو فتح کرنے اور مغلوں کو اس سرزمین سے باہر نکالنے کا جذبہ بلند لے کر اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اپنی سے بہت زیادہ بڑی قوت سے ٹکرانے کے لیے نکل آیا ہے۔

شیر خاں اور ہمایوں میں صلح کی بات چیت جاری تھی۔ اور شیخ جلیل اسی مقصد کے لیے شیر خاں کے کیمپ میں مقیم تھے۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر دونوں میں صلح نہ ہو سکی۔ اس وقت شیر خاں نے اپنے تمام امراء کو طلب کیا اور کہا۔

شیر خاں : دوستو آج تمھاری جاں نثاری کا وقت آگیا ہے۔ آج تم کو دکھانا ہوگا کہ افغان بڑی سے بڑی طاقت سے لڑ سکتے ہیں اور اس کو تباہ کر سکتے ہیں۔ آج مجھے ایک ایسے جاں باز ساتھی کی ضرورت ہے جو ہتھیلی پر سر رکھ کر سر سے کفن باندھ کر شہنشاہ کے لشکر پر شب خون مارے۔

امراء خاموش ہو گئے۔ کس کی ہمت تھی کہ ایک اتنی عظیم طاقت سے اس طرح بے خوف و خطر ٹکرا جائے۔ لیکن پورے مجمع میں سے خواص خاں جو شیر خاں کا دستِ راست تھا اُٹھا۔ اور کہا۔

خواص خاں : سردار مکرم۔ میں اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر مجھے حضور۔ صاحبِ شمشیر اور نامی گرامی نوجوان بمست ہاتھی، اور دلیر لشکر عنایت فرمائیں۔ تو بندہ شہنشاہ ہمایوں کے لشکر پر حملہ کرنے کی امکانی کوشش کرے گا۔ نتیجہ قسمت کے ہاتھ ہے۔

شیر خاں اپنے اس سردار خواص خاں کی اس دلیری اولوالعزمی اور جی داری پر بہت خوش ہوا۔ اُس نے اپنی فوج کے چیدہ چیدہ سوار اور مست ہاتھی وغیرہ خواص خاں کو دے دیے۔ نماز عصر کا وقت تھا کہ خواص خاں نے یہ کہہ کر کہ وہ اس دن جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ لشکر شیر خاں سے نکل گیا۔

حضرت شیخ خلیل نے اس وقت بڑی دانائی سے کام لیا۔ انھوں نے شیر خاں کے کیمپ سے شہنشاہ ہمایوں کو یہ خط روانہ کیا۔

شہنشاہ مکرم تسلیم

میں نے شیر خاں کو صلح پر آمادہ کیا تھا مگر بدقسمتی سے یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ شیر خاں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ خواص خاں ایک کثیر جمعیت کو لے کر لشکر سے نکل گیا ہے۔ اس لیے ظلِ سبحانی یہ اتفاقیہ حادثہ کے لیے تیار رہیں۔ تاکہ وہ جہاں پناہ کو غفلت میں پاکر کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے۔

دعا گو

شیخ خلیل

اس وقت بیرم خاں اور افتخار مرزا نہ تھے جو شہنشاہ کو اس آنے والی مصیبت سے آگاہ کرتے اور خود آگ میں کود پڑتے اور شہنشاہ کی حفاظت میں کبھی شمشیر اور کبھی سپر بن جاتے۔ موئد بیگ نے حسبِ عادت بادشاہ کو خُوش کرنے کے لیے پھر غلط مشورہ دیا۔ اُس نے کہا اس غلام کی ہمت تو دیکھئے کہ اُس نے یہ بھی نہ خیال کیا کہ کتنی بزرگ ہستی اس کے کیمپ میں جلوہ گستر ہے۔ اس کا کاسۂ سر، شراب نخوت و تکبر سے بھرا ہُوا ہے۔ خدا ایسے متکبر بندوں سے کبھی خُوش نہیں ہوتا۔ حضور کوئی تردد نہ فرمائیں۔ شیر خاں کی یہ مجال نہیں کہ اس قسم کا کوئی قدم اٹھائے ہم آپ کے لیے سینہ سپر ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں موئد بیگ کی ان باتوں سے مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے شیخ خلیل کی تحریر کا بھی کوئی اثر قبول نہ کیا۔

رات غفلت میں گزری۔

دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے قبلہ کو پشت بنا کر پوری قوت اور شجاعت سے شاہی کیمپ پر ٹوٹ پڑا۔ یہاں آکر اُس کے جاں بازوں نے میان سے تلواریں نکال لیں اور غافل سپاہیوں کو تہِ تیغ کرنا شروع کر دیا۔

لوگ ابھی حالات سے پوری طرح واقف بھی نہ ہونے پائے

تھے کہ موت کی آغوش میں جانے لگے۔ اس سے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ لوگ بے ترتیبی سے اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ وہ سمجھے کہ عذابِ الٰہی ان پر نازل ہو گیا ہے۔ جب شہنشاہ کو اس اچانک حملہ کا علم ہُوا تو وہ فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے طبل بجانے کا حکم دیا۔ لیکن خواص خاں کی فوج نے شاہی خیمے کو فوجی خیموں سے کاٹ دیا تھا اور لشکر کو منتشر کر دیا تھا اتنے بڑے لشکر میں سے صرف تین سو سپاہی شہنشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو سکے۔ ہمایوں بڑے استقلال نظم و ضبط کا حکمران تھا۔ اس نے ان تمام حالات کے باوجود ہمت نہ ہاری اور ان تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑا۔

لیکن یہ سوار بھی افغانوں کی کثرت اور لشکر کو بے تحاشا بھاگتے ہُوئے دیکھ کر بد دل ہو گئے۔ اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایسے خطرناک موقع پر بھی شہنشاہ ہمایوں کے پائے استقامت کو ذرہ برابر لغزش نہ ہُوئی وہ اپنے مقام پر نہایت ہی سکون و اطمینان سے جما رہا۔ اتنی دیر میں اس نے دیکھا کہ ایک جنگ جو ہاتھی اس سمت بڑھا چلا آ رہا ہے۔ بادشاہ اپنے چند رفقائ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس مختصر سے گروہ میں میر بچکہ اور اس کے بیٹے۔ گرگ علی اور ٹھٹھہ بیگ بھی تھے۔ یہ تینوں باپ بیٹے اپنی شجاعت کی وجہ سے بہت مشہور اور نامور تھے۔ شہنشاہ نے ان کی جانب دیکھا۔ اُنھوں نے سر جھکا لیا۔

شہنشاہ نے دیکھا کہ لشکر کے فرار سے یہ تینوں بُری طرح دل برداشتہ

ہو گئے ہیں۔ اور ہاتھی سے جنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو شہنشاہ ہمایوں نے خود بڑھ کر گرگ علی کے ہاتھ سے نیزہ چھینا اور ہاتھی کی پیشانی پر پوری قوت سے وار کیا۔ نیزہ ہاتھی کے سر میں پیوست ہو گیا۔ ہاتھی کے ہودج میں ایک تیر انداز بیٹھا تھا اس نے شہنشاہ ہمایوں کے تیر مارا جو اِن کے شانے کو زخمی کرتا ہُوا نکل گیا۔ شہنشاہ وہاں سے فارغ ہو کر پھر اپنے دوستوں کے قریب آیا اور للکار کر کہا۔ ہمت نہ ہارو۔ بڑھو، حملہ کرو۔ فتح و شکست قسمت کے ہاتھ ہے۔ لیکن کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ افغانوں نے شاہی لشکر کو درہم برہم کر دیا۔

اس اثنا میں ایک شخص آیا اس نے شہنشاہ کے گھوڑے کی عنان کو بوسہ دیا اور کہا :

شہنشاہ مکرم۔ یہ وقت لڑنے کا نہیں۔ فوج درہم و برہم ہو چکی ہے۔ آپ کس کی قوت پر لڑیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی جان بچا لیے۔ آپ اگر زندہ رہے تو ایسے ہزاروں لشکروں کو پھر زیر کر سکیں گے۔

شہنشاہ ہمایوں نے اس شخص کی رائے کو مان لیا اور دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ گردباد نامی ایک ہاتھی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مہاوت سے شہنشاہ نے کہا کہ ہاتھی کو بڑھائیے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ بڑھا۔ بادشاہ نے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ وہ بھی اس کی رانوں سے نکل گیا۔ اس اثنا میں ایک آدمی مشک لے کر آموجود ہُوا اُس

نے بادشاہ کو اشارے سے مشک لینے کو کہا۔ اللہ اللہ کیا انقلاب ہے۔ جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر ہزاروں لوگ اپنے دل و جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ لاکھوں شخص جس کے پسینہ پر اپنا خون بہانے پر آمادہ رہتے تھے۔ لاکھوں انسان جس کو سجدہ کرتے اور اپنا شہنشاہ مانتے تھے۔ جس کے قلمرو حکومت میں تمام ہندوستان کی شہنشاہی تھی۔ جو اس ملک کے سپید و سیاہ کا مالک تھا۔ آج اس طرح یکّہ و تنہا، بے مونس و غم خوار۔ اپنی زندگی بچانے کی جد و جہد کر رہا ہے۔ ایک حکومت دم توڑ رہی تھی۔ ایک ستارہ غروب ہو رہا تھا اور دُور فضائے بسیط پر ایک نیا ستارہ اُبھرتا نظر آ رہا تھا۔ ایک چراغ بجھ رہا تھا اور دوسرا چراغ روشن ہو رہا تھا.... ایک صاحب تخت و تاج، فقیر و بے نوا کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا اور ایک دوسرے گدائے بے نوا کے سر پر تاج زرین پوری تابناکیوں کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ایک شکست کھا چکا تھا۔ دوسرا شکستوں پر شکست دیے چلا جا رہا تھا۔

ایک کا اقتدار دم توڑ رہا تھا۔ اقبال ہاتھ مَل رہا تھا۔ اور دوسرے کا اقتدار و اقبال روز بروز بڑھ رہا تھا۔ وارثِ تخت بابری مغلیہ حکومت کو چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ اور ایک دوسرا جس نے کبھی حکومت کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ وارث تخت و تاج بن رہا تھا۔ اس سے پتہ چلا۔ کہ ان ملکوں کا مالک کوئی اور ہی ہے۔ وہ جس کو

چاہتا ہے گدائے بے نوا سے شہنشاہ بنا دیتا ہے اور جس شہنشاہ والاتبار سے چاہتا ہے۔ ذرا دیر میں اس کا تخت وتاج چھین لیتا ہے۔ وہی حکومتوں کا عطا کرنے والا اور عطا کی ہوئی حکومتوں کا واپس لینے والا ہے۔ وہی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت و بزرگی عطا فرماتا ہے اور جب وہ کسی کو راہِ راست سے بھٹکتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی بزرگی اس سے واپس لے لیتا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں چونسہ سے بڑھتا ہوا کالپی پہنچا۔ راستہ میں کچھ لوگ اور بھی مل گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ تھکا ہوا قافلہ آگرہ پہنچا۔ آگرہ نے کبھی کاہے کو اپنے شہنشاہ کو اس عالم میں دیکھا تھا۔ تمام امرا، سپاہی، اہل شہر، شہنشاہ کے استقبال کے لیے شہر پناہ سے باہر نکل آئے۔ اس وقت مرزا کامران باغ زرفشاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب اُس کو شہنشاہ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ حیلہ ساز اور وفا ناشناس دوڑا ہوا آیا اور بادشاہ کی قدم بوسی کی۔

ہمایوں جس کے پہلو میں دل کی جگہ محبت اور خلوص تراشا ہوا رکھا تھا۔ اُس نے جب اپنے برادر نافرمان کے آنے کی خبر سُنی تو گھوڑے سے اُتر کر کامران سے بغل گیر ہوا۔ اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب شہنشاہ کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے کچھ عرصہ گزرا تو کامران نے کہا کہ حضرت سلامت سفر سے آئے ہیں۔ سفر کی کوفت ہوگی۔ مناسب یہی ہے کہ شہنشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوں آپ میری اور ہندال کی خطا بخش دیجیے۔ وہ

اس وقت تلوار کے مقام پر ہے۔

ہمایوں نے فوراً ہندال کو بخش دیا اس کے بعد وہ تخت پر بیٹھا۔ اُس نے نظام سقہ کو جس نے اپنی مشک دے کر اس کی مدد کی تھی حسب وعدہ دو گھنٹہ کے لیے تخت پر بٹھایا۔ اور دو گھنٹہ تک وہ حکمران رہا۔

آگرہ میں شہنشاہ کے ورود کے چند دن بعد بادشاہ نے باغ فردوس مکانی کے سنگین محل میں ایک مجلس منعقد کی جس میں مرزا کامران۔ مرزا ہندال اور یادگار ناصر مرزا اور مرزا عسکری کو دعوت دی۔ ہمایوں نے ان برادران یوسف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : میں شہزادہ ہندال سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اُس نے ایسے نازک وقت میں میرا ساتھ کیوں نہیں دیا۔

مرزا ہندال : نے خجالت سے کہا : شہنشاہ مکرم میں خود ناتجربہ کار ہوں۔ زاہد بیگ جیسے امراء نے مجھے بہکایا۔ اور غلط راہ پر ڈال دیا۔ میں اِس ناعاقبت اندیشی اور کوتاہی سے سخت نادم ہوں۔ ہمایوں جانتا تھا کہ ان سب کا سرغنہ اور مفسدوں کا سردار کامران ہے۔ اس لیے اُس نے کہا۔

شہنشاہ ہمایوں : مرزا ہندال۔ ہم نے مرزا کامران کی سفارش پر تمھارا قصور معاف کیا۔ ہم آج تم سب کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے شیر خاں کو قوت بڑھانے کا موقع دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہم آپس میں متحد نہ تھے۔ اب اگر تم میں سے کسی کے

دل میں شہنشاہ ہونے کی ہوس ہے تو میں بخدا اس تخت و تاج کو چھوڑنے کے لیے آمادہ ہوں اور اس کو حکومت کرنے کا پورا موقع دینے کو تیار ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ جس حکومت کو فردوس مکانی نے اتنی خوں ریزی اور جفاکشی کے بعد حاصل کیا وہ پھر ہماری نا اتفاقی سے کسی دوسرے کے قبضہ میں چلی جائے۔

مرزا ہندال : جہاں پناہ۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں آئندہ ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔

مرزا کامران : شہنشاہ معظم۔ بے شک ہم سب کا یہی فرض ہے کہ جنت مکانی کی محنت سے حاصل کیے ہوئے تخت و تاج کی تلوار کی دھار سے حفاظت کریں۔ اس لیے میری آرزو یہی ہے کہ جہاں پناہ دارالخلافہ میں رہیں۔ اور مجھے شیر خاں سے لڑنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ تاکہ میں اپنی خدمت کو بجا لا سکوں۔

شہنشاہ ہمایوں : نہیں شہزادے کامران ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ شیر خاں نے چونسہ کے مقام پر ہم کو شکست دی۔ اس لیے قاعدے سے ہم ہی کو اس سے انتقام لینا چاہیے۔

بالآخر یہی طے پایا کہ کامران آگرہ میں رہیں اور خود شہنشاہ اس مہم کو سنبھالیں۔

یہ بھی شہنشاہ ہمایوں کے عظیم کردار کا ایک معجزہ تھا کہ بھائیوں کے خلوص اور امراء کی محبت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود

وہ ایک مرتبہ پھر قنوج کے میدان میں شیر خاں سے ایک فیصلہ کُن جنگ کرنے کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ اُسے افسوس اپنی شکست کا نہ تھا بلکہ اپنے عزیز ترین دوستوں سے چھوٹ جانے کا تھا۔ غرضکہ شہنشاہ ہمایوں ایک مرتبہ پھر شیر خاں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہُوا۔ شاہی فوج علی پور پہنچ کر خیمہ زن ہُوئی۔ اس مقام پر شہنشاہ نے تمام امراء اور منصب داروں کو خلعتوں سے سرفراز کیا۔ اور حسبِ مراتب ان کو اعزاز بخشا۔ شہنشاہ کے ہمراہ دس ہزار افراد تھے۔ مرزا کامران کو یہاں سے آگرہ کی طرف روانہ کیا۔ اور خود آگے روانہ ہُوا۔ جب مرزا کامراں آگرہ پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ ابوبقا اور دوسرے بعض امراء جو آگرہ میں موجود تھے۔ مرزا کو لے کر آگرہ سے لاہور چلے گئے۔ ادھر شہنشاہ ہمایوں شیر خاں کے مقابلہ کے لیے شیرِ نر کی طرح آگرہ سے قنوج پہنچا۔ شاہی فوج دریائے گنگا کے کنارے فروکش ہُوئی۔ ادھر شیر خاں بھی اپنا لاؤ لشکر لے کر شہنشاہ ہمایوں کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔

عاشورہ کے دن شاہی لشکر نے دریا عبور کیا اور ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر میدان میں آیا تو صف آرائی شروع ہُوئی۔ میمنہ پر شیر خاں کے بیٹے جلال خاں کے مقابلہ پر مرزا ہندال اپنے جان باز سپاہیوں کے ہمراہ متعین ہُوئے۔ میسرہ پر مرزا عسکری، خواص خاں کے مقابلہ پر کھڑے ہُوئے۔ طبلِ جنگ بجا۔ لڑائی شروع ہُوئی۔ دونوں فوجیں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ اس روز اس غضب کا رن پڑا کہ شاید چشمِ فلک نے بھی ایسی لڑائی نہ دیکھی تھی۔ تلواریں چل

رہی تھیں۔ نیزے اپنا کام کر رہے تھے۔ تیر چلوں سے ملے ہوئے تھے۔ کمانیں کڑک رہی تھیں۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں۔ خون کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف فوجی باجوں گھوڑوں کی ہنہناہٹ، تلواروں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے ایسا شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جنگ شباب پر تھی کہ اسی دوران میں شہنشاہ کو خبر ملی کہ مرزا ہنداں نے دشمنوں پر فتح پائی۔ لیکن مرزا عسکری جو خواص خاں کے مدمقابل تھا شکست کھا رہا ہے۔ مرزا حیدر نے اس وقت یہ درخواست کی کہ اگر حکم ہو تو زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔ حکم ہوا ہاں توڑ دیا جائے۔ ان کا ٹوٹنا تھا کہ ایسا محسوس ہوا کہ دریا کے پانی کا بند ٹوٹ گیا۔ فوج کی موجیں ادھر سے اُدھر ہو گئیں اور شاہی فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ اپنے بیگانوں میں تمیز نہ رہی۔ فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں۔

اسی ہلچل میں ایک شخص نے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا۔ شاہی گھوڑے کی پیشانی پر تلوار کا ایسا تُلا ہوا ہاتھ مارا کہ گھوڑا قابو سے باہر ہو گیا اور جنگ چونسہ میں جو چراغ بجھ رہا تھا وہ قنوج میں ایک مرتبہ اور بھڑکا پھر خاموش ہو گیا۔

شہنشاہ نے جنگ کے واقعہ کو خود اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا تھا کہ اس روز میں نے دیکھا کہ دریا کی جانب سے افغانی فوج مغلوں کو گھیر رہی ہے۔ میں نے چاہا کہ ان پر حملہ کروں۔ لیکن اتنے میں میرے گھوڑے کی عنان پکڑ کر مجھے کوئی دریا کے کنارے چھوڑ گیا۔ یہاں مجھے

حضرت فردوس مکانی کے ہاتھیوں میں سے ایک بوڑھا ہاتھی قریب آیا۔ عماری میں ایک خدمت گار بیٹھا تھا اُس نے مجھے سلام کیا۔ نام پوچھا تو کہا۔

لوگ مجھے کافور کہتے ہیں۔ اس نے ہاتھی کو بڑھایا میں اس پر سوار ہوا۔ فیل بان سے کہا کہ اسے دریا میں لے چل، اس نے جواب دیا۔ ہاتھی ڈوب جائے گا۔ خواجہ کافور نے کہا کہ فیل بان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ حضور کو افغان فوج کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اگر حضور اس کو قتل کر دیں تو بہتر ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ پھر ہاتھی کون چلائے گا۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ خود اس فن سے واقف ہے۔ اس پر میں نے شمشیر کھینچی اور ایک ہی وار میں اُس کا سر الگ کر دیا۔

خواجہ کافور نے اُسے دریا میں پھینک دیا اور خود ہاتھی کو دریا میں لے چلا۔ جب میں دریا کے دوسرے کنارے پہنچا تو ہاتھی سے اُتر آیا۔ لیکن کنارا اس قدر بلند تھا کہ میں اوپر نہ چڑھ سکتا تھا۔ اس لیے دریا کے کنارے کنارے چلتا رہا۔

ایک مقام پر دیکھا کہ چند مغل آہ و زاری کر رہے ہیں۔ جب اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ دوڑے ہوئے آئے اور اپنے شملوں کو گرہ دے کر میری طرف پھینکا اور اس طرح مجھے اوپر نکالا۔ انھوں نے مجھے ایک گھوڑا پیش کیا جس پر بیٹھ کر میں آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔

اس وقت مجھے اپنے بھائی مرزا ہندال کا خیال آیا کہ کاش وہی میرے ہمراہ ہوتا۔ ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ مرزا ہندال بھی مجھ سے

آملا اور اس طرح خدا نے میری اس آرزو کو پورا کیا۔

اس کے بعد شہنشاہ ہمایوں اپنی شکستہ جماعت کے ساتھ اپنے بھائی مرزا ہندال اور یادگار ناصر مرزا کو ہمراہ لے کر آگرہ کی جانب روانہ ہوئے۔ یہاں وہ سید رفیع الدین کے محل میں قیام پذیر ہوئے۔ مرزا ہندال کو بُلا کر حکم دیا کہ قلعہ میں جاکر اُن کی والدہ، اہل وعیال، خزانہ اور چند ایسے ملازمین کو جن کو وہ پسند کرے، اپنے ہمراہ لے آئے۔

شہنشاہ نے جو کچھ حاضر تھا نوش کیا۔ اس کے بعد سید رفیع الدین نے عرض کیا کہ دُنیا کے کاروبار بہتے ہوئے دریا کی طرح ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور اس مقام سے کوچ کر جائیں۔

شہنشاہ یہاں سے سوار ہو کر سیکری پہنچا۔ اثنائے راہ میں مرزا ہندال بھی خزانہ و اہل وعیال کے ساتھ آکر قدم بوس ہوا۔ سیکری میں صبح کو جب شہنشاہ ہمایوں باغ فردوس میں بیٹھا تھا کہ سامنے کی پہاڑی سے ایک تیر آیا۔ اس پر دو آدمی تیر کی تحقیقات پر روانہ ہوئے مگر دونوں راہ میں زخمی ہوگئے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ مقام خطرہ سے خالی نہیں۔

جب بادشاہ بجونہ کے مقام پر فروکش ہوا تو مرزا عسکری نے آکر عرض کی شیر خاں نے فرید گور کو ہمارے تعاقب میں روانہ کیا ہے۔ شہنشاہ مکرم سوار ہو جائیں۔ کہیں دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ ہو جائے۔ اس لیے اگر یہاں سے کوچ کیا جائے تو بہتر ہے۔

شہنشاہ ابھی سوار بھی نہ ہوئے تھے کہ سارے لشکر میں شور مچ گیا۔ اتنا زبردست طوفان اُٹھا کہ دُنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ اس وقت کسی نے کسی کی مدد نہ کی اور سب بے تحاشا بھاگنے لگے۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ لوگ بہت بد دل ہیں تو گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا۔ شہنشاہ نے تمام ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

دوستو۔ میں ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ لیکن آج مجھے اس طرح در بدر کی خاک چھاننا پڑ رہی ہے کل تک میری خدمت میں روم و شام، عراق، غرض ہر ملک کے لوگ موجود تھے۔ اس میں کچھ چوسنہ کی جنگ میں کام آئے اور کچھ جنگ قنوج میں قتل ہو گئے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم نہایت ہی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہُوئے آگے بڑھیں۔ اگر ہم مارے جائیں تو ہم کو اس کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔

لیکن ہمایوں کی باتوں کا اہل لشکر پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ سرپٹ دوڑنے لگے۔

شہنشاہ ہمایوں بھی سفر کی صعوبتیں اُٹھاتا ہُوا لاہور کی سمت بڑھ رہا تھا۔ آخر وہ لاہور پہنچا۔ اُس نے مظفر بیگ ترکمان کو بُلا کر حکم دیا کہ مرزا ہندال اس وقت جالندھر میں ہے۔ اُس کی مدد کو جاؤ۔ ہمایوں نے اس دوسری شکست سے بھی ہمت نہ ہاری۔ وہ حراسان اور پریشان ہونا جانتا ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ لاہور میں مرزا کامران اور دوسرے بھائیوں کی اعانت حاصل کرنے کے خیال سے آیا تھا۔ ہمایوں نے یہ علاقہ مرزا کامراں

کے سپرد کیا تھا۔

ادھر شیر خاں دہلی پر قبضہ کر چکا تھا۔ لیکن ہمایوں کا ہندوستان میں وجود اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

ہمایوں نے لاہور میں کامران کے یہاں اس کو اپنا بھائی سمجھ کر پناہ لی تھی۔ لیکن کامران یہ سمجھ رہا تھا کہ شکار قبضہ میں آ گیا ہے۔ شیر خاں سے اس سلسلہ میں کیوں نہ گفت و شنید کی جائے۔ چنانچہ بھائی کے دشمن کو کامران نے صلح کا پیغام بھیجا۔

لیکن شیر خاں بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہُوئے نہ تھے۔ اُس نے صاف کہلا بھیجا کہ حالات کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اب صلح کا کیا سوال ہے۔ یہ سب کچھ ہُوا۔ لیکن پھر بھی کامران اپنی فطری پستی اور رذالت سے باز نہ آیا۔ اُس نے امراء اور دوسرے شہزادوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی۔ جب ہمایوں کو ان تمام باتوں کا علم ہُوا اور لوگوں نے اس پیکرِ حلم و وفا سے کہا کہ کامران کو قتل کر دیجیے تاکہ سارے فتنے ختم ہو جائیں۔ تو ہمایوں نے یہی جواب دیا کہ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ اس چار دن کی زندگی اور دو روزہ عیش و آرام کی خاطر اپنے ہاتھوں کو اپنے بھائیوں کے خُون سے رنگین کر دوں اور دُنیا حاصل کرنے کے لیے آخرت کو قربان کر دوں۔ اور اپنے والد کی نصیحت کو بُھلا دوں یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔

ادھر کامران علانیہ طور پر شاہی لشکر سے جُدا ہو گیا تھا۔ بادشاہ

نے جب بھائیوں کی نگاہیں بدلی ہُوئی دیکھیں تو لاہور سے ہزارہ کی طرف روانہ ہُوا۔ صبح کو اس کو معلوم ہُوا کہ مرزا کامران اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مسلّح ہو کر فوج کشی کے ارادہ سے آرہا ہے۔ لوگوں نے شہنشاہ سے مسلّح ہونے کے لیے پوچھا۔ مگر انھوں نے منع کر دیا۔

تھوڑی دیر میں مرزا کامران دربار میں خود ہی قدم بوس ہُوا۔ اور کہا حضور جب سے ہندوستان آیا ہوں پریشان ہوں اس وقت تک سارا وقت جنگ و جدال میں گزرا۔ اسی وجہ سے میرے ملازمین اور ساتھی بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اگر حضور اجازت دیں تو کابل روانہ ہو جاؤں تاکہ وہاں سے میں اپنی تازہ دم فوج لے کر آسکوں، اور حضور کی خدمت کر سکوں۔

شہنشاہ نے تاڑ لیا کہ یہ میری مدد نہیں کرنا چاہتا اور پہلو تہی کر رہا ہے تو انھوں نے اس فتنہ کو دُور ہی رکھنے کے لیے اسے کابل جانے کی اجازت دے دی۔ اور اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ ابھی مرزا کامرانؔ شاہی سپاہ سے اپنا لشکر لے کر نکلا ہی تھا۔ کہ ہزارہ کے مقام پر ہمایوں کو مرزا ہندال اور یادگار ناصر مرزا وغیرہ کے شاہی جماعت سے علیحدہ ہونے کی اِطلاع ملی۔

بادشاہ اپنی بے کسی اور تنہائی پر رو دیا —— مگر اس نے صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ...... شہنشاہ ہمایوں کا لشکر روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ شہنشاہ بے تاج اور بادشاہ بے ملک اس طرح اذیتیں اُٹھانے

چلا جا رہا تھا کہ اُسے خواجہ کلاں کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اگر آپ مجھے بھیرہ کا حاکم بنا دیں تو میں ہر طرح حضور کی خدمت کروں گا۔

بادشاہ نے اُس کو تائید غیبی سمجھا اور اپنے چالیس ساتھیوں کے ہمراہ دریا پار کیا اور رات بھر چلنے کے بعد شہر بھیرہ میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی شہنشاہ کے بخت خفتہ نے نیا شگوفہ کھلایا۔ اور اس کو پھر اپنے بھائیوں پر برادرانِ یوسف کا شبہ ہوا۔ اسے معلوم ہوا کہ اُس کے پہنچنے سے قبل کامران بھیرہ میں آیا اور خواجہ کلاں کو گرفتار کر کے لے گیا۔

شہنشاہ ہمایوں کو اپنی حکومت کے کھو جانے کا اتنا غم نہ تھا جتنا اپنے بھائیوں کی غداری اور امراء کی طوطا چشمی کا تھا۔ یہ اُس کا دل گردہ تھا کہ وہ پھر بھی ان پر بھروسہ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

باب ۱۸

بیرم خاں کی قید سے رہائی

بنگال سے واپسی پر ہمایوں نے افتخار مرزا، ابوالقاسم اور بیرم خاں کو مونگیر روانہ کیا تھا جہاں خواص خاں نے عالم غفلت میں ان پر شب خون مارا تھا اور ان کو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کے لیے یہ صدمہ نہایت جاں کاہ تھا۔ انھوں نے پے در پے افغان کی اس قوت کو ختم کرنے کے لیے جو شیر خاں کی شکل میں پیدا ہو گئی تھی۔ ان پر فوج کشی کی۔ تاکہ وہ اپنے دوستوں کو جمال خاں کے ہاتھ سے نجات دلا سکے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چوں کہ شہنشاہ کا اقبال رخصت ہو چکا تھا۔ اس لیے مغلوں کو ہر جگہ شکست اور افغانوں کو فتح حاصل ہوتی ——— یہاں تک کہ شہنشاہ ہمایوں گدائے بے نوا۔ اور شیر خاں شہنشاہ ہو گیا۔

خواص خاں، بیرم خاں اور اُن کے ساتھیوں کو لے کر قنوج گیا اور یہاں کے حاکم کو حکم دیا کہ وہ ان قیدیوں کے ساتھ جیسا سلوک چاہیے روا رکھے۔ حاکم قنوج ان تینوں کے سروں کو شہنشاہ شیر شاہ سوری کی خدمت میں بھیج کر پروانۂ خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جب راجہ ترسین حاکم لکھنؤ اور رشید علی حاکم سنبھل کو اس وحشت ناک

بات کا علم ہُوا تو وہ لرز گئے۔ وہ بیرم خاں کی بے مثال شخصیت کے نہ صرف یہ کہ مداح تھے بلکہ زیر بار احسان بھی تھے۔ وہ دونوں حاکم قنوج کے پاس گئے اور ان کو سمجھا بجھا کر قیدیوں کو اپنی پناہ میں لے آئے۔

راجہ ترسین اور سید علی نے ان تینوں قیدیوں کی بڑی خاطر مدارات کی اور عرصہ تک ان تینوں کو اپنے یہاں چھپائے رکھا۔ خواجہ ترسین کے محل کے ایک زمین دوز تہ خانہ میں یہ تینوں بدنصیب بیٹھے ہُوئے آپس میں تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔

بیرم خاں : افتخار مرزا غضب ہو گیا۔ مغلوں کی بساطِ حکومت اُلٹ گئی۔ ہائے جس حکومت کو شمشیر بابری نے ہندوستان میں قائم کیا تھا وہ کس طرح تباہ و برباد ہو گئی۔ ہائے اس وقت شہنشاہ ہمایوں کا کیا حال ہو گا۔ مجھے اپنے بے وقت کی گرفتاری پر غصہ آ رہا ہے۔ کاش میں جنگ چونسہ اور جنگ قنوج میں موجود ہوتا۔ اور پھر قید کر لیا جاتا تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا۔ لیکن یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

افتخار مرزا : بیرم خاں، میں خود اس غیرت سے مرا جا رہا ہوں کہ اگر قید سے رہائی بھی ملی، تو وہ آزادی اس گرفتاری کے مقابلہ میں کتنی تکلیف دہ ہو گی ہم کس طرح افغانوں کے زیر سایہ رہ سکیں گے کیا ہمایوں اس کھوئی ہُوئی حکومت کو پھر حاصل کریں گے!

ابوالقاسم : نہیں موجودہ حالات میں یہ بات ناممکن ہے۔ سُنا ہے کہ شہنشاہ کے ساتھی روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ غیروں کا ذکر

ہی کیا۔ سُنا ہے ایسے نازک وقت میں مرزا کامراں نے شہنشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور بہانہ کرکے کابل چلا گیا۔ دوسرے شہزادے بھی اپنا مستقبل شیر خان سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی قسم کی خُوش فہمی میں مبتلا ہونا نادانی ہے۔

بیرم خاں: افسوس، سب سے بڑا صدمہ یہی ہے کہ عظمتِ بابری، اور جلال تیموری و چنگیزی کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہی لوگ ہیں جن کی رگوں میں ان بزرگوں کا لہو دوڑ رہا ہے۔ افسوس اس گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگی۔ اور اس آگ نے نہ صرف ان کی سطوتِ دیرینہ اور عظمتِ پارینہ کو جلا کر خاک کردیا بلکہ ان کے جاہ و جلال، ان کی حکومت اور اُن کے وجود تک کو خاک میں ملا دیا۔

افتخار مرزا: افسوس یہ ہے کہ ان تمام حادثات سے بھی اُن کی آنکھیں نہ کُھلیں۔ آج بھی وہ متحد نہیں ہیں۔ کامران مرزا، شیر خاں سے صلح کرکے اپنے علاقہ کو شیر شاہ سوری کے تسلط سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کمبخت کو اتنی بھی غیرت نہ آئی کہ جس بلند شخصیّت نے اس کو اس تمام علاقہ کا حاکم بنایا۔ وہ اس کے پاس مدد کو آئی ہُوئی تھی۔ اس نے اس زمانہ میں شیر خاں کو صلح کے لیے لکھا۔ اس کے امراء سے ساز باز کی۔ ان باتوں کا شہنشاہ ہمایوں کو کس قدر احساس ہُوا ہوگا۔

بیرم خاں: اب ہم لوگ کس امید پر زندہ رہیں۔ کیا یہ ہاتھ جو ہمیشہ افغانوں سے لڑتے رہے۔ ان کو اب افغانوں کی بعیت کے لیے

بڑھانا پڑے گا۔ کیا وہ تلوار جو ہمیشہ افغانوں کے خلاف بلند ہوئی۔ کیا اب ان کے حق میں علم ہوگی —— کیا یہ سر جو ہمیشہ افغانوں کے سامنے سربلند رہا اب ان کی بارگاہ میں جھک جائے گا۔ کیا یہ قدم اب بارگاہ افغانی کا طواف کریں گے۔ افتخار یہ کیا انقلاب ہے —— کیا مشیت کو یہی منظور تھا۔ کیا ہماری گرفتاری کا یہی مفہوم تھا۔ کیا شہزادوں کی شرارت کا یہی مقصد تھا۔ کیا مؤید بیگ کے مشوروں میں یہی راز مضمر تھا۔

افسوس ہم بدنصیب ہیں جو اس طرح ذلت و رسوائی کے لیے زندہ رہ گئے۔ کاش ہم جنگ قنوج میں قتل ہو جاتے۔ یا پھر شہنشاہ ہمایوں کے پاس ہوتے۔

ابوالقاسم : میں نے یہاں سے فرار ہونے کی ایک تدبیر سوچی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ کسی دشمن نے شیر خاں سے یہ مخبری کر دی کہ ہم حاکم سنبھل اور راجہ ترسین کی سرپرستی میں ہیں۔ اور برائے نام قید ہیں۔ ورنہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شہنشاہ شیر شاہ سوری نے ہم کو فوراً طلب کیا ہے۔ راجہ ترسین یا کسی اور کی اب یہ جرأت نہیں کہ ہم کو شیر شاہ سوری کے دربار میں پیش نہ کرے۔

ابوالقاسم : یہ سب وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔

افتخار مرزا : میں نے ناہید سے چند وعدے کیے تھے۔ اس کے بوڑھے باپ نے مرتے وقت اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا۔ لیکن ناہید

کو جمال خاں اُڑا کر لے گیا۔ میں اس امید پر جی رہا تھا کہ شہنشاہ ہمایوں کی فوجیں جلد افغانیوں کی سرکشی کا خاتمہ کر دیں گی اور میں ناہید کو پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن افسوس قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ کل تک سارا ہندوستان ہمارے چشم و ابرو کے اشارے پر رقص کرتا تھا۔ پنج ہزاری کا عہدہ، شہنشاہ ہمایوں کی قربت۔ اقبال غلام، اور کامیابی خادم تھے۔ آج ہم کیا ہیں۔ اسیر۔ قیدی، باغی، پناہ گیر، بے گھر، بے در اور شیر شاہ سوری کی نظر کرم کے مستحق۔ اس کے برخلاف جمال خاں جو پہلے نان شبینہ کو محتاج تھا۔ اب شیر شاہ سوری کا مشیر خاص بن گیا ہے۔ اب میں کس قوت سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ کس طرح اس سے ناہید کو حاصل کروں۔ اب تک ناہید مجھ سے محبت کرتی تھی — کیونکہ افغانیوں کا مستقبل تاریک تھا اور ان کا روئے زمین پر کوئی وجود نہ تھا۔ اور سلطنت مغلیہ کا سورج نصف النہار پر پہنچا ہُوا تھا۔ آج اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج وہ کیوں اپنے خاندان، قبیلے، روپیہ پیسہ، حکومت، عہدہ، منصب اور اپنے خون کو چھوڑ کر مجھ جیسے فقیر بے نوا کے پاس آجائے گی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ ایک مرتبہ میں ناہید سے مل لوں۔ ایک مرتبہ میں یہ دیکھ لوں کہ اس عظیم انقلاب نے ناہید کے دل و دماغ پر کیا اثر قائم کیا۔ اگر وہ مجھ سے بدظن ہو گئی ہے تو میں اس کا خیال چھوڑ کر جنگل آباد کر دوں گا۔ خار مغیلاں سے دل بہلاؤں گا۔ دشت نوائی اور بادیہ پیمائی کروں گا۔ اور اس طرح اُس کے فراق

میں اپنی زندگی کو ختم کردوں گا۔

بیرم خاں : افتخار احمق نہ بنو۔ محبت کرنے کا حق صرف تم کو تنہا حاصل نہیں۔ عشق کا تیر صرف تمھارے ہی دل میں پیوست نہیں، عشق کی آگ میں صرف تم ہی تپاں نہیں۔ یہاں صرف تم ہی حُسن کے صدمے اٹھاتے ہُوئے نہیں بلکہ میں اور ابوالقاسم بھی۔ اس عشق کے تیر کے گھائل ہیں۔ تم کو کم از کم یہ اطمینان ہے کہ ناہید دشمنوں کے نرغہ میں نہیں۔ بلکہ دوستوں اور عزیزوں کے درمیان ہے۔ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ جمال خاں اس سے محبت کرتا ہے اس لیے وہ اسے کسی قسم کی کوئی اذیت پہنچانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس کو دنیا کے تمام عیش و آرام حاصل ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ تمھاری جُدائی میں بے قرار ہوگی۔ لیکن میری اور ابوالقاسم کی بدنصیبی پر غور کرو۔ گُل رُخ اور انجمن آرا جنھوں نے اپنی زندگی کا تمام وقت عیش و آرام میں گزارا۔ خدا معلوم وہ آگرہ ہی میں ہیں یا آگرہ کو چھوڑ کر کسی دیہات میں روپوش ہوگئی ہیں —— وہ ہمارا کس بے قراری سے انتظار کر رہی ہوں گی۔ افسوس ہم اب سوائے آنسو بہانے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ چھپ کر انجمن آرا سے ملاقات کرسکوں۔ ہائے مجھے کون آگرہ جانے دے گا۔ میں کس طرح اپنے آپ کو چھپا سکتا ہوں۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں مفلس ہوتا اور اتنا مشہور نہ ہوتا تو مجھ کو اپنی انجمن آرا سے ملنے میں آج اتنی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو شہنشاہ ہمایوں کا پتہ لگاؤں اور ایک مرتبہ پھر افغانوں کو ہندوستان

سے نکالنے کی کوشش کروں یا ہندوستان کو چھوڑ کر اپنے وطن عزیز ایران چلا جاؤں۔

افتخار مرزا : بیرم خاں میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمھارا غم میرے غم سے عظیم تر ہے لیکن خدا نے تمھیں عزم و ثبات، صبر و ضبط کی نعمتوں سے مالامال کیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ جب سے میں ناہید سے جدا ہوا ہوں ایک ایک پل اس کی مفارقت میں گزارنا میرے لیے قیامت ہو گیا ہے۔ راتوں کی بے قراری کس سے بیان کروں اور کس طرح بیان کروں۔ بیرم مجھے معاف کرنا۔ واقعی تم مجھ سے زیادہ دُکھی۔ اور زیادہ مجبور ہو۔ انجمن آرا کتنی شوخ، حسین اور ایثار پسند لڑکی ہے۔ گل رُخ کتنی حسین و دلکش ہے لیکن افسوس ہم تینوں مل کر کسی ایک کے بھی کام نہیں آسکتے۔

ابوالقاسم : گل رُخ کے لیے میں ہر وقت جان دینے کو تیار ہوں۔ لیکن اس قید میں میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ معلوم نہیں اس غریب کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی وہ کہاں ہوگی۔ کس عالم میں ہوگی۔ میں بھی یہ ذلّت و رسوائی لے کر آگرہ نہیں جا سکتا۔ اس لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ بیرم خاں کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں نے زندگی ساتھ ساتھ گزاری اور انشاءاللہ ہم ہر حال میں ساتھ ہی ساتھ رہیں گے۔

بیرم خاں : میرا دل سوزِ عشق سے کباب ہوا جا رہا ہے۔ دل میں عشق کی آگ، محبوب کی جُدائی، قید تنہائی بادشاہ سے بچھڑنے کا غم، حکومت جانے کا ملال۔ انسان اگر شدتِ غم سے دیوانہ نہ ہو جاتے تو پھر کیا ہو۔ بیرم

کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ افتخار میں اپنے آپ کو بڑا ثابت قدم سمجھتا ہوں مشکلوں اور مصیبتوں کی بھی آخر انتہا ہوتی ہے آج میرے دل کی طنابیں ٹوٹ گئی ہیں۔ میرا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ اب میں ضبط نہیں کر سکتا۔ ہائے اب میں اتنی کھوئی ہوئی چیزوں کو کہاں سے لاؤں۔ کیا کروں۔ اب کس امید پر انجمن آرا کا نام لوں۔ فی الحقیقت وہ انجمن آرا ہے اب انجمن ہی نہ رہی۔ اب کس امید پر اس کو بلاؤں اور کس طرح اس کی مدد کروں۔ آہ۔ ایک وہ مختاری تھی کہ سلطنت مغلیہ، میری مٹھی میں تھی اور آج یہ مجبوری ہے کہ خود اپنی، اپنے محبوب کی اور محبوب ترین دوستوں کی مدد نہیں کر سکتا ہائے کسی شاعر نے سچ کہا ہے:

روتے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

آج میں خود کیا ہوں، ایک قیدی، باغی، جو اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ اپنے محبوب کو ایک نظر دیکھ لے۔ اسی طویل گفتگو کے بعد بیرم کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے انتہائی کرب زا حالات میں گنگنانا شروع کر دیا۔

منم امروز، و بلائے شب ہجراں برسد
کردہ در کار تو چوں شمع دل و جاں برسد

بیرم نے قلب کی گہرائیوں اور اپنے دکھے ہوئے دل سے اس شعر کو پڑھا۔ بیرم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاید انجمن آرا اس کی ذہنی سطح پر

کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ افتخار مرزا اور ابوالقاسم بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ ناہید نے افتخار کو اور گل رُخ نے ابوالقاسم کو۔ پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ تینوں بدنصیب، فلک کے ستائے عالم کے کشتہ، زمانہ کی گردش کے مارے ہوئے شب ہجر کا غم ہنا رہے تھے۔ جس نے ان کو شمع کی طرح جلا کر خاک کر دیا تھا۔ افتخار مرزا یا ابوالقاسم نے ایک لفظ بیرم خاں سے نہ کہا بلکہ اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے ادھر خود بیرم خاں ایک اور ہی عالم میں تھا اس کے سامنے انجمن آرا کھڑی ہوئی اس سے شکوہ کر رہی تھی۔ بیرم خاں تم کو اپنی وفا شعاری پر ناز تھا۔ تم نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب وہ تمھارے وعدے کہاں ہیں۔ تم مرد ہو۔ ہر مصیبت جھیل سکتے ہو۔ مجھے دیکھو کہ میں نے تمھاری محبت میں کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں اور بیرم خاں اس محویت میں جواب دے رہا تھا۔ میری انجمن میں بالکل بے قصور ہوں۔ دیکھو قسمت نے ہمارے اور تمھارے درمیان شب ہجراں کو لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

منم امروز، و بلائے شب ہجراں رسد

کردہ، در کار تو چوں شمع دل و جاں برسد

بیرم خاں بڑی دیر تک اس شعر کو پڑھتا رہا اور افتخار مرزا و ابوالقاسم سر دُھنتے رہے۔ اس کے بعد اس نے دوسرے اشعار پڑھے۔

ماہ تاباں تو یا ہد شب مشکیں بر دوش

سرو رعنائے تو دارد گل خنداں برسد

آفتاب تو، اگر سایہ زمن باز گرفت
باز یابید مرا سایہ سلطان برسد

اس شعر کو خدا معلوم کتنی مرتبہ بیرم خاں نے پڑھا اور کتنی مرتبہ افتخار مرزا اور ابوالقاسم نے اس کی فرمائش کی۔ شعر کے معنی یہ ہیں کہ اے محبوب اگر تو میرے اوپر سایہ فگن ہوجائے تو بادشاہ بھی مجھ پر مہربان ہوجائے۔ اس کا سایہ بھی میرے سر پہ پڑے۔ یہی دو تمنائیں تھیں جن کو یہ تین قیدی اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ پہلی تمنا یہ تھی کہ اپنے اپنے محبوب کا دیدار کریں اور دوسری تمنا یہ تھی کہ اپنے شہنشاہ سے مل جائیں۔

خدا معلوم کب تک یہ کیفیت رہی۔ آنسو، آہیں۔۔۔ مرحبا کے نعروں میں شامل ہوتے رہے۔

افتخار مرزا: بیرم خاں، تم نے یہ کیا غضب کیا کہ میرے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔

ابوالقاسم: واقعی اس وقت بیرم خاں نے بڑے پُر درد انداز میں غزلیں سُنائی ہیں۔ کیوں نہ ہو وہ ایک انتہائی حساس شاعر کا دل رکھتا ہے۔ جو اتفاق سے عشق کی آگ میں بھی جل رہا ہے۔ اس کے گلے میں سوز و گداز نہ ہوگا تو پھر کہاں ہوگا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تہ خانہ میں یکا یک زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ خواجہ سراؤں کی آمد و رفت کنیزوں باندیوں کی مستعدی کسی بات کی خبر دے رہی تھی۔ یہ تینوں بھی امید و بیم کے عالم میں آنے والے

خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں زینہ پر آہٹ معلوم ہوئی۔ پہلے مشعل برداران کے پیچھے حفاظتی دستہ، تلواریں ہاتھ میں لیے۔ اس کے بعد راجہ ترسین تھے۔ جن کے امرار وزرار ان کو حلقہ میں لیے ہوئے تھے۔

جب یہ قافلہ تہ خانے میں پہنچ گیا تو راجہ نے سب کو ٹھہر جانے کا حکم دیا اور خود اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں یہ تینوں اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کے لیے غمگین بیٹھے ہوئے تھے۔

جب راجہ ترسین کمرے میں داخل ہوتے تو یہ تینوں بھی احتراماً و تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ راجہ ترسین آگے بڑھے۔ انھوں نے بیرم خاں کو گلے سے لگایا اور انتہائی غمگین آواز میں کہا۔

راجہ ترسین : بیرم خاں تم ہمارے محسن ہو۔ تم نے ہم پر ایک نہیں، کئی احسان کیے ہیں۔ ہماری یہی تمنا تھی کہ تمھارے کچھ کام آتے۔ لیکن تقدیر کے آگے انسان سپر انداختہ ہو جاتا ہے۔ شیر شاہ سوری کو آپ لوگوں کی گرفتاری کا علم ہو گیا۔ وہ آپ لوگوں سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔ اس لیے اس نے آپ لوگوں کو فوراً طلب کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کو شیر شاہ سوری کے سامنے پیش کروں کیونکہ اس میں آپ لوگوں کی جانوں کو خطرہ ہے ممکن ہے تم سب قتل کر دیے جاؤ۔ لیکن بیرم خاں تمھارا یہ دوست بالکل مجبور ہے وہ تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ افغانوں کو میں کس طرح ناخوش کر سکتا ہوں اور ان سے کس طرح ٹکر لے سکتا ہوں میں

تمھیں شیر خاں کے پاس بھیجنے پر مجبور ہوں لیکن ایشور سے میں پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ تم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

بیرم خاں : ولی نعمت، ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہماری اس وقت مدد کی جب ہمارا کوئی مدد کرنے والا نہ تھا۔ آپ نے اس وقت ہمارا ساتھ دیا جب ہمارا سایہ بھی ہم سے گریزاں تھا۔ آپ نے ہم کو خواص خاں اور حاکم قنوج کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ آپ نے ہم کو موت کے منہ سے نکالا۔ ہم آپ کے اس خلوص و محبت کے قدر داں ہیں۔ آپ ہمارے محسن ہیں۔ آپ کی جانب سے کسی بدگمانی کو دل میں جگہ دینا کفر ہے۔ رہا شیر شاہ سوری کی طلبی کا سوال تو بندہ پرور مشیت ایزدی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہم لوگوں کی موت شیر شاہ سوری کے ہاتھوں مقدر ہو چکی ہے تو اگر ہم پہاڑوں کی چوٹیوں اور تنگ و تاریک گھاٹیوں میں بھی جا کر پناہ لیں تو موت ہم کو ڈھونڈ نکالے گی۔ اور اگر ابھی ہمارا وقت نہیں آیا ہے تو ایک کیا ہزاروں شیر شاہ سوری مل کر بھی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ مارنے والے سے بچانے والا بہت قوی ہے اور موت خود زندگی کی محافظ ہے۔ کسی انسان کا مارنا یا جلانا کسی انسان کے بس کا کام نہیں۔

راجہ ترسین : بیرم خاں۔ تم کتنے بلند انسان ہو۔ کاش میں یہ تخت و تاج دے کر بھی تمھاری مدد کر سکتا۔ تم قابل پرستش ہو۔ میں نے کسی انسان کو اتنا بلند نہیں دیکھا۔

بیرم خاں : نہیں محترم۔ قابلِ پرستش میں نہیں ہوں بلکہ وہ ذات ہے جس نے اس کائنات کو ستاروں کی قندیلوں سے روشن کیا ہے۔ جو نور اور ظلمت کا پیدا کرنے والا ہے۔ جس کے حکم کے بغیر ایک پتّا نہیں ہل سکتا۔ ہمارے قلبی تاثرات اور دلی کیفیات سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اور وہ جو ہمارے حق میں بہتر سمجھے گا وہی کرے گا۔

راجہ ترسین : کل رات آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے اور اس کے بعد آپ کو شیر خاں کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

بیرم خاں : بہتر۔

راجہ ترسین جس طرح آتے تھے اسی طرح بیرم خاں سے معذرت کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد بھی ان تینوں کے درمیان یہی موضوع گفتگو رہا۔

بیرم خاں : افتخار۔ تم کچھ زیادہ پریشان نظر آتے ہو۔

افتخار مرزا : نہیں بیرم، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے ذرا ناہید کا خیال آ گیا تھا۔ اس لیے اداس ہو گیا تھا۔

بیرم خاں : یہی دُنیا ہے۔ اسی کو دنیا کی دل کشی اور رنگینی سے تعبیر کیا گیا ہے اسی میں گم ہو کر انسان کائنات اور خالقِ کائنات دونوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہ بڑے خوبصورت جالوں میں انسان کو اسیر کر لیتی ہے۔ ہم لوگ مرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے انجمن آرا۔ افتخار تمھیں ناہید اور ابوالقاسم کو گُل رُخ یاد آ رہی ہے ہم میں سے کسی کو بھی موت کے وقت خدا یاد نہ آیا۔ نہ یہ یاد آیا کہ دنیا سرائے فانی ہے بلکہ یاد بھی آئیں تو یہاں کی خوبیاں

ہی یاد آئیں۔ دنیا عجیب جگہ ہے۔ اس کا عجیب رنگ ہے۔ جو کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہتی۔ کل تک جو صاحبِ تخت و تاج تھے ان ہی کی ہڈیوں پر سیکڑوں دوسرے ایوان تعمیر ہو چکے ہیں۔ ہائے خیام نے خوب کہا ہے۔

خوش باش، کہ غصہ بے کراں خواہد بود
بر فروغ، قراں اختراں خواہد بود
خشتے توز قالب تو خواہند زدند
ایوان و سرائے دیگراں خواہد بود

موت ایک حقیقت ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ اس لیے ہم کو ہمیشہ موت کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ ہم موت سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ حیات بعد الموت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ہم ڈرتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد کیا ہوگا۔ ہم کہاں جائیں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنی منزل کو متعین نہیں کیا۔ اس لیے آگے بڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی خوبصورت اور حسین شہر کی جستجو میں نکلا ہو، اور راستہ بھول کر جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھان رہا ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہی جنگل اور بیابان اس کو اتنے عزیز ہو گئے ہوں کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ صرف میرا وہم و گمان تھا کہ اس سے خوبصورت مقامات بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے بہتر منزل بھی ہو سکتی۔ اب میں یہاں مطمئن ہوں۔ کون آگے بڑھے۔ کون دیکھے کہ آگے کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرح تھک کر بیٹھ نہ جاتا اور آگے کی

فکر رکھتا تو دیکھتا کہ جن چیزوں کو وہ حسین سمجھ رہا ہے وہ ان چیزوں کے مقابل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں اور وہ یہی کہتا رہتا کہ اگر مجھے شیر کی خوبصورتی کا علم ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ میری زد سے زیادہ دُور نہیں تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا۔

افتخار مرزا : بیرم۔ پھر اب کیا کیا جائے۔

بیرم خاں : میں تو مرضی مولا پر چل رہا ہوں۔

ابوالقاسم : لیکن ہم کو اپنی رہائی کی ضرور جدوجہد کرنی چاہیے۔

بیرم خاں : "ہاں کوشش کرنا انسان کا فرض ہے"۔ تیسرے دن صبح کو یہ بلا نصیب قافلہ جس کا قافلہ سالار موت تھی۔ کشاں کشاں لکھنؤ سے دہلی کی سمت لے جایا گیا۔ اس قافلہ میں راجہ ترسین کے پانچ سو سپاہی تھے۔ بیرم خاں، افتخار مرزا اور ابوالقاسم کو الگ الگ پالکیوں میں سوار کیا گیا تھا۔ ہر پالکی کے دونوں جانب چار چار سوار متعین تھے۔ گویا یہ شیر شاہ سوری کی حراست میں اس کے دربار میں پیش ہونے جا رہے تھے۔ یہ لوگ تمام دن چلتے رہے۔ آخر قافلہ والوں نے ایک مقام پر دریا دیکھ کر قیام کیا۔ خیمے لگا دیے گئے اور فوجی اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے۔ اس قافلہ کا افسر اعلیٰ ابراہیم نام کا ایک آدمی تھا۔ جو راجہ ترسین کے دربار میں کسی معمولی سے عہدہ پر ملازم تھا۔ یہ شخص آگرہ کا رہنے والا تھا۔ وہ بیرم خاں اور افتخار مرزا کے مقام بلند سے واقف تھا۔ کئی مرتبہ جب ابراہیم آگرہ میں بیکار تھا تو اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ اگر وہ کسی وسیلہ سے بیرم خاں تک پہنچ جاتے تو اُس کی ساری نیستی

دُور ہو سکتی ہے۔ اُس نے بیرم خاں اور افتخار مرزا کی سخاوت کے ہزارہا واقعات سُنے تھے۔ وہ انھیں پارس سمجھتا تھا۔ جن سے ملتے ہی انسان کے سارے دُکھ درد دُور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہُوئی، وہ بیرم خاں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا اور بلا وسیلہ وہ اتنی بڑی ہستی کے پاس جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس عرصہ میں وہ کسی وسیلے سے راجہ ترسین کے یہاں ملازم ہو گیا۔

آج ابراہیم۔ افتخار مرزا، اور بیرم خاں سے کتنا قریب تھا۔ لیکن دونوں کی حالتوں میں کتنا فرق تھا۔ اس وقت بیرم خاں درباری امرا میں سب سے ممتاز شخصیت کا مالک نہ تھا۔ ہمایوں کا دست راست اور سلطنت کا سب سے اہم رُکن نہ تھا۔ بلکہ ایک باغی۔ سرکش اور قابل گردن زدنی حکومتِ وقت کے لیے خطرناک تھا اور خود محمد ابراہیم کے رحم وکرم پر تھا۔ ابراہیم اس انقلاب کو دیکھ کر تھرا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اس دنیا کی ناپائداری دیکھ کر تڑپ گیا۔ اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بیرم خان اور افتخار مرزا کو لقمۂ اجل ہونے سے بچائے گا۔ ممکن ہے شہنشاہ ہمایوں پھر بادشاہ ہو جائیں اور میری یہ نیکی کام آجائے، یہ خیال کر کے وہ سیدھا بیرم خاں کے پاس گیا۔ اور اس سے انتہائی عاجزی سے کہا۔

ابراہیم: ولی نعمت۔ میں آپ کی عظیم شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ کی شرافت، انسانیت اور سخاوت کے بے شمار واقعات سُن کر آپ کا بہت قدیم معتقد ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس وقت آپ کو کسی نئی

مصیبت میں لے کر پھنسا دوں۔

بیرم خاں: لیکن ابراہیم۔ تم ہم پر نگراں مقرر کیے گئے ہو جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟

ابراہیم: نوکری سے برطرف کر دیا جاؤں گا۔

افتخار مرزا: نہیں۔ بلکہ تم کو اور تمھارے گھر والوں کو ہمارے سروں کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

ابراہیم: میں اس کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

ابوالقاسم: تمھارے بیوی بچے قید ہو جائیں گے۔

ابراہیم: مجھے یہ بھی گوارا ہے۔

بیرم خاں: تم اتنی بڑی قربانی کیوں کر رہے ہو۔ ظاہر ہے ہم نے تم پر کبھی کوئی احسان نہیں کیا۔

ابراہیم: ولی نعمت۔ آپ ایک چشمۂ شیریں تھے۔ جس سے ہزاروں لوگ روزانہ فیض یاب ہُوا کرتے تھے۔ آپ شجر بار آور تھے۔ ہزاروں لوگ آپ کے پھلوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ آپ کا کرم عام تھا۔ آپ کا خلوص بہت زیادہ تھا۔ آپ لوگوں کے بہت ہمدرد تھے۔ مجھے فائدہ نہ ہو سکا تو نہ سہی۔ ہزاروں بندگانِ خدا تو فیضیاب ہُوئے۔ بھلا ایسے بلند انسان کی مدد کرنا اور اُس کے لیے جان دے دینا کیا عبادت نہیں؟

بیرم خاں: ابراہیم تم نے ہماری تعریف میں غلُو سے کام لیا۔ ہم نے جو کچھ بندگانِ خدا کے ساتھ کیا۔ اس کا صلہ ہم تم سے لینا نہیں چاہتے۔ اور نہ

کسی پر یہ بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تمھارے مشکور ہیں کہ تم ہمارے ہمدرد ہو۔ لیکن ہم اپنی جان کی خاطر اپنے دوست کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

ابراہیم : مجھ جیسے انسان ہزاروں روز پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں۔ لیکن آپ کا وجود نہایت ضروری ہے۔

بیرم خاں : نہیں ابراہیم۔ انسان انسان سب برابر ہیں۔ ہر دل میں زندہ رہنے اور باغ زندگی سے زیادہ لطف حاصل کرنے کی تمنا موجود ہے لیکن تم کہتے ہو۔ کہ تم جیسے انسان دنیا میں سیکڑوں ہیں۔ خدا کی قسم اگر شہنشاہ ہمایوں کے پاس تم جیسے دو چار آدمی بھی ہوتے تو اُن کی یہ عظیم حکومت کبھی ختم نہ ہوتی۔

ابوالقاسم : کیا کوئی ایسی تدبیر ممکن نہیں کہ ہم بھی محفوظ رہیں اور ہمارے محسن پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔

افتخار مرزا : کیوں نہیں ؟

ابوالقاسم : ذرا بتایئے

افتخار مرزا : میرے خیال میں ابراہیم آج شب کو محفل رقص برپا کریں۔ اور اس میں چند دوستوں کو طلب کریں۔ اور ہم تینوں کو بھی دعوت دیں اس میں شراب کا دور چلے۔ اور جب سب مدہوش ہوجائیں تو ہم ابراہیم کو معہ ان کے ساتھیوں کے باندھ دیں اور ان کا لباس پہن کر دریا کو پار کرجائیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ ابراہیم بے گناہ ہے۔ اور ہم لوگ خود کسی تدبیر سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

ابراہیم : میرے معزز مہمانو! میں تو یوں بھی آپ لوگوں کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن افتخار صاحب کی تجویز سے نہ صرف مجھے بچنے کا پورا موقع مل جائے گا بلکہ اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ آپ بہت دُور تک لوگوں کو افغان بن کر دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں۔ میں اس تجویز سے متفق ہوں۔

ابوالقاسم : میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں۔

بیرم خاں : جب آپ سب آمادہ ہیں۔ تو مجھے بھی راضی سمجھیے۔

ابراہیم : میں آپ سب حضرات کا مشکور ہوں کہ آپ نے اس خاکسار کو خدمت کا موقع دیا۔ میں ابھی جاتا ہوں اور بزم کا اہتمام کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں تمام جنگل مدہوشوں کی سُریلی تانوں سے گونجنے لگا۔ ہر طرف حسن و موسیقی تیرنے لگی۔ رات جوان ہونے لگی۔ بادہ و جام گردش میں آئے۔ صراحی و جام گلے ملنے لگے۔ اسی عالم کیف و مستی میں سارے سپاہی بے خود و بے ہوش ہو گئے۔ صرف بیرم خاں، ابوالقاسم اور افتخار ہوشیار رہوں میں تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی کئی افسروں کو پکڑ کر باندھ دیا۔ اور اُن کا لباس پہن کر خیمے سے نکل گئے۔ وہ خیمے سے ابھی کچھ ہی دُور گئے تھے کہ ایک سپاہی نے آکر سلام کیا اور کہا۔

سپاہی : حضور آپ لوگ تنہا کہاں جا رہے ہیں؟

بیرم خاں نے جو ابراہیم کا لباس پہنے ہُوئے تھا کہا۔ ہم دریا کی سیر کو جا رہے ہیں۔ کیا وہاں کوئی کشتی موجود ہے۔

سپاہی: جی ہاں۔ میں ابھی دریا پار کرکے آرہا ہوں۔ میں دوسرے کنارے سے کشتی لے کر آیا تھا۔ میں اس کشتی کو روکے لیتا ہوں۔

یہ کہہ کر سپاہی دریا کی جانب دوڑ کر چلا گیا۔ اور یہ تینوں آرام سے دریا کی جانب آہستہ آہستہ روانہ ہوتے۔

دریا پر کشتی کو موجود پاکر ان کو بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے سپاہی کو رخصت کیا اور خود کشتی میں سوار ہوگئے کشتی ان مہمانوں کو اپنی آغوش میں لے کر سطح آب پر روانہ ہوگئی۔ موسم نہایت حسین تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ دریا میں حسین موجیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن ان تینوں پر فطرت کی رنگینیوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ اُن کے دل میں خوف تھا۔ وہ بے تحاشا موت کے منہ سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں موت ان کا تعاقب نہ کرے۔

بیرم خاں: میں تو یہیں سے سندھ چلا جاؤں گا۔ سُنا ہے کہ شہنشاہ ہمایوں وہیں اپنی قوت کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ابوالقاسم: میں بھی ہم رکاب رہوں گا۔

افتخار مرزا: مگر میں نے ایک اور فرض اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ آپ دونوں سیدھے جایئے اور شہنشاہ کی مدد آرام سے کیجیے۔ لیکن میں آگرہ پہنچ کر کسی نہ کسی طرح ان بے زبانوں کا پتہ چلاتا ہوں جو ہماری محبت میں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ اگر مجھے ان کا سُراغ مل گیا تو میں ان کو ہمراہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

بیرم خاں : بڑا نیک خیال ہے۔ میں تم کو آگرہ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔

ابوالقاسم : بے شک یہ ہماری ناموس کا مسئلہ ہے۔ اور ہم اس وقت تک اطمینان سے کام نہیں کر سکتے۔ جب تک اس مسئلہ کا حل ہم کو نہ مل جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس اہم کام کو اپنے ذمہ لے کر مجھے اور بیرم خاں کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔

کشتی کنارے پر پہنچ گئی۔ تینوں کشتی سے اُترے اور اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے۔

باب ۱۹

جمال خاں کی بے قراری

جمال خاں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا خیالات نے اُس کو چشم زدن میں اس عہد میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ جب وہ بچہ تھا اور ایک دیہات میں پیدا ہُوا تھا۔ اُس کو بچپن کا وہ زمانہ یاد آیا جب وہ گاؤں کے کھیتوں اور روشوں پر کھیلتا اور کودتا پھرتا تھا۔ اُسے گاؤں کی وہ چھوٹی سی مسجد یاد آئی۔ جہاں اُس نے مولوی صاحب سے عم کا سیپارہ پڑھا تھا۔ اس کے بعد اُس نے اس اسکول میں گلستاں، بوستاں، خالق باری، اور اس قسم کی دوسری کتابیں پڑھیں۔ اس عرصہ میں اُس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ابھی وہ دس سال کا تھا کہ ماں کا سایہ بھی اُس کے سر سے اُٹھ گیا اور اس کو صفدر خاں اپنے گھر لے آیا اور پرورش کرنے لگا۔

صفدر خاں ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جس کا نام ناہید تھا۔ اسے اپنے باپ کے متعلق صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹا سا آدمی تھا البتہ اس کا چچا صفدر خاں کھاتا پیتا آدمی تھا۔ لیکن بچپن میں اس کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔ وہ شروع ہی سے بہت ضدی اور لڑاکا قسم کا بچہ تھا اور حالانکہ وہ ناہید کے ساتھ ساتھ کھیلا کرتا لیکن کوئی دن ایسا

جاتا تھا۔ جب ان دونوں میں کئی کئی دفعہ لڑائی نہ ہوتی ہو، ناہید اس سے خفا ہو جاتی۔ ناہید کی خفگی اسے بہت پسند تھی وہ اسے اور زیادہ چھیڑتا، اُس کی چیزوں کو چھپا دیتا۔ اس کی گڑیوں کو جلا دیتا۔ وہ بھی غصّہ میں اُس کے ہاتھ میں کاٹ کھاتی۔ اور کبھی مچل جاتی تو جمال خاں اس کو بڑھ کر منا لیتا۔ اس طرح دونوں بچپن کی وادیوں میں رنگین زندگی بسر کر رہے تھے۔ جمال خاں کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اور ناہید دونوں مولوی صاحب سے پڑھنے مکتب میں جاتے۔ لیکن ناہید ہر معاملے میں اس سے آگے نکل جاتی تھی اور پڑھنے میں بہت تیز تھی۔ اُس کو سیکڑوں اشعار یاد ہو گئے تھے۔ حافظ، سعدی، سب کو گھونٹ کر کے پی گئی تھی۔ لیکن جمال خاں کو کسی شاعر کا ایک شعر بھی نہ یاد ہوُا تھا۔ البتہ جمال خاں کو فنونِ سپہ گری میں کمال حاصل کرنے کا جنون تھا۔ وہ صبح چار بجے گھوڑے پر بیٹھ کر نکل جاتا اور اپنے اُستاد سے گھنٹوں تیر اندازی اور شمشیر زنی کے ہنر سیکھتا۔ یوں تو ہزاروں سیکھنے والے تھے لیکن جمال خاں بہت جلد اپنے مدرسہ میں سب سے زیادہ مشاق تیر انداز مشہور ہو گیا۔ اس کے اُستاد اس سے بہت محبت کرتے اور اس کو یہ فن سکھانے میں پوری لیاقت صرف کر رہے تھے۔ ایک دن جب صفدر خاں نے جمال خاں کو اپنے سے بہت بڑی عمر کے آدمی سے تلوار چھینتے ہوُئے دیکھا تو خوُشی سے دیوانے ہو گئے۔ بچپن کی زندگی بھی کتنی حسین اور دلچسپ زندگی تھی۔ ہر قسم کی آسائش، ہر قسم کا آرام۔ کھیلنے کے لیے ناہید۔ اور ناز برداریوں کے لیے صفدر خاں اور اُن کے

سیکڑوں ملازمین تھے۔

لیکن انقلاب کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس عیش وعشرت اور زندگی کے ان ہنگاموں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مغل ہندوستان میں آگئے۔ اس کے بعد دس سال کا عرصہ نہایت پریشانی میں گزارا۔ وہ اپنے چچا صفدر خاں کے ساتھ آوارہ پھرتا رہا۔ یہ وقت بھی عجیب وقت تھا۔ نہ کوئی دوست، نہ مونس، نہ رفیق، نہ روپیہ، نہ پیسہ، نہ گھر، نہ وطن، ناہید بھی چھوٹی، آگرہ بھی چھوٹا، صفدر خاں کو بس ایک ہی جنون تھا کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔

اب میں گلستان جوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ دُنیا کی ہر چیز مجھے حسین معلوم ہوتی۔ باغ میں پھول مجھے دعوتِ فکر دیتے تھے۔ ہر چیز پر شباب تھا۔ لیکن قسمت نے عین اُس وقت مجھ سے میری ناہید کو جُدا کر دیا۔ میں کیا کرتا۔ میں نے خوبصورت کنیزوں اور شراب کے دامن میں پناہ لی۔ اس عالم غربت میں، اسی چیز سے دل بہلاتا رہا۔ ورنہ میرا غم وہ غم نہ تھا کہ میں دیوانہ ہو جاتا اور خودکشی کر لیتا۔ اس لیے میں حسین و دلکش جوانیوں سے کھیلتا رہا۔ اور شراب انڈیلتا رہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جب تک مغل ہندوستان نہ چھوڑیں گے۔ افغانوں کے مقدر کا ستارہ کبھی طلوع نہ ہوگا۔ اس لیے اس دس سال میں میں نے کبھی آرام نہ کیا اور اپنا تمام وقت مغلوں سے جنگ کرنے میں گزرا۔ مجھے یہ اپنی زندگی کا تاریک ترین دور نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں اس طویل عرصہ میں صرف چند بار اپنی محبوب ناہید سے مل سکا۔ یہ ملاقاتیں بھی گھنٹوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ایک وہ

زندگی ہے۔ ایک آج کی زندگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی نے فقیری لباس اُتار کر شاہی لباس زیب تن کر لیا ہے۔ میں وہی یتیم ہوں جس کو بچپن میں بھی گھر پر دو روٹیاں میسر نہ ہوئیں اور برسوں دوسروں کے ٹکڑوں پر پڑا رہا۔ وہی جمال آج کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ میں ایک چھوٹے سے دیہات کا رہنے والا۔ جہالت و مفلسی کا پروردہ آج ہندوستان کے شہنشاہ شیر خاں کا دست راست ہوں کل جو خود محتاج تھا۔ آج غنی ہے، جو فقیر تھا۔ وہ شہنشاہ شیر شاہ سوری کا مشیر خاص ہے۔ کل تک جو خود حاجت مند تھا۔ آج اس کی ہر حاجت پوری ہو چکی ہے۔ غربت اور مفلسی معلوم نہیں کہاں بھاگ گئی ہیں اب ہندوستان پر میری حکومت ہے۔ پہلے میں امرائے بابر اور ہمایوں کو بڑی حسرت سے دیکھتا تھا۔ آج وہی مجھ کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اب مجھے کیا حاصل نہیں۔ کیا فوجوں پر میری حکومت۔ کیا آگرہ اور دہلی پر میری حکومت نہیں۔ کیا میں اس محل میں مقیم نہیں جس میں پہلے شہزادہ ہمایوں رہتے تھے۔ کیا میرا خدم وحشم جاہ وجلال رعب و دبدبہ کسی شہزادے سے کم ہے۔ میں نے اپنے عزم مسلسل سے بالآخر مغلوں کو دس سال کی جد وجہد کے بعد ہندوستان سے نکال دیا۔ اور افغانوں کی حکومت پھر ہندوستان پر قائم ہوگئی۔ لیکن ان تمام خوش بختیوں، کامیابیوں اور اقبال مندی کے باوجود۔ میرے دل کی کلی نہ کھل سکی۔ میں نے ہندوستان جیسی بڑی حکومت شیر خاں سوری کی معیت میں مغل جیسے عظیم الشان فرماں روا سے چھین لی۔ لیکن ایک نرم ونازک دل کو گزشتہ دس سال میں بھی فتح نہ

کر سکا۔ افسوس میرا سمندرِ شوق، منزلِ عشق میں ناکام رہا۔ میں ایک عورت کو فتح نہ کر سکا۔ میں ایک غم کو جو کانٹے کی طرح میرے دل میں گزشتہ دس سال سے چبھ رہا ہے۔ اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ وہ ناہید کا دل تھا جسے وہ اتنے طویل عرصہ میں بھی فتح نہ کر سکا۔ یہ اس کی محبت تھی جس کو وہ بچپن سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ یہ ناہید کے عشق کا تیر تھا جو اس کے کلیجے میں پیوست ہو گیا تھا اور وہ اب تک اس تیر کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ پہلے اس نے پیار و محبت سے ناہید کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناہید نے اس پیار و محبت کا جواب نہ دیا۔ اسے جمال سے کوئی محبت یا لگاؤ نہ تھا۔ جمال خاں کو ابتدائے محبت کی رنگینی اور دلچسپ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے اُس نے ناہید کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اب تم اس ہاتھ کو نہیں چھڑا سکتیں اور ناہید نے اُس کے ہاتھ میں کاٹ لیا تھا اور وہ کس طرح بلبلا کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔ لیکن جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اُس نے ناہید کے والد صفدر خاں کی بہت خدمت کی اور ان کو اپنی خدمات سے اتنا متاثر کیا کہ وہ ناہید کی شادی جمال خاں سے کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد سیاسی حالات، افغانیوں کی شکست، اور خود افتخار مرزا، کم بخت کے بیچ میں کود نے سے اس کی بساطِ محبت اُلٹ گئی۔ اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اُس نے بہت سوچا کہ کس طرح ناہید کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آئے۔ لیکن ناہید کے باپ کی زندگی میں وہ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس لیے

صفدر خاں کی زندگی میں اُس کے سارے منصوبے اور کوششیں بیکار گئیں اور آخر کار جب اس کا اقبال بلند ہُوا اور وہ شیر خاں کے ساتھ بنگال کو فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کو صفدر خاں کی زندگی میں اتنا موقع نہ ملا کہ اس رشتہ کو مضبوط کرے ان حالات نے ناہید کو افتخار مرزا سے بہت زیادہ قریب کر دیا۔ جمال سوچ رہا تھا۔ آخر ناہید مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہے۔ مردوں میں کسی مرد سے اتنا قریب سے واقف نہیں۔ ہم دونوں نے بچپن ساتھ ساتھ گزارا —— ایک ہی گھر میں پلے اور بڑھے۔ ایک ہی ساتھ کھیلے کودے۔ پھر ناہید مجھ سے بچپن سے کیوں نفرت کرتی ہے۔ بچپن کی نفرت تو قابلِ معافی ہے۔ لیکن جوانی میں اُس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ جب وہ اور ہم دونوں فقیر تھے۔ تب بھی وہ مجھ سے برہم رہتی تھی۔ اور جب وہ جھونپڑے سے محل میں پہنچ گئی تب بھی اُس کی نفرت اپنی جگہ قائم رہی۔ میرا خیال تھا کہ روپیہ پیسہ، زیور، جواہرات اور محلات نے اس کا دل میری طرف سے پھیر کر افتخار مرزا کی طرف کر دیا ہے۔ اب معلوم ہُوا کہ میں نے یہ نتیجہ نکالنے میں کتنی فاش غلطی کی تھی۔ اور میں اس سلسلہ میں افتخار مرزا اور صفدر خاں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن صفدر خاں کو اجل آگئی اور افتخار مرزا ناہید کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے موقع ملا اور میں ناہید کو اُڑا لایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ افغانیوں کے مستقبل سے مایوس ہے اس لیے مجھ جیسے غیر یقینی مستقبل کے آدمی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اس کے آنے کی برکت سے میری فتوحات کا سلسلہ اتنا تیز ہوگیا کہ

دیکھتے دیکھتے ہم دو سال کے قلیل عرصہ میں سلطنتِ مغلیہ کو پارہ پارہ کرنے اور وارث تخت بابری کو سندھ کے ریگستانوں میں دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ وسیع اور عریض سلطنت جس کا ہم خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ہم کو مل گئی۔ میرا خیال تھا کہ کیونکہ اب مغل تباہ و برباد ہوگئے۔ اُن کی حکومت ختم ہوگئی۔ اس لیے ناہید افتخار مرزا کو اپنے دل و دماغ سے نکال کر میری پرستش شروع کر دے گی۔ میں افغان ہوں۔ اُس کا بھائی ہوں وہ ایک مغل سے محبت کرتی تھی۔ میں امراء شیر خاں میں سب سے زیادہ بلند اور ممتاز ہوں۔ وہ خدا معلوم کہاں آوارہ گردی کر رہا ہے۔ میرے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے جو کسی بھی عورت کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی ہے۔ اس کے برخلاف افتخار مرزا۔ ایک گدائے بے نوا ہے۔ نہ گھر ہے نہ در۔ نہ اُس کے پاس سپاہ و لشکر ہے نہ طبل و عَلم ہے۔ نہ جاہ و حشم ہے۔ نہ محل ہے اور نہ عزت و حرمت۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر عورت، افتخار کے مقابلہ میں مجھے ترجیح دیتی۔

لیکن خدا معلوم اس ناہید کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے۔ اب بھی وہ میری شریکِ حیات بننا پسند نہیں کرتی۔ افسوس میں بڑا بدقسمت ہوں کاش مجھے کوئی ایسا گُر معلوم ہو جاتا جس کے ذریعہ میں ناہید کو اپنے قبضہ میں کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے مجبوراً اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اُسے ایک سال قید میں رکھا۔ افسوس میں نے اُس پر بڑا ظلم کیا۔ اُس کا پھول سا نازک اور رنگین چہرہ مرجھا

لیا اُس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود افتخار مرزا کو نہ بُھلا سکی۔ اب کیا کیا جائے۔ میرے لیے یہ سب سامانِ عیش و عشرت بیکار ہے جب میں اُس سے اپنی ناہید ہی کو خوش نہ کر سکا۔ میرے لیے یہ شان و شوکت بیکار ہے جب مجھے اپنی زندگی بے معنی اور بے کیف نظر آتی ہے اور ہر چیز میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے ناہید کے علاوہ سیکڑوں عورتیں میری زندگی میں آئیں۔ بہت سی لڑکیوں نے میری طرف قدم بڑھائے۔ لیکن جو بات ناہید میں ہے وہ کسی اور میں نہیں ہائے۔

میں جس پہ مر رہا ہوں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
دُنیا میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں،

میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ اگر ناہید اس طرح اپنی ضد پر قائم رہی تو یا تو اس سے زبردستی شادی کر لوں گا۔ یا اسے قتل کر ڈالوں گا۔ کیونکہ مجھے اس پر کم از کم اتنا حق حاصل ہے۔ دیکھوں یہ پگلی کب تک مجھے اس طرح تڑپاتی ہے۔ اور پریشان کرتی ہے۔ کب تک یہ میرے سکون کو غارت کرتی ہے۔ کب تک مجھ کو ذہنی طور پر مضطرب رکھتی ہے۔ بہر حال میں اس سے پھر ملوں گا۔ اس ظالم کے سامنے اپنا دل پھر پیش کر دوں گا۔ اس سنگدل سے پھر ٹکراؤں گا اور اس سے محبت کی بھیک مانگوں گا۔ ہائے اس کمبخت نے کس طرح مجھ پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے کتنی مرتبہ اس بے وفا کو بُھلانے کی کوشش کی۔ کتنی مرتبہ اس کو ڈرایا اور دھمکایا۔ لیکن اس کے پاس سوائے آنسوؤں کے کوئی جواب نہیں۔ میں اس کمبخت کی آنکھیں

چھوڑ دوں گا۔ جو اس طرح میرے جسم میں رحم کا جذبہ پیدا کر دیتی ہیں کہ میں کانپ کر رہ جاتا ہوں۔ ناہید تو پاگل ہے۔ تو نے مجھے بھی پاگل بنا دیا ہے۔ ایک مغل پر جان دینا اور ایک عزیز کو اس طرح چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دیکھو میری آتشِ غضب کو بھڑکانے کی کوشش نہ کر، ورنہ تو اس آگ میں جل بھُن کر کباب ہو جائے گی۔ اگر تو میرے اوپر رحم نہیں کر سکتی تو یاد رکھ میں بھی تجھ پر رحم نہ کروں گا۔ اور تجھے اتنا تڑپا تڑپا کر قتل کروں گا۔ اور ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ رہتی دُنیا تک یاد رہے گی۔ جمال خاں اسی عالم میں بڑی دیر تک رہا اور خدا معلوم نیند نے کب اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

باب ۲۰

آگرہ میں ایک مردِ بزرگ کی آمد

آگرہ میں دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر ایک درویش کی آمد سے کافی چہل پہل نظر آتی ہے۔ یہ کنارا پہلے بالکل غیر آباد تھا۔ اور صرف چند مِن چلے جاتے تھے۔ لیکن اس درویش کے آنے سے دریا کے دونوں کناروں پر ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ پہلے دریائے جمنا میں صرف دو ایک کشتیاں ادھر سے اُدھر آتی جاتی نظر آتی تھیں۔ لیکن اب جب سارا شہر کشتی بانوں نے اس طرف متوجہ پایا تو ہزارہا کشتیاں لے کر خدا معلوم کہاں سے نکل آئے۔ جمنا کے دونوں کنارے پر دُور تک کشتیاں ہی کشتیاں نظر آتی تھیں۔ اس میں امراء اور دوسرے معززین کی بھی کشتیاں تھیں۔ جن کی رنگ برنگی نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ انسان خود ایک ہنگامہ ہے۔ اس لیے جدھر انسانوں کا رُخ ہوتا ہے دُنیا کے سارے ہنگامے اس طرف اپنا رُخ کر لیتے ہیں۔ یہ کائنات انسان کے لیے سجائی گئی ہے۔ اور اس کی خوبصورتی انسانوں کے وجود پر قائم ہے۔ انسانوں کی دریا کی طرف آمد و رفت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں نے دریا کے دونوں طرف دکانیں لگا دیں۔ اور ضروریاتِ زندگی کی جملہ

چیزیں یہاں ملنے لگیں۔ گویا ایک نئے قسم کا میلہ تھا جو ایک مرد بزرگ کے آجانے سے دریائے جمنا کے دونوں جانب لگ گیا تھا۔

دریائے جمنا کے دوسرے کنارے سے کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر ایک پہاڑی پر ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا۔ اس میں ایک شخص کمبل پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی مقبولیت بے حد زیادہ تھی۔ شہر اور دیہات کے ہر گوشے سے مرد، عورتیں اور بچے چلے آرہے تھے۔ اور ان لوگوں کے آنے سے ان لوگوں کے شوق کی اشیا میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بچوں کے لیے جھولے اور طرح طرح کے رنگین مٹی کے اور سنگ مرمر کے خوبصورت کھلونے رکھے ہُوئے تھے۔ عورتوں کے لیے رنگ برنگ کے کپڑے زیورات وغیرہ کی بھی بھرمار تھی۔ گویا ویرانے میں چپکے سے بہار آگئی تھی اور جنگل اچانک آباد ہو گیا تھا۔

اس مرد بزرگ کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ دوسرے پیروں کی طرح اس کے مرید نہ تھے۔ جو آنے والے لوگوں سے اپنے پیر کی تعریف کرتے اور ان کی روشن ضمیری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے۔ ایسے لوگ نہ تھے۔ جو قرآن کی قسم کھا کر یہ کہہ دیتے کہ اُن کے پیر کے قبضہ میں پوری پوری کائنات ہے۔ وہ اگر چاہیں تو سورج کو پورب کے بجائے پچھم سے نکال سکتے ہیں۔ مردے کو زندہ کر دینا تو اُن کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ ابھی پرسوں ایک شخص کو زندہ کیا۔ فلاں کو آنکھیں عطا کیں۔ فلاں کو قبالۂ جنت

عطا کیا۔ اور فلاں کو روزگار دلایا۔ اُس کو اپنے شوہر سے ملایا اور اس عورت کو بچہ عطا کیا۔ اس قسم کا کوئی آدمی اس مردِ بزرگ کے ہمراہ نہ تھا۔ وہاں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو درویش کی جانب سے کسی آنے والے کا استقبال کرتا اور اس کی پیشگی دلالی وصول کرتا۔ گویا یہ درویش ان درویشوں کی صف میں تھے۔ جو دُنیا والوں سے بھاگتے ہیں۔ اُن میں سے نہ تھے جو دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے "حال و قال" قوالی، مجرا اور شہوت انگیز سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

دوسرے ہر شخص بلا جھجک اُس کے پاس جا سکتا تھا۔ ہزاروں آدمی صبح سے شام تک ہزاروں امیدیں لے کر آتے، لیکن یہ مردِ خُدا ہمیشہ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتا اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اس سے لوگوں نے ایک نیا طریقہ ڈھونڈ لیا۔ وہ آتے اور اپنی حاجت کی ایک عرضی لکھ کر جھونپڑی میں لٹکا جاتے۔ اس طرح یہ دستور ہو گیا کہ ہر آنے والا، اپنی حاجت کو جھونپڑے میں لٹکا کر باہر آئے۔ اور دو رکعت نماز پڑھ کر واپس چلا جائے۔ یہی وظیفہ تھا۔ دوسرے لوگ اپنے اپنے مذہب کے مطابق اپنی عرضی پیر صاحب کے توسل سے اپنے بھگوان کو بھیج دیتے۔ پیر صاحب صرف ہفتہ میں ایک دن، لوگوں سے خطاب کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ بعد نماز جمعہ مجمع سے خطاب فرماتے تھے۔ آج بھی جمعہ تھا۔ ہزاروں لوگ اس پہاڑی پر جمع تھے اور پیر صاحب کے کلمات سُننے کے مشتاق تھے۔ خدا

خدا کر کے پیر صاحب حجرہ کے باہر آئے۔ تمام مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہر شخص بڑے خلوص سے اور بڑی عقیدت سے نقش بہ دیوار بنا پیر صاحب کی باتیں سُننے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ پیر صاحب نے اپنا خطبہ شروع کیا۔

پیر صاحب: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا غفور الرحیم ہے دوستو۔ تم یہاں کس لیے جمع ہُوئے ہو۔ اس کی بارگاہ میں جاؤ جس نے کائنات کو تمھارے اور صرف تمھارے لیے سجایا اور آراستہ کیا ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق اور یہاں کی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اس سے طلب کرو جس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس کے در پر جبہ سائی کرو جہاں تمام کائنات جُھکی ہُوئی ہے۔ اس سے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا ذکر کرو جو دُنیا کی آرزوؤں کا پُورا کرنے والا ہے۔ اگر دنیاوی چیز چاہتے ہو تو اس سے مانگو جس نے اس دُنیا کو رنگ برنگ کی چیزوں سے سجایا ہے۔ اگر ملک چاہتے ہو تو اُس سے مانگو جو تمام ملکوں کا مالک ہے۔ اگر عزت کے طلب گار ہو تو اس سے طلب کرو جو عزت و عظمت والا ہے۔ وہی جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جس سے چاہے عزت و بزرگی واپس لے لیتا ہے۔ اگر پیسے کی تمنا ہے تو اُس سے طلب کرو جس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اگر اس کا قرب چاہتے ہو تو اُس کے بن کر رہو۔ اگر اس کا احسان و کرم دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو۔ دوستو میں بھی تمھاری طرح ایک انسان ہوں۔ میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتا۔ میں صرف تمھاری

طرف سے بارگاہ رب العزت میں دُعا کرتا ہوں اور تم آمین کہو۔

اے خدا، تو رحمٰن و رحیم ہے۔ اے جلال و بزرگی والے اے ہمیشہ زندہ رہنے والے۔ اے ملک وسلطنت والے، اے عالم بالا کے حاکم، اے عزت والے، اے اقتدار والے۔ اے مالک۔ اے امن دینے والے۔ اے سرکشوں کو زیر کرنے والے، اے دعاؤں کے مقبول کرنے والے۔ اے لوگوں کی دُعاؤں کو سُننے والے اور دل کے حال کو جاننے والے۔ میں تجھ کو تیری ہی عظمت و بزرگی کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو اس مقام پر جمع ہونے والے لوگوں کی آرزوؤں کو پورا کر۔

پیر صاحب ہمہ تن خلوص سے دعا میں مشغول تھے۔ ان کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہُوتے تھے۔ ان کا سر کھلا ہُوا تھا۔ ان کے پاؤں ننگے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ وہ حمد وثنائے الہٰی میں مشغول تھے۔ اور معرفت کے موتی لُٹا رہے تھے اس دُعا میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی شریک تھے۔ درویش کی آواز میں اتنا درد واثر تھا کہ ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ہر شخص گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے پالنے والے سے اپنی حاجتیں طلب کر رہا تھا۔ عجیب عالم طاری تھا۔ جس کو دیکھ کر انسان کی رُوح وجد میں آجاتی ہے۔ وہی دنیا دار لوگ جن کا ہر ہر لمحہ غیبت و برائی میں گزرتا تھا۔ اس وقت چند ساعتوں کے لیے روحانی پیکر بنے ہُوتے تھے۔

دعا ختم ہوتے ہی پیر صاحب حسب دستور، پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بہت سے لوگ فوراً واپس چلے گئے۔ لیکن بہت سے اس امید میں ٹھہر گئے کہ قسمت آزمائی کرنے سے شاید پیر صاحب کوئی بات ایسی کر دیں جس سے اُن کے تمام مسائل حیات حل ہو جائیں۔

اس مجمع میں بہت سی عورتیں تھیں۔ ان میں دو نوجوان برقعہ پوش لڑکیاں تھیں۔ جو بڑے خلوص سے دعا میں شریک ہُوئی تھیں اور اب وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

پہلی : دیکھا بہن انجمن آرا، میں نہ کہتی تھی کہ یہ بڑے خدا رسیدہ نیک اور پارسا ہیں۔

انجمن آرا : گُل رُخ بہن۔ پیروں کی قائل نہیں۔ مجھے یہ سب رنگے ہُوئے سیار نظر آتے ہیں۔ یہ بازی گر ہیں۔

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھُلا

لیکن اس شخص کی حرکتیں واقعی عجیب ہیں۔ میں نے یہ پہلا پیر دیکھا جس کا کوئی مرید نہیں۔ یہ پہلا پیر ہے جو اپنے یہاں آنے والوں میں بڑے اور چھوٹے کی قید کو روا نہیں رکھتا اور کسی کو شرف ملاقات نہیں بخشتا۔ یہ پہلا پیر ہے جو مرغ، زعفران، مشک، اشرفیوں اور زربفت کے تھانوں کا مطالبہ نہیں کرتا۔

گُل رُخ : ہاں یہ سب سے پہلا پیر ہے جو خدا کا قائل ہے۔

انجمن آرا : یعنی کیا پیر خدا کے قائل نہیں ہوتے۔

گُل رُخ : ہاں، تمام پیر زیادہ تر اپنے قائل ہوتے ہیں۔ وہ اپنا

رعب ڈالتے ہیں۔ اپنی روحانیت کی باتیں کرتے ہیں اپنے کو تمام دُنیا سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے آتے ہیں۔ میں نے ایسے بھی پیر دیکھے ہیں جو خدا پر نعوذ باللہ حکم چلاتے ہیں اور خدا معلوم کیا اول فول بکتے ہی رہتے ہیں۔ اور لوگ ان کو مجذوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگوں کی مجنونانہ حرکات سے اور زیادہ معتقد ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک پیر کو دیکھا جو اپنے مریدوں پر رعب ڈالنے کے لیے فضا میں اپنا چہرہ بلند کر کے رعب دار آواز میں کہتا تھا۔

"جاؤ جبریل، خدا سے کہہ دو، ہم نے وعدہ کیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مشیت کو بدلنا پڑے گا۔"

لیکن یہ پیر واقعی اپنی نوعیت کا عجیب و غریب ہے۔ جس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں بھی تمہاری طرح ہوں، اور تم لوگوں کے لیے صرف دعا کر سکتا ہوں اس کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔

انجمن آرا: ہاں صداقت میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا آج اس پر ٹوٹی پڑ رہی ہے۔

گل رُخ: آج بھی کئی ہزار کا مجمع تھا اور ہر قسم کے لوگ اس میں شامل تھے۔

انجمن آرا: خیر اوروں کو چھوڑو۔ تم اپنی بات کرو۔

گل رُخ: ہم بروقت آئے اور اُن کو دیکھ لیا۔ اور دعا میں شامل

ہو گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیسے شاہ صاحب سے ملاقات کریں۔

انجمن آرا : میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ میری سمجھ میں ایک ایسی تدبیر آئی ہے کہ تمھارے شاہ صاحب کے ہوش گم ہو جائیں گے۔

گُل رُخ : خدا کے لیے وہ تدبیر مجھے بھی بتاؤ۔

انجمن آرا : اس کا پتہ تم کو بعد کو ہو جائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم تینوں کے علاوہ کوئی اور شخص جھونپڑی میں نہ ہو۔ اس لیے ہم کو مغرب کے بعد تک یہاں رُکنا پڑے گا۔

گُل رُخ : ہم یہ وقت دریا کی سیر میں گزار سکتے ہیں اور پیر صاحب کے لیے کوئی تحفہ بھی خریدیں گے۔

انجمن آرا : لیکن میں نے سُنا ہے وہ کسی کا تحفہ قبول نہیں کرتے۔ لوگ پھل اور دوسری چیزیں رکھ جاتے ہیں لیکن دوسرے دن وہ سب چیزیں وہاں اسی حال میں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ اس کے بعد پیر صاحب نے ایک تقریر میں کہہ دیا، کہ ہمارا رازق اللہ ہے۔ ہم بندوں سے کوئی چیز طلب کرنا نہیں چاہتے۔

گُل رُخ : بہت پہنچے ہُوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔

انجمن آرا : ہاں اسی لیے اول سے آخر تک سب آول بزر کے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہفتوں میں وہ رنگ جما لیا ہے جو دوسرے پر، اپنی برسوں کی ریاضت میں نہیں جما سکتے تھے۔

مجھے یہ کوئی ان تمام پیروں سے بڑا پیر اور ان تمام بزرگوں سے بزرگ انسان معلوم ہوتا ہے جس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے یہ زبردست ڈھونگ رچایا ہے۔

گل رُخ : انجمن تم میرے جذبات عقیدت کو مجروح کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اس شخص میں کوئی تو ایسی خوبی ہے کہ مخلوق اس کو دیکھنے کے لیے کودی پڑتی ہے۔

انجمن آرا : لوگوں کو صرف ہنگامہ چاہیے ؂

مسجد ہو، میکدہ ہو کوئی خانقاہ ہو

یہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔

گل رُخ : تم ہمیشہ اس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ اچھا چلو، پرصاحب کے طفیل میں تھوڑی سی تفریح بھی کریں۔

دونوں دیر تک جمنا کے کنارے ٹہلتی رہیں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ شام ہونے کی وجہ سے لوگ جلد از جلد اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں، اس میں جوان، بوڑھے، بچے، مرد اور زیادہ تعداد میں عورتیں ہیں۔ ہر عورت اپنے ساتھ بچوں کی ایک فوجِ ظفر موج لیے ہوئے ہے۔ رات ہوگئی تھی۔ جمنا میں آنے جانے والی کشتیاں روشن تھیں۔ جنھوں نے پانی میں گویا آگ لگا دی تھی۔ یہ قندیلیں سطحِ آب پر ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ ان کی جوت سے تمام علاقہ جگمگ کر رہا تھا سیکڑوں عقیدت مند

مومی شمعیں روشن کر گئے تھے۔ جن سے یہ تمام جگہ بقعہ نور بن گئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اب تمام علاقہ عقیدت مندوں سے خالی ہو چکا تھا مگر اس رات کی تنہائی میں دو عورتیں عقیدت کے گلدستے سجائے سر جھکائے کُٹیا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جب یہ دروازے میں داخل ہوئیں تو انھوں نے سامنے ایک مرد بزرگ کو کمبل پر بیٹھے، عبادتِ الٰہی میں مشغول پایا۔ یہ دونوں چُپ چاپ اندر داخل ہوگئیں اور پیر صاحب کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔ پیر صاحب آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی اور نورانی شکل۔ چہرہ کا جلال اور عبادت کا استغراق ان دونوں کے دل میں عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ دونوں بڑی دیر تک پیر صاحب کو اس عالم میں دیکھتی رہیں۔ اچانک انجمن آرا نے ایک چیخ بلند کی اور دھڑام سے جائے نماز پر گر پڑی۔

پیر صاحب اس چیخ پر گھبرا گئے۔ اُنھوں نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تمام کمرہ مومی شمعوں سے جگمگا رہا تھا۔ عود اور اگر کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے ایک حسین خاتون کو مصلے پر بیہوش پڑا ہوا پایا وہ ایک دم کھڑے ہوگئے۔ اور اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ کوئی اور عورت بھی وہاں موجود ہے جو ان کی اس بوکھلاہٹ کو دیکھ دیکھ کر، انجمن آرا کی فراست کی دل ہی دل میں تعریف کر رہی ہے۔ پیر صاحب نے ایک مومی شمع ہاتھ میں لے کر بیہوش ہونے والی حسینہ کو غور سے دیکھا۔ ان کے چہرہ کا رنگ

اچانک متغیر ہو گیا لیکن پھر انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے آپ کو سنبھالا، جیب سے لخلخا نکالا اور اس خاتون کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں انجمن آرا نے آنکھیں کھول دیں۔

پیر صاحب : کہو، بیٹی انجمن آرا تمھارا کیا حال ہے؟

انجمن آرا : پیر صاحب آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا گل رخ کی عقیدت اور بڑھ گئی۔ وہ بھی آگے بڑھی اور ہاتھ جوڑ کر کہا پیر صاحب میں اور انجمن آرا آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ یہ میری سہیلی دل کی کمزور ہے۔ اس لیے اس پر غشی کا عالم طاری ہو گیا۔

پیر صاحب : اچھا یہ بات ہے۔ گل رخ تم بھی موجود ہو۔

گل رخ : حیران ہو کر۔ آپ کو میرا نام بھی معلوم ہے۔

پیر صاحب : ہم فقیروں کو کیا کچھ معلوم نہیں۔ ہاں یہ اُس کی عنایت ہے کہ ہم کچھ اُلٹی سیدھی باتیں بتا دیتے ہیں۔

اب انجمن آرا اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور پیر صاحب اپنی قسم توڑ کر ان دونوں سے محو گفتگو تھے۔

انجمن آرا : پیر صاحب جب آپ کو میرا اور گل رخ کا نام معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم دونوں آپ کی خدمتِ اقدس میں کیوں حاضر ہوئے ہیں۔

پیر صاحب : ہم جانتے ہیں۔ تم دونوں ایک ہی مرض میں گرفتار ہو۔ اور ہجر یار میں مضطرب اور بیقرار ہو۔

یہ سنتے ہی انجمن آرا اور گل رُخ فرطِ عقیدت سے پیر صاحب کے سامنے جھک گئیں۔ اور انجمن آرا نے کہنا شروع کیا۔

انجمن آرا : واقعی آپ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ آپ ہم جیسے بے سہارا لوگوں کو سہارا اور بے آسراؤں کا آسرا ہیں۔

پیر صاحب : جی نہیں۔ میں آپ سے کوئی غلط بات کہنا نہیں چاہتا۔ میں پیر و فقیر کچھ بھی نہیں۔ بلکہ آپ ہی کی طرح ایک انسان ہوں۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ قدرت نے مجھے کچھ رازوں سے آشنا کر دیا ہے۔ ورنہ میں بھی اس دُنیا کا کتا ہوں۔ میرے سامنے نہ جھکو اور مجھ سے عقیدت کا اظہار نہ کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی فریب میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور دھوکا کھا جاؤ۔

انجمن آرا : مرشد، اگر آپ اب زہر بھی دیں گے تو ہم آبِ حیات سمجھ کر پینا گوارا کریں گے۔ خدا کے لیے بتایئے۔ کیا یہ ہجر کی گھڑیاں وصال کے لمحات میں بدل جائیں گی۔ کیا اس تاریکی میں کبھی روشنی ہو گی۔ کیا اس شب کی صبح ہو گی۔

پیر صاحب : کیوں نہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب اور بڑا کارساز ہے۔ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ بچھڑوں کو ملانے والا ہے۔ دیکھو اُس نے یعقوب کو یوسف سے ملایا۔ وہ ضرور تمھاری بھی رہنمائی کرے گا۔

انجمن آرا : پیر صاحب۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ ہم ایک عرصہ

سے تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔ آج پہلی مرتبہ آپ نے اُمید کی کرن ہمارے نہاں خانۂ دل میں پیدا کی۔ کیا آپ مہربانی فرما کر یہ بتا سکتے ہیں کہ بیرم خاں اور ابوالقاسم اس وقت کہاں ہیں ؟

پیر صاحب : بیرم خاں اور ابوالقاسم دشمن کے چنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ فی الحال وہ ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تاکہ وہ شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں جلد از جلد حاضر ہو سکیں۔

انجمن آرا : کیا وہ شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔

پیر صاحب : غیب کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن جس خدا نے ان کو ایک مرتبہ موت کے منہ سے چھین لیا وہ دوبارہ بھی ان کی اعانت اور مدد کرے گا۔

انجمن آرا : ہم کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

گُل رُخ : افتخار مرزا کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں ؟

پیر صاحب : آپ ان کو کیوں پوچھ رہی ہیں۔

گُل رُخ : پیر صاحب جس طرح صبح کو شام سے تاریکی کو اُجالے سے اور ستاروں کو چمک سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بیرم خاں افتخار مرزا کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے ان کا ذکر نہ کیا۔ اُن کی خیریت ملنا بہت ضروری ہے۔

پیر صاحب : کیوں ضروری ہے۔ کیا تم کوئی پیغام اُن تک پہنچانا

چاہتی ہو۔

گُل رُخ : افتخار مرزا۔ ناہید سے محبت کرتے ہیں۔ اُن کی ناہید اُن کی جدائی کے صدمے برداشت کرتے کرتے بیمار پڑ گئی ہے۔ اُس کی حالت نازک ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح افتخار مرزا کو یہ پیغام پہنچا دیں۔

پیر صاحب : آپ کا پیغام اُن تک پہنچ گیا۔ میں بے حد ممنون ہوں۔

گُل رُخ : آپ کی ہر بات میں ایک بات چھُپی ہُوئی ہے۔ خدا سے دعا کیجیے کہ افتخار مرزا سے ہماری ملاقات ہو جائے۔

پیر صاحب : خدا نے تمھاری دُعا قبول کر لی۔ افتخار مرزا تمھارے سامنے موجود ہے۔

انجمن آرا : پیر صاحب آپ روشن ضمیر ہیں۔ اس لیے ہر ظاہر باطن چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اپنی ان کمزور آنکھوں سے جن کو دیکھنے پر بڑا ناز ہے۔ بہت کم دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے آپ ہم کو مہربانی فرما کر یہ بتایے کہ افتخار مرزا کہاں ہیں۔

پیر صاحب نے مسکرا کر اپنی ڈاڑھی کو ہٹا دیا۔ گُل رُخ اور انجمن آرا کی چیخ نکل گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ افتخار مرزا ان کے سامنے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔

گُل رُخ : اچھا۔ اس ڈرامہ کے ہیرو آپ ہیں۔

افتخار مرزا : جی ہاں۔ آپ لوگوں کی دُعا سے۔

گُل رُخ : پھر آپ نے ہم کو اتنی دیر پریشان کیوں کیا۔

افتخار مرزا : صرف یہ راز معلوم کرنے کے لیے کہ تم بھی مجھے اس حلیہ میں پہچان سکتی ہو یا نہیں ؟

گُل رُخ : آواز سے کچھ شبہ ضرور ہُوا تھا۔ لیکن میں یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ آپ اس مشہور و معروف پیر کے لباس میں دہلی میں جلوہ گر ہیں۔

انجمن آرا : دیکھا گل رُخ، میں تو تم سے بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی بہت اونچا پیر ہے۔ پیروں کے پاس اتنی شئے لطیف نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس شانِ استغنا کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ضرور کوئی رنگا ہُوا سیار، آفت کا ٹکڑا اور بلائے بے درماں ہیں۔ اب معلوم ہُوا کہ حضور نے شاہی کے بعد فقیری اختیار کر لی ہے۔ مگر گل رُخ تم مانتی ہی نہ تھیں۔

گُل رُخ : تم ہی تو مارے عقیدت کے غش کھا کر گر پڑیں۔

انجمن آرا : میں تو اس بلند پرواز پیر کی پرواز دیکھنا اور اُن کے ہوش گم کرنا چاہتی تھی۔ دیکھو کس ترکیب سے میں نے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اور یہ اپنی ساری ایکٹنگ بھُول کر جامۂ انسانیت میں آ گئے۔

افتخار مرزا : آپ بھی میری پیری کی قائل ہو گئی تھیں۔

انجمن آرا : ہاں۔ اچھی طرح سے۔ اب ناہید ملے گی تو اس کی وہ مرمت کروں گی کہ طبیعت صاف ہو جائے۔ دیکھوں ناہید آپ کو

اب کس طرح منتخب کرتی ہے۔ وہ ایسے چار سو بیس قسم کے آدمیوں کو جو کبھی پیر، کبھی مرید بن جائیں کیسے پسند کر سکتی ہے۔

افتخار مرزا: جن لوگوں کی خاطر ہم شاہی سے فقیری میں آئے وہی ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ میں نے ناہید اور تمھاری ہی خاطر یہ پاپڑ بیلے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں لوگوں سے یہی کہتا رہا کہ میں پیر نہیں ہوں۔

انجمن آرا: آپ کیوں کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ نے اہلِ دہلی پر اتنا رعب ڈالا، کہ ہم خود آپ کی شہرت سُن کر گھبرا کر آپ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ ایسے خُدا معلوم کتنے لوگ شرفِ ملاقات حاصل کر چکے ہوں گے۔

افتخار مرزا: نہیں انجمن، بیرم خاں کی قسم۔ تین مہینے میں میں نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ یہ صرف تم تھیں جس نے اپنی دانائی سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

یہ کہہ کر افتخار مرزا اُٹھ کھڑا ہُوا اور اندر کوٹھڑی میں گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے گُل رُخ اور انجمن آرا بھی تھیں۔ افتخار مرزا نے ایک جگہ ہاتھ مارا۔ ایک دروازہ نمودار ہُوا۔ اور یہ سب اس میں سے ایک غار میں چلے گئے۔ نیچے جا کر دیکھا تو ایک بہترین گھر موجود تھا۔ جس میں کئی کمرے تھے اور ہر کمرے میں سامان آرائش موجود تھا۔

انجمن آرا: اس لیے حافظ نے کہا تھا۔

چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

اچھا پیر صاحب۔ یہ ٹھاٹھ ہیں اگر ہم آپ کی اصلیت سے واقف نہ ہوتے تو اس کو بھی آپ کی کرامت ہی سمجھتے۔

افتخار مرزا : اب جو چاہو کہہ لو۔ دنیا والوں کے سامنے بے نقاب آنا ہی ستم ہے۔ جتنے پردے انسان اپنے اوپر ڈال کر سامنے آتا ہے اتنا ہی معزز و محترم سمجھا جاتا ہے۔

انجمن آرا : آپ تو پیری کے پردے میں سامنے آتے۔ اور دُنیا کو خوب بنایا۔

یہ لوگ چلتے چلتے ایک کشادہ اور مکلف کمرے میں بیٹھ گئے۔ نوکروں نے دسترخوان بچھایا۔ یہ لوگ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد ناہید کا ذکر "چھڑ گیا" اور "بات جوانی تک" پہنچ گئی۔

باب ۲۱

ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

آج جمال خاں کے محل میں ہر طرف اُداسی و خاموشی چھائی ہُوئی ہے۔ پیڑ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ حوض کا پانی دم بخود ہے۔ اس میں کوئی لہر نہیں، سبزہ خاموش ہے۔ کنیز، باندیاں سب مغموم و متردّد ہیں، خادمائیں چُپ، یہاں تک کہ پہرہ داروں کے چہرہ پر بھی غم کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب غم والم اس لیے ہے کہ ناہید سخت بیمار ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے شیر شاہ سوری بہ نفسِ نفیس، اپنے دوست جمال خاں کی بہن اور منگیتر، ناہید کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کے ہمراہ شاہی طبیب بھی تھا۔ شاہی طبیب نے صاف کہہ دیا کہ مریض کے دل و دماغ پر سخت صدمہ ہے۔ اس لیے وہ خود اچھا ہونے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔ اور کوئی دوا اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک مریض اس کو اپنے دل سے قبول نہ کرے۔ اس لیے مریضہ کو ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کی جائے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے اس کو صدمہ پہنچے۔ ورنہ اس کی حرکت قلب بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تمام محل کی کنیزیں، اصیلیں، لونڈیاں۔ ایک حوض

کے کنارے جمع ہو گئی تھیں - ہر آنکھ نمناک تھی - کیونکہ اُن کی وہ شہزادی بیمار تھی جو تمام شہزادیوں میں نیک اور رحم دل تھی۔

کوئی کنیز و خادمہ کہتی، اے بُوا میں کیا بتاؤں "ناہید بی بی جیسی عورت تو میں نے کبھی نہ دیکھی، خدا ان کو ہمیشہ زندہ رکھے جب سے وہ آئی ہیں - آج تک کبھی کسی پر خفا نہیں ہوئیں اور کبھی کسی کو نہیں ڈانٹا۔ میرے بچّے کی طبیعت خراب ہُوئی تو جیب چاہے پچاس سکّے مجھے دے دیے"۔ اسی طرح ہر خادمہ اور کنیز اپنا اپنا واقعہ بیان کرتی اور ناہید کی بیماری پر آنسو بہا رہی تھی۔ کسی خادمہ کے شوہر کو ملازم رکھوایا۔ کسی کے بچے کو پڑھانے کے لیے وظیفہ دیا۔ کسی یتیم و غریب بچی کی شادی کی۔ کسی بیوہ کی مدد کی۔ غرضیکہ کوئی ایسی نہ تھی جس پر ناہید کا کرم عام نہ ہو۔ اسی لیے ہر ملازمہ ایسی رو رہی تھی اور تڑپ تڑپ کر اُس کے لیے دُعائیں مانگ رہی تھی جیسے اُس کا کوئی اپنا عزیز بیمار ہے۔

ادھر جمال خاں کی حالت نہایت ابتر اور نازک تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ناہید کے کمرے میں جاتا۔ ناہید بیہوش پڑی تھی۔ اُس کے گلابی چہرے پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ انتہائی ضعیف و لاغر ہو گئی تھی۔ جمال ناہید سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر ناہید ہوش میں آئے تو اُس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔ ناہید کو بیمار کرنے والا اور اس کو اس حالت تک پہنچانے والا وہ خود ہی تھا۔ یہ ناہید کی ضد نہ تھی بلکہ خود اُس کا

اصرار تھا جس نے ناہید کو اس حالت تک پہنچا دیا تھا۔ کاش وہ اُس کو یہ دھمکی نہ دیتا کہ اگر وہ راضی نہ ہوئی تو اس کو زبردستی شادی کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ افسوس میں نے یہ کیا کیا۔ میں نے خود ہی اپنی شمع محبت کو اپنے دامن سے بجھا دیا۔ ہائے میں اب کس طرح اس کو موت کے منہ سے بچاؤں۔

وہ اسی آہ وزاری میں مصروف تھا کہ اس کا دوست شہزادہ جلال خاں کمرے میں داخل ہوا۔

شہزادہ جلال خاں : جمال خاں، یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

جمال خاں : اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔

شہزادہ جلال خاں : کیوں ناہید اب کیسی ہے ؟

جمال خاں : ہر لمحہ اُس کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

شہزادہ جلال : میں نے سُنا ہے کہ آج کل کوئی بہت پہنچے ہوئے بزرگ آگرہ میں آئے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ اُن سے رجوع کیا جائے۔

جمال خاں : ہاں اب حکیموں نے جواب دے دیا۔ ممکن ہے کہ کسی بزرگ کی دُعا ہی کارگر ہو جائے۔

شہزادہ جلال : جمال خاں میں نے کبھی تم سے کہا نہیں۔ ناہید نہایت پاکیزہ اور اونچے کردار کی عورت ہے۔ میرے دل میں اس کی بے پناہ عزت ہے میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ناہید جیسی بلند ہمتی عورتوں میں پوری افغان قوم میں شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ اگر ناہید کو کچھ ہوگیا

تو میں تم کو عمر بھر معاف نہ کروں گا۔

جمال : میں نے کیا کیا ہے۔ کیا میری محبت ہی میرا جُرم ہے۔

شہزادہ جلال : نہیں۔ محبت کرنا کوئی جُرم نہیں۔ لیکن محبت کا جواب محبت سے حاصل کرنے کی توقع وابستہ کرنا ضرور جُرم ہے۔ اگر محبوب تیار نہ ہو تو اس کو زبردستی اپنے قابو میں کرنا اُس پر ظلم و ستم کرنا کیا ظلم نہیں؛ کیا تم دل کا سودا تلواروں سے کرنا چاہتے ہو۔ تلواریں صرف محبت کے رشتوں کو کاٹ سکتی ہیں۔ جوڑ نہیں سکتیں۔

جمال خاں : جلال تم میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ سے اس محبت کے جنون میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اب میں بھی ناہید کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ذرا اس درویش کا پتہ چلاؤ۔ جلال، تم نہیں سمجھتے، اگر ناہید کو کچھ ہو گیا تو میں دُنیا میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مجھے یہ ذہنی اذیت کبھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی کہ میں ہی اپنی محبوبہ کا قاتل نکلا۔

شہزادہ جلال : خوب ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

جمال : اب تم جو چاہو کہو، مگر خدا کے لیے مجھے اس درویش کا پتہ بتا دو۔

شہزادہ جلال : اس کمبخت میں یہ خرابی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ملتا۔

جمال : میں خود جاؤں گا اور اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔

جلال : میں ایک ایسے آدمی کو تمھارے سپرد کر دوں گا جو تم کو وہاں پہنچا دے گا۔

جمال : بہت بہت شکریہ ایک ایک منٹ قیمتی ہے اس لیے مجھے جانے دو۔

جلال : تم جا سکتے ہو۔ میں آدمی ساتھ کیے دیتا ہوں۔ جمال اس حال میں کہ اُس کا گریبان چاک تھا۔ اس کے سر کے بال پریشان تھے۔ سیدھا دریا کے کنارے پہنچا اور جاتے ہی پیر صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔

جمال : پیر صاحب، مجھے خدا کے لیے اس عذاب سے بچا لیجیے۔ میں آپ کو نہ چھوڑوں گا۔ آپ میرے ہمراہ چلیے اور میری ناہید کو موت کے چنگل سے چھڑا لیجیے۔

پیر صاحب : جمال خاں، جب ظلم کی انتہا ہو گئی، تو تو ہمارے پاس آیا ہے۔ جب پھول کو پاؤں کے نیچے مسل چکا تو اب چاہتا ہے کہ پھر وہ زینتِ چمن بن جائے۔ نادان جا، ناہید کے لیے موت مقدر ہو چکی ہے۔ مشیت سے کوئی نہیں ٹکرا سکتا۔

جمال خاں پیر صاحب کی باتیں سُن کر محوِ حیرت ہو گیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ناہید کی موت کا تصور اور اُس کی دائمی جُدائی کے ساتھ اُس کے ذہن میں یہ نشتر بھی چبھنے لگے کہ اس کی موت کا باعث خود وہ ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنے بال نوچ لیے اور پیر صاحب سے گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

جمال : حضور آپ لوگوں کے دل کے رازوں سے واقف ہیں، آپ ہر چیز سے واقف ہیں۔ خدا کے لیے ناہید کی جان بچا دیجیے۔ اس کے بدلے میں میں اپنی جان دینے کے لیے آمادہ ہوں۔

پیر صاحب : جمال دوسروں کی قیمتی جانوں کو ضائع کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن اپنی جان کو دوسروں پر قربان کر دینا اتنا آسان نہیں۔ جا بچہ، موت و حیات، بازار کا سودا نہیں، جس کو بدل لیا جاتے۔ ہر شے کے لیے وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ جس کی موت آتی ہے وہی جاتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کا قائم مقام نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو خدا کی خدائی میں خلل آجاتا۔ اور لوگ اپنے نوکروں کو اپنے بدلے ملک الموت کے حوالے کرتے رہتے۔ اور ان کی جانوں سے کھیلتے رہتے۔ اس طرح بڑے لوگوں کو کبھی موت نہ آتی۔

جمال : پیر صاحب میں بڑی آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آپ کی سرکار میں حاضر ہوا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کیجیے اور میرے ہمراہ چل کر ناہید کو صرف ایک نظر دیکھ لیجیے۔ اگر آپ نے اسے بچا لیا تو میں آپ کا بندۂ بے دام ہو جاؤں گا۔

پیر صاحب : میں تجھے اپنا بندہ بنا کر کیا کروں گا۔ تو خدا کا بندہ نہ بن سکا۔ عشق کا بندہ نہ بن سکا۔ اور اپنے محبوب اور مخلوق خدا

پر ظلم کرتا رہا۔ تو حسن کا بندہ نہ بن سکا اور گل سرسبز کو خاک میں ملا دیا۔ میں ظالم کا ساتھی نہیں۔ لیکن چونکہ ایک معصوم زندگی کا سوال ہے اس لیے میں تیرے ہمراہ چلنے کے لیے آمادہ ہوں۔ جمال، شاہ صاحب کی تمام کڑوی اور کسیلی باتیں شیرِ مادر کی طرح پی رہا تھا۔ اُسے پیر صاحب بڑے صاحب کرامت بزرگ معلوم ہوتے جنھوں نے بغیر ایک لفظ اُس سے پوچھے اس کا سارا کچا چٹھا، اُسے سنا دیا۔ اب اُسے یقین ہوگیا کہ اگر پیر صاحب کی توبہ ہوگئی تو ناہید بچ جائے گی۔ جمال شاہ صاحب کو لے کر محل میں داخل ہوا۔ محل میں، ہلچل مچ گئی۔ ہر شخص کی نگاہیں سوالیہ نشان بنی ہوئی تھیں اور حیرت زدہ ہوکر دیکھ رہی تھیں کہ شاہ صاحب جیسے بلند انسان کس طرح جمال خاں کے ساتھ چلے آتے کیونکہ آج تک کسی نے یہ بھی نہ سُنا تھا کہ شاہ صاحب نے کبھی حاجت مند سے ملاقات کی ہے، وہ لوگوں سے دور بھاگتے تھے۔ اس لیے کسی کے ساتھ آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تمام شہر میں یہ خبر گشت کر گئی کہ شاہ صاحب ناہید کو دیکھنے کے لیے محل میں آگئے۔ لوگ جو ناہید کی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔ ان میں نئی زندگی پیدا ہوگئی جمال کے گھر کے تمام لوگ اس کو ناہید کے حق میں نیک شگون سمجھ رہے تھے۔

شاہ صاحب نے گھر کے تمام ملازمین کو حکم دیا کہ تمام مرد اور عورت، علیحدہ علیحدہ ایک مقام پر اکٹھا ہوکر ناہید کے لیے نماز پڑھیں اور دعا کریں۔ ہم بھی دُعا کرتے ہیں اور تم سب دعا کرو۔ ہم بھی نماز پڑھتے

ہیں اور تم بھی نماز پڑھو۔ خدا معلوم کس کی دعا قبول ہو جائے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے جمال خاں سے کہا کہ ناہید کو ایک ایسے محل میں پہنچا دو جہاں کوئی دوسری عمارت برابر میں نہ ہو، اور اُس کے چالیس قدم کے فاصلے پر پہرہ ہوگا۔ میں جب تک عمل پڑھوں، کسی کو اس محل میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔

شاہ صاحب کے حسب الحکم، ناہید کو ایک تنہا عمارت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور اس عمارت کے چاروں طرف پہرہ لگا دیا گیا۔ جمال خود بھی شاہ صاحب کے ساتھ محل میں رہنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اس کے منشاء کو سمجھتے ہوئے کہا۔

شاہ صاحب : جمال تم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔

جمال بڑا خوش خوش روانہ ہُوا۔ جب شاہ صاحب محل کے قریب پہنچے تو انھوں نے پھر جمال کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔

شاہ صاحب : جمال تم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔ مگر یہ یاد رہے کہ جب ناہید کو ہوش آنے لگے تو تم باہر آجانا کیونکہ وہ تم کو دیکھ کر اگر دوبارہ بیہوش ہوگئی تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو ہوش میں نہ لا سکے گی۔

جمال نے عاجزی سے کہا۔ شاہ صاحب آپ تنہا جایئے میں نہیں چاہتا کہ اب اُس کو میری ذات سے کسی قسم کا صدمہ پہنچے۔ میں اپنے محل میں اس کی خیریت کا انتظار کر رہا ہوں۔

شاہ صاحب سب کو کام سے لگا کر سیدھے ناہید کے کمرے میں گئے۔ وہ بڑی بے چینی سے یہ وقت گزار رہے تھے۔ اور ناہید کے پاس جلد از جلد پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ناہید کو دیکھ کر شاہ صاحب کے دل پر ایک چوٹ پڑی۔ اُنھوں نے فوراً مصلّے بچھایا اور بارگاہ رب العزت میں اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

اے خدا، اے سب سے پہلے اور سب کے بعد رہنے والے اے غلبہ والے، اے ہمارے پوشیدہ رازوں کو جاننے والے۔ اے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے۔ اے ہر چیز پر قدرت والے۔ اے یگانہ و یکتا۔ اے بے نیاز۔ اے بلند مرتبہ والے، اے راحت پہنچانے والے۔ اے تکلیفوں کو دُور کرنے والے۔ اے غریبوں کی سننے اور ان کی مدد کرنے والے۔ اے مُردے میں رُوح ڈالنے والے اے بیماروں کو شفا دینے والے۔ اے ضرورت سے زیادہ عطا کرنے والے۔ اے کرم پر کرم اور احسان پر احسان کرنے والے۔ اے کل دعاؤں کے قبول کرنے والے۔ اے مطلب کو پُورا کرنے والے۔ اے حاجتوں کو بر لانے والے۔ اے نعمتوں کے نازل کرنے والے میرے اوپر رحم کر۔ خداوندا میری سب سے قیمتی چیز ناہید ہے اسے شفا دے۔ اے ٹوٹی ہُوئی امیدوں کو جوڑنے والے۔ اے یوسف کو یعقوب سے ملانے والے۔ مجھے میری ناہید سے ملا دے۔

افتخار مرزا دُعائے الٰہی میں مشغول تھا۔ اس کی محبوبہ موت و حیات

کی کشمکش میں پڑی تھی۔ اس لیے اس کی دُعا قلب کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی۔ باہر جمال خاں اور تمام ملازمین بھی نمازیں پڑھ کر ناہید کی سلامتی کی دُعا مانگ رہے تھے۔ افتخار مرزا کی دُعا ایک مرتبہ باب اجابت سے جاٹکرائی اور قبولیت کا تاج لے کر واپس لوٹی۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں اور ایک بزرگ کو دست بہ دُعا پایا۔ ناہید نے باریک سی آواز میں پانی مانگا۔ بزرگ نے فوراً پانی پلایا۔

ناہید : میں کہاں ہوں، آپ کون ہیں ؟

بزرگ : میں تمھارا دوست ہوں، تمھارے افتخار کا پیغام لے کر آیا ہوں، اس لیے آج مجھے اپنے حجرہ کو ویران کرنا پڑا۔

ناہید : آپ افتخار مرزا کو جانتے ہیں۔

بزرگ : ہم کیا نہیں جانتے۔

ناہید : افتخار کہاں ہیں ؟

بزرگ : وہ اسی آگرہ میں موجود ہے۔

ناہید : آگرہ میں ہوتے ہُوئے وہ مجھ سے ملنے بھی نہ آتے۔

بزرگ : وہ بھیس بدل کر تم سے ملنے آئے تھے مگر تم انھیں پہچان نہ سکیں۔

ناہید : وہ مجھے اس قید خانہ سے نکال کر کیوں نہ لے گئے۔

بزرگ : اس لیے کہ وہ خود گرفتار ہوگئے تھے۔ اور قدرت نے اُن کو موت کے منہ سے نجات دی۔

ناہید : کیا آپ کو افتخار مرزا نے بھیجا ہے۔

بزرگ : ہاں۔ تم یہی سمجھو۔ لیکن میں جمال خاں کے اصرار پر یہاں آیا ہوں۔

ناہید : کیوں ؟

بزرگ : ناہید۔ تم دو دن سے سخت بیمار تھیں۔ اور حکماء کو تمہارے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ اس لیئے جمال میرے پاس گیا تھا۔ میں نے اُسے بہت سخت وسست کہا۔ مجھے افتخار مرزا کا پیغام یاد آگیا اور میں یہاں چلا آیا۔

ناہید : مرشد، آپ نے میری زندگی بچا لی۔ یہ بھی بتایئے کہ مجھے میرا مسیحا اور یوسفِ گم گشتہ کب ملے گا۔

بزرگ : جب تم اس قابل ہو جاؤ کہ اس مسرت کو آسانی سے برداشت کر سکو۔

ناہید : اگر میں افتخار مرزا کو دیکھ لیتی تو مجھے مرتے وقت بہت سکون ملتا۔

بزرگ : نہیں ناہید۔ اب تم بالکل اچھی ہو۔ تم جتنی جلدی اچھی ہو گی۔ میں اتنی ہی جلدی تم سے تمہارے افتخار مرزا کو ملا سکوں گا۔

ناہید : میرے اچھے بزرگ، میں آپ کی کنیز ہوں۔ اگر آپ مجھے افتخار مرزا سے ملا سکتے ہیں تو فوراً ملا دیجیے۔ مجھے اب ایک منٹ جُدائی کی تاب نہیں۔ خدا کے لیے مجھے افتخار مرزا سے ملا دیجیے۔

اب افتخار مرزا کے لیے ضبط کرنا مشکل تھا۔ اُس نے کہا

بزرگ : کیا تم اپنے افتخار سے ملنا چاہتی ہو۔

ناہید : جی ہاں - اس سے بڑھ کر اور میرے لیے کیا مسرت ہو سکتی ہے!

بزرگ : کیا تم اپنے افتخار کو پہچان سکتی ہو۔

ناہید : اپنے محسن کو کون نہیں پہچانتا۔

بزرگ : اچھا دیکھو، میں کون ہوں ؟ افتخار مرزا نے ڈاڑھی ہٹالی - ناہید محوِ حیرت ہو کر رہ گئی - اور کہا - آپ ہی میری مسیحائی کے لیے آئے ہیں - افتخار مرزا اب مجھے اجازت دو کہ میں یہ زندگی جو تم نے دو مرتبہ مجھے دی ہے۔ تمھارے حوالے کر دوں۔

افتخار مرزا : ناہید تم بے حد کمزور ہو اس لیے زیادہ باتیں نہ کرو۔

ناہید : نہیں افتخار، میں تو اس لیے بیمار تھی کہ آپ سے الگ ہو گئی تھی - اب اگر بیمار ہوں گی تو اُس کی شکل یہ ہو گی۔

اپنے عیسیٰ کی توجہ کا طلب گار رہوں
فائدہ کی یہی صورت ہے کہ بیمار رہوں

افتخار مرزا : یہ تم نے سچ کہا - فائدہ کی یہی صورت ہے - ورنہ مجھے یہاں کون گھُسنے دے گا۔

ناہید : آپ اتنے عرصہ کہاں رہے - آپ کو کیا معلوم کہ آپ کے پیچھے مجھ پر کیسے کیسے ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔

افتخار مرزا : دیکھو ناہید - ابھی ان باتوں کو نہ چھیڑو، دیکھو اب تم جلدی سے ٹھیک ہو کر میری کٹیا میں آؤ - گل رُخ اور انجمن آرا

بھی وہیں ہیں۔ ہم سب مل کر کوئی رہائی کی تدبیر کریں گے۔

ناہید: بہتر۔

پیر صاحب نے جمال کو کہلا بھیجا کہ ناہید اچھی ہو گئی۔ یہ خبر بجلی کی طرح تمام محل میں پھیل گئی۔ ہر ایک آتا اور ناہید بیگم کو پلنگ پہ مسکراتا ہُوا دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا۔ ہر شخص اس کو پیر صاحب کی کرامت سمجھ رہا تھا۔ ورنہ ناہید میں زندگی کی کون سی کرن باقی رہ گئی تھی۔ ناہید کی صحت کی خبر سُن کر خود شیر شاہ سوری نے شہر میں عام چراغاں کا اعلان کر دیا اور اُس کو بہت سے تحفے بھیجے اور ہر طرف مسرت و خُوشی کے گیت گائے جانے لگے۔ وہی جگہ جو کچھ دیر پہلے ماتم کدہ بنی ہُوئی تھی۔ وہیں سے نغماتِ شادی بلند ہونے لگے۔

باب ۲۲

ہمایوں کی سندھ میں صحرا گردی

شہنشاہ بے ملک، اور سلطان بے تخت و تاج، ہمایوں شیر خان سے شکست کھا کر اپنی طاقت کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلے انھوں نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ لیکن کامران کی آنکھوں کو پھرا ہُوا دیکھ کر وہ لاہور سے سندھ کی جانب روانہ ہُوا۔ ہر روز اس کے لیے ایک نئی مصیبت اور ہر دن اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی نئی آفت لے کر آتا تھا کبھی کوئی ساتھی چھوڑ کر چلا جاتا۔ کبھی بھائی بغاوت کر دیتے، کبھی کوئی امیر، آپس کا نفاق اور خانہ جنگی دیکھ کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رخصت ہو جاتا، کبھی کوئی حملہ آور ہوتا، کبھی دشمن کے تعاقب کا خطرہ اور ان تمام بھائیوں عزیزوں اور امراء کی ستم کوشیوں کے علاوہ فطرت بھی گویا اس کی بے دست و پائی اور مفلوک الحالی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ہر قدم پر اُس کو ایک تازہ مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ کہیں کھانا ختم ہوتا تو کئی کئی دن اور اس کے سپاہی جنگل کے بیروں کو کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے، ریگستانی سفر میں قدم قدم پر قحط آب کی مصیبت

برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اپنے وفا پرور اور جان نثاروں کو ایک ایک گلاس پانی کے لیے لڑتے اور تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھتا۔ لیکن وہ ہر منزل پر خدا کا شکر کرتا، ہر تازہ بلا کو اپنے سینے سے لگاتا اور مسکرا کر اس کا استقبال کرتا اور ہر نئی مصیبت کو صبر و شکر سے برداشت کرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن ان تمام صعوبتوں کے باوجود وہ ہندوستان کی سرزمین کو کسی طرح چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ وہ وقت کی تلاش میں تھا کہ شاید قسمت اُس کو ایک ایسا موقع مہیا کر دے کہ وہ دوبارہ افغانوں سے اپنی حکومت چھین لے۔ اس کو صدمہ یہ تھا کہ اُس کے والد جنت مکانی بابر نے کل ۱۲ ہزار مغلوں کی جمعیت سے ہندوستان فتح کر لیا اور وہ ایک بہت بڑی حکومت اور فوج کا مالک ہوتے ہُوئے افغانوں کو شکست نہ دے سکا۔ یہ غم اس کو گھن کی طرح لگ گیا تھا۔ اور جب وہ اس پر سوچتا تو اس کو سخت ذہنی اذیت ہوتی۔ شاہی قافلہ ملتان کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں اُس کو یہ اطلاع ملی کہ مرزا ہندال، یادگار ناصر اور قاسم حسین سلطان کو بلوچیوں نے گھیر لیا ہے۔ جب بادشاہ کے ملتان پہنچنے کی خبر گرم ہُوئی تو بلوچی شہزادہ ہندال کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور یہ شہزادے اپنی جان بچا کر شاہی جماعت سے آ ملے۔ یہاں یہ خبر بھی گرم ہُوئی کہ خواص خاں اب تک شہنشاہ ہمایوں کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ مگر بعد میں یہ خبر غلط ثابت ہُوئی۔ بادشاہ شہزادوں کو لے کر آگے روانہ ہُوا جب اوچھ کے قریب پہنچا تو اپنے ایک قاصد کے ساتھ

ایک جھنڈا، ایک پیڑا اور چار ہاتھی بخشی منگا زمیندار کے پاس بھیجے اور خان جہانی کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ اس صلے میں اُس نے کچھ مطلوبہ سامان اور چند کشتیاں شہنشاہ کے پاس بھجوادیں۔ لیکن خود حاضر نہ ہُوا۔ شہنشاہ ہمایوں ان کشتیوں پر سوار ہوکر، اوچھ سے دریا کے کنارے کنارے ہوتا ہُوا بھکر پہنچا۔ اور شاہ حسین مرزا، جو اس وقت حاکم ٹھٹھہ تھا اس کے باغ میں جا ٹھہرا۔

چند روز کے بعد بادشاہ نے مرزا ہندال کو مقام پات کی طرف روانہ کیا اور مرزا یادگار ناصر کو بہرہ کے قریب بھیجا۔ اس کے بعد قنبر بیگ کو ایلچی بنا کر شاہ حسین مرزا کے پاس روانہ کیا۔ جب ان کو گئے ہوئے زیادہ عرصہ گزر گیا تو دوسرا فرمان روانہ کیا کہ اگر شاہ حسین مرزا کو آنے میں تامل ہو تو اطلاع دو۔ انھوں نے اطلاع دی کہ شاہ حسین خود بادشاہ کی قدم بوسی کے مشتاق ہیں۔ بادشاہ نے چند روز اور انتظار کیا۔ جب دیکھا کہ نہ وہ خود آتے ہیں اور نہ کوئی اُن کا جواب آتا ہے تو اُن کو لکھا کہ اگر شاہ حسین نہیں آتے تو تم لوگ فوراً واپس چلے آؤ — قنبر بیگ نے شاہ حسین کو نذرانہ جس میں ایک اونٹ ایک ٹٹو، و گھوڑے خیمے اور دریاں بھی شامل تھیں۔ لے کر شہنشاہ ہمایوں کے حضور میں حاضر ہُوا۔ تمام واقعات بیان کرنے کے بعد قنبر بیگ نے یہی رائے دی کہ اب ہم کو یہاں سے جلد کوچ کرنا چاہیے کیونکہ اب دیر کرنا فضول ہے۔ شاہ حسین کبھی نہیں آئے گا۔

اُس نے یہ بہانہ کیا ہے کہ فاصلہ بہت ہے۔ بادشاہ سلامت بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب میں اُن کے پیچھے کہاں کہاں پھرتا رہوں گا۔ مرزا ہندال نے اسی اثنا میں شہنشاہ ہمایوں کو لکھا کہ اگر حضور اجازت دیں تو سوہان کے علاقہ کو فتح کر لیا جائے۔ بادشاہ نے کہا۔ میں خود تمھاری جانب آرہا ہوں۔ وہاں آنے پر مشورہ ہوگا اور جیسا مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد شاہی جماعت مرزا ہندال کی جانب روانہ ہُوئی۔ چار دن کی مسافت کے بعد یہ قافلہ مرزا یادگار ناصر کے پڑاؤ پر پہنچا۔ مرزا ناصر نے شہنشاہ کا استقبال کیا اور دو دن بطور مہمان رکھا۔ بادشاہ پھر شہزادہ ہندال کی طرف چلا۔ اور اس نے چلتے وقت مرزا یادگار ناصر کو یہ ہدایت دی کہ تم تاحکم ثانی اس مقام پر قیام کرو تین دن کے بعد بادشاہ کی سواری مقام پات پر پہنچی۔ جہاں مرزا ہندال اپنے خیمے ڈالے ہُوئے پڑا تھا شہزادے نے نہایت خلوص و محبت سے اپنے بھائی کا استقبال کیا اپنے خیمے میں شہنشاہ کو ٹھہرایا اور خوب دل کھول کر مہمانی کی۔

شہنشاہ ہمایوں بھی اپنے بھائی سے بڑے تپاک سے ملے۔ دونوں بھائی بڑی دیر تک حالات و واقعات کا جائزہ لیتے رہے۔ لیکن آئندہ اقدام کے متعلق کوئی قطعی بات طے نہ ہو سکی۔ سیدھی سی بات یہ تھی کہ شہنشاہ کو مصیبت میں گھرا ہُوا دیکھ کر نوکر چاکر۔ بھائی، امراء، دوست، اہل لشکر سب اس سے کنارہ کشی کرنے کی فکر میں تھے۔ اب شہنشاہ کے

پاس بہت مختصر سپاہ تھی۔ اس سے ہندوستان میں افغانوں کی طاقت کو ختم کرنا ناممکن تھا۔

اس تھکے اور لُٹے ہُوئے خراب و خستہ قافلہ کے ہمراہ شاہی بیگمات بھی تھیں۔ ان کی حالت بے حد تباہ تھی۔ کہاں یہ عالم کہ کبھی قدم دہلیز سے نہ نکالا۔ کبھی دو قدم چلنے کا اتفاق نہیں ہزاروں کنیزیں، خادمائیں، لونڈیاں غلام خدمت کو حاضر۔ روپیہ پیسہ کی ریل پیل۔ سامانِ آرائش و آسائش کی بھرمار۔ یہی ناز و نعم کی پلی ہُوئی حسین و خوبصورت شہزادیاں جنگل و بیابانوں کی خاک اُڑاتی پھر رہی تھیں۔ اب بھی محل سرا تھی۔ لیکن اس محل سرا اور آگرہ کی شاہی محل سرا میں بڑا فرق تھا۔ نہ یہاں شاہی عمارات اور محلات کا سلسلہ تھا۔ نہ سر بہ فلک عمارتیں تھیں۔ نہ نقش و نگار تھے، نہ باغات تھے۔ نہ روشیں تھیں۔ نہ کنیزیں اور باندیاں تھیں۔ چند خیمے چند اونٹ، چند عماریاں، یہی محل سرا کا اثاثہ تھا۔

گو خیمے بہت کشادہ تھے۔ اور ان خیموں کے ستونوں پر سونے اور چاندی کے خول چڑھے ہُوئے تھے۔ فرش تھا مگر مختصر۔ شیشہ آلات تھا۔ مگر ایک دو جھاڑ۔ کنیزیں تھیں۔ مگر کم۔ پہلے سامان عیش و عشرت کی ریل پیل تھی۔ اب کھانے کے لالے تھے۔ پہلے جمنا کا پانی آ کر حوض میں شوخیاں کرتا تھا۔ اب ایک گلاس پانی پر دو سپاہی تلوار نکال کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے دُنیا طابع تھی۔ اب سارا عالم بغاوت اور سرکشی پر آمادہ تھا۔ اس قافلہ میں مرزا ہندال کی والدہ بھی تھیں جو ہمایوں سے

بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے مرزا ہندال کی شادی شہنشاہ ہمایوں نے اس قدر اہتمام سے کی تھی۔ اب ہر مرد و عورت کی نظر شہنشاہ ہمایوں پر لگی ہوئی تھی کہ دیکھیے شہنشاہ اپنی حکومت کو افغانوں سے واپس لینے کے لیے کیا قدم اُٹھاتے ہیں۔ کیونکہ دُنیا کی ساری رونق حکومت کے دم سے تھی۔ اور حکومت و تاج و تخت کی زینت شہنشاہ ہمایوں تھے۔

محل سرا کے ایک خیمہ میں مرزا ہندال کی والدہ دل دار بیگم ایک مسند پر بیٹھی ہیں چند کنیزیں ان کے سامنے ادب سے کھڑی ہوئی ہیں۔

دلدار بیگم : دیکھو تم سب برابر کے تینوں خیموں کو آراستہ کرو۔ شہنشاہ ہمایوں نے ہمارا دعوت نامہ قبول فرمالیا ہے؟ اور آج شب وہ ضیافت میں تشریف لارہے ہیں۔ دیکھو۔ حمیدہ بانو کو بھی بھیج دینا۔

کنیز : بہت اچھا سرکار۔

تھوڑی دیر میں ایک انتہائی حسین و نازک اندام حسینہ جس پر انسان ہونے کے بجائے پری ہونے کا شبہ ہوتا تھا کمال سادگی اور بے نیازی سے آکر دلدار بیگم کے سامنے مودب کھڑی ہوگئی۔

حسینہ : امی جان۔ کیا آپ نے یاد فرمایا تھا۔

دلدار بیگم : ہاں بیٹی۔ میں نے ہی بلایا تھا۔

حمیدہ بانو : فرمایئے۔ کیا حکم ہے۔

دلدار بیگم : بیٹی حمیدہ، تم جانتی ہو کہ تمھاری والدہ مرحومہ نے خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا

تھا۔ میں نے اس وقت سے تم کو اپنی بیٹی سمجھا، تمہارے والد شیخ علی اکبر میرے بچے ہندال کے اتالیق تھے۔ وہ میرے بچے سے بہت محبت کرتے تھے اور اس پر بہت مہربان تھے۔ تم اسی وقت سے محل میں آیا جایا کرتی تھیں۔ تمھاری عادتیں اور بھولی بھالی باتیں مجھے بے حد پسند تھیں اور اسی لیے میں نے تم کو تمھارے والدین سے لے لیا تھا۔

حمیدہ بانو: جی ہاں امی جان۔ مجھے یہ سب باتیں معلوم ہیں۔ آپ نے مجھے اپنی بیٹی سمجھا۔ اور آپ نے وہ احسانات اس کنیز پر کیے ہیں کہ میں ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔

دلدار بیگم: حمیدہ میں نے آج تم کو اہم باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کب تک رہوگی۔

حمیدہ بیگم: دلدار بیگم کے پاس ہی مسند پر بیٹھ گئی۔ دلدار بیگم نے کہنا شروع کیا۔

حمیدہ میں نے تم کو بیٹی کی طرح پالا ہے۔ ہر ماں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی ایسے شریف اور نیک مرد کے ہاتھ میں دے، جہاں وہ باقی عمر آرام و چین سے زندگی بسر کرسکے۔ بیٹی مرد، عورت کا محافظ ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تیرا بیاہ بھی دل کھول کر کروں گی۔ لیکن بیٹی تو ہماری موجودہ حالت دیکھ رہی ہے۔ ہماری حکومت، محلات، باغات، سامان عیش و عشرت، گھر بار، روپیہ پیسہ، گھوڑے، ہاتھی، کنیز، غلام سب ہم سے چھن گیا۔ اب ہم بگولوں کی طرح سندھ کے ریگستان کی

خاک چھان رہے ہیں بیٹی تو نے ہمارا شاندار ماضی دیکھا۔ حال گزر رہا ہے۔ خیر اس رزاق حقیقی کا شکر ہے کہ وہ ہم کو رزق عطا کر رہا ہے مستقبل کے متعلق کوئی حکم لگانا قبل از وقت ہے۔ افسوس بڑھاپے میں یہ ذلتیں اور رسوائیاں لکھی تھیں۔ کیا مقدر میں یوں ہی در بدر آوارہ پھرنا لکھا تھا۔ دلدار بیگم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جسے انھوں نے جلد دوپٹہ کے آنچل سے پونچھ لیا اور کہا — کل تک ہم کل ہندستان کی عورتوں اور مردوں کی عزت کے محافظ تھے۔ آج ہماری عزت و ناموس خطرے میں ہے۔ پہلے ہم دوسروں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ آج ہمارا دست سوال بلند ہے۔ اب ہمارا نگہبان سوائے خدا کے دوسرا نہیں۔ بیٹی اب میں تیری حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس لیے چاہتی ہوں کہ تیرا ہاتھ جلد از جلد کسی معقول مرد کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

حمیدہ بانو: (روتے ہوئے) امی جان آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں، خدا ہم سب کا محافظ ہے۔ امی جان میں اس عالم میں آپ کے قدموں سے جدا ہونا نہیں چاہتی جب کہ ساری دنیا آپ سے اپنا رشتۂ الفت توڑ چکی ہے۔ امی جان مجھے اس سخت آزمائش میں نہ ڈالیے۔

دلدار بیگم: بیٹی میں کس طرح، ان حالات میں کسی جوان لڑکی کو اپنے ہمراہ رکھ سکتی ہوں۔ آج شہنشاہ ہمایوں نے میری دعوت

کو قبول کر لیا ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔ میں تجھ کو اُن کی جناب میں پیش کروں گی۔ اگر اُن کی نظرِ عنایت ہو گئی تو میں تیرا عقد کسی اچھی جگہ کر سکوں گی۔ بیٹی۔ ہمایوں آسمانِ اخلاق و شرافت کا انتہائی تابندستارہ ہے۔ وہ دریائے لطف وکرم ہے۔ وہ کانِ شرافت کا لعل بدخشاں ہے۔ وہ بڑا جری، بڑا نڈر، بڑا متحمل بڑا صاحبِ عزم جوان ہے۔ اس میں اپنے ہم جنسوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ خلوص کا پتلا اور وفا کا پیکر ہے۔ بیٹی اگر اس کے بھائیوں کو اس کی ان خوبیوں میں سے ایک حصہ بھی مل گیا ہوتا تو عظیم الشان حکومت کبھی اُس کے ہاتھ سے نہ نکلتی بیٹی شہنشاہ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ان کو حکومت کے جانے، بھائیوں کی غداری اور دوستوں سے چھٹ جانے کا صدمہ ہے۔ دیکھو کوشش کرنا کہ اُس کے دُکھے ہوئے دل پر تم مرہم رکھو اور اُس کو کچھ دیر کے لیے رُوحانی سکون پہنچا سکو۔

حمیدہ بانو: امی جان! مجھے یہ سب باتیں معلوم ہیں میں جانتی ہوں کہ آپ نے ہمیشہ مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا۔ مجھ پر ایسے احسانات کیے جو کوئی اولاد پر بھی نہیں کر سکتا۔ میں ضرور آپ کے کہنے کے مطابق عمل کروں گی۔

دلدار بیگم: بیٹی شہنشاہ ہمایوں سے ان حالات میں تمہاری شادی کا کُھل کر تذکرہ نہیں کر سکتی۔ تم کو یہ کام اپنی فراست سے کرنا ہوگا۔

حمیدہ بانو شرما کر اُٹھی اور بھاگ کر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ ادھر دلدار بیگم خیموں کی صفائی اور شہنشاہ کی ضیافت کے کاموں میں مشغول ہوگئیں۔

شاہی دولت سرا اور محل سرا میں جتنی بھی عیش و عشرت کی چیزیں تھیں۔ ان کو سلیقے سے تین خیموں میں لگا دیا گیا۔ بہترین جھاڑ اور مومی شمعیں روشن کی گئیں۔ راستے میں پھولوں کی کیاریاں بنائی گئیں۔ ہر طرف قالین بچھائے گئے اور تمام کنیزیں، اصیلیں، باندیاں، لباس بدل کر شہنشاہ کے استقبال کے لیے آمادہ ہو گئے۔

شہنشاہ ہمایوں مقررہ وقت پر محل سرا کے در پر آئے۔ اب بھی بہت سے ملازمین قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ کئی جان نثار ان کو خیمے تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ محل سرا کے اندر کنیزوں اور خواجہ سراؤں کے پرے نے اُن کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔ گویا چاند اب ستاروں میں آ گیا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں خراماں خراماں ڈیوڑھی تک آئے۔ خود دلدار بیگم نے بڑھ کر لب فرش سے استقبال کیا۔ اُن کی بلائیں لیں اور شہنشاہ پر کچھ سکے تصدق کیے۔ شہنشاہ ہمایوں اب بہت سی عورتوں کے نرغے میں مسند پر جا کر بیٹھ گئے۔ روشنی سے تمام خیمہ بقعۂ نُور بنا ہُوا تھا۔ خوبصورت اور حسین چیزوں نے خیمہ کی روشنی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ مگر شہنشاہ ہمایوں ان تمام چیزوں سے بے نیاز کسی اور ہی عالم میں تھا۔ اتنی دیر میں ہمایوں کی نظر ایک مجسمۂ حُسن و سادگی پر پڑی۔ اس باذوق شہنشاہ نے اپنی زندگی میں حُسن کے نادر سے نادر نمونے دیکھے تھے وہ حُسن کا نبّاض تھا۔ ہزاروں مہوشیں اپنے آپ کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرتی تھیں کہ شاید شہنشاہ والا تبار

کی نگاہ کرم اُن تک پہنچ جائے۔ لیکن خدا معلوم اس شعلہ حُسن میں کیا بات تھی جس نے ہمایوں کے دل کو جلا کر خاک کر دیا۔ اس حسینہ کا قد متناسب، اعضا سڈول، رنگ خوب صاف اور نقشہ انتہائی تیکھا تھا۔ وہ انتہائی سادہ لباس پہنے ہوئے تھی لیکن اس کے چہرہ سے نُور کی کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اس کی لمبی لمبی سیاہ آنکھیں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی۔ بلکہ ہر قدم پر قیامت اُٹھاتے شہنشاہ کی جانب چلی آ رہی تھی۔ شہنشاہ عالم پناہ بھی ایک عجیب محویت کے عالم میں اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہو کر اُس کو گھور رہے تھے۔ اچانک شہنشاہ ہمایوں کی نظر اس حسینہ کی نظر سے ٹکرائی۔ اور ایک دوسرے کو پیغامِ محبت دیتی ہُوئی اپنے اپنے مرکز پر واپس لوٹ گئیں۔ ہر عورت متبسم نظروں سے اس نظارہ کو دیکھ رہی تھی۔ سب کو اس کا علم تھا۔ لیکن ایک ہمایوں تھا جو سب سے بے خبر صرف ایک شعلہ حُسن کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وہ حسینہ قریب آئی اور اُس نے نہایت سُریلی آواز میں کہا۔

حمیدہ بانو: جہاں پناہ۔ کنیز مجرا پیش کرتی ہے۔

یہ کہا اور ایک عجیب انداز سے جس سے شانِ بے نیازی ٹپکی پڑتی تھی۔ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

شہنشاہ ہمایوں: خاتون تمہارا کیا نام ہے؟

حمیدہ: جہاں پناہ کنیز کو حمیدہ بیگم کہتے ہیں۔

اتنی دیر میں دستر خوان بچھا دیا گیا۔ انواع و اقسام کے کھانے چُن

دیے گئے۔ لیکن کوئی چیز بھی ہمایوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا حُسن ہے جس نے اس کے دل و دماغ پر سحر کر دیا ہے۔ یہ کیسی صورت ہے جو ہر لمحہ اس کے دل میں بیٹھی جا رہی ہے۔ یہ کیسی کشمکش ہے کہ وہ اس انجان لڑکی کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔

دسترخوان پر اس کے عین مقابل وہی کافر، وہی رہزن عقل و ہوش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ سے متانت ظاہر ہو رہی تھی۔ گویا وہ کہہ رہی تھی کہ اے شیر شاہ سوری کی شکست کو قبول نہ کرنے والے، اے بڑی سے بڑی مصیبت میں ثابت قدم رہنے والے۔ اے ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی آرزو رکھنے والے۔ اے بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے والے، دیکھ کہ میں نے کتنی سی دیر میں تیرے دل کو فتح کر لیا ہے۔

ہمایوں برائے نام کھانا کھا رہے تھے۔ اصل میں اُن کی نگاہیں اس حسینہ کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کھانے میں بڑی دلچسپ حرکتیں کر رہے تھے۔ حمیدہ بانو بھی شہنشاہ کی نگاہوں کا پیغام سُن چکی تھی اور اپنے مقام پر بیٹھی ہمایوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہمایوں مردانہ حُسن کا ایک نادر نمونہ تھا۔ وہ شہنشاہ تھا۔ ممکن ہے اس کی قسمت سے وہ دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ ہو جائے اور وہ ملکہ ہندوستان کہلائے۔

ادھر دلدار بیگم خُوش تھیں کہ ان کی دعوت اور نصیحت دونوں کارگر ثابت ہُوئیں۔ وہ حمیدہ بانو کی خوبصورتی سے واقف تھیں۔ ان کو معلوم

تھا کہ اگر وہ شہنشاہ ہمایوں کو اپنی طرف متوجہ کرلے تو ملکۂ ہند بن سکتی ہے۔ وہ ہمایوں کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جارہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں کھانا ختم ہُوا اور ناچ و رنگ کی محفل قائم ہُوئی۔ لیکن شہنشاہ نے سب کو رخصت کر دیا۔ جب سب چلے گئے تو شہنشاہ نے دلدار بیگم سے پوچھا۔

شہنشاہ ہمایوں : یہ حمیدہ بانو بیگم کون ہیں ؟

دلدار بیگم : جہاں پناہ۔ یہ شیخ علی اکبر جامی کی لڑکی ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : اچھا وہ جو ہندال کے اتالیق تھے۔

دلدار بیگم : جی ہاں جہاں پناہ۔

شہنشاہ ہمایوں : کیا یہ کہیں منسوب ہے ؟

دلدار بیگم : ابھی نہیں جہاں پناہ۔

شہنشاہ : ہم اس کو اپنے واسطے قبول کرتے ہیں۔

دلدار بیگم : یہ جہاں پناہ کی ذرّہ نوازی ہے۔

باب ۲۳

نغمۂ شادی

اب ناہید ایک ہفتہ سے بالکل تندرست ہو گئی تھی۔ اس کا حسن واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ پھول کی طرح شاداب و خنداں نظر آتی تھی۔ جمال خاں اس کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے ناہید کو مرنے سے بچا لیا۔

جمنا والے شاہ صاحب کی کرامت، کے سب اہل شہر چھوٹے اور بڑے قائل ہو گئے تھے۔ ناہید کے شفا پانے سے ان کی شہرت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اور شہر میں جگہ جگہ انھیں کے معجزات بیان کیے جاتے تھے۔ اس طرح غرض مندوں کا مجمع پہلے سے کہیں زیادہ ان کی کوٹھڑی کے چاروں طرف جمع رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے لوگوں کی لاکھوں درخواستوں پر یہ قبول کر لیا کہ وہ روزانہ نماز صبح کے بعد سے نماز عصر سے قبل تک حاجت مندوں سے ملاقات کریں گے۔ لیکن اس کے بعد کسی کو اس علاقہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ہو گی۔ شاہ صاحب نے اس عرصہ میں ایک اور یہ اصول بنا لیا تھا کہ ہر شخص ان سے حاجت بیان کر سکتا تھا۔ اور اس کے

بعد وہ دوبارہ اس سلسلہ میں ان سے نہ مل سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگوں کا اژدہام صبح سے شروع ہو جاتا اور دوپہر تک لوگ واپس چلے جاتے۔ شاہ صاحب جونہی نماز عصر کے لیے کھڑے ہوتے مجمع کائی کی طرح چھٹ جاتا۔ اور تمام علاقہ آدمیوں سے صاف ہو جاتا۔ لوگوں پر شاہ صاحب کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ کوئی شخص چُھپ کر بیٹھنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ آج بھی شاہ صاحب نماز عصر پڑھنے کے بعد تہہ خانہ میں تشریف لے گئے۔ سامنے سے چند قہقہوں نے اُن کا استقبال کیا۔

انجمن آرا: آیئے پیر صاحب۔ آپ کی کرامت کے تو ڈنکے بج رہے ہیں۔ شیر خان، بھیڑ خاں، جلال خاں، وبال خاں اور خدا معلوم کتنے احمق آپ کے معتقد ہیں۔ خدا کی قسم آپ کے فرقے کا بھی جواب نہیں۔

پیر صاحب: ہم نے یار کی خاطر یہ سب ڈھونگ رچایا ہے۔

انجمن آرا: آپ ہی پر منحصر نہیں۔ آپ کی قوم کا تقریباً ہر فرد کسی نہ کسی وجہ سے ایسا ڈھونگ رچا لیتا ہے۔ کوئی پولیس سے بچنے کے لیے کوئی کسی جرم سے بچنے کے لیے کوئی فکر معاش سے آزاد رہنے کے لیے یہ پیشہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن کیونکہ ہر وقت یہی خطرہ رہتا ہے کہ شاید اس گرد و غبار پیری میں کوئی اہلِ دل نہ چُھپا ہو۔ اس لیے انسان ہر ایک کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ورنہ آپ کے فرقے کی قلعی تو سعدی نے بڑی اچھی طرح کھولی ہے۔

چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

اور آپ ہی دیکھ لیجیے۔ باہر پیر۔ اندر ناہید کے مرید، عورتوں کے ندیدے، حسن پر رال ٹپکانے والے، مریدنیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے۔

افتخار مرزا: دیکھو انجمن اس جھگڑے میں مجھے نہ کھینچو۔

انجمن آرا: یہ تو اظہار حقیقت ہے۔ اگر سعدی ہوتے تو میں اُن کے پاؤں دھو دھو کے پیتی۔ انھوں نے اس فرقہ کی ایسی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے کہ جی خُوش ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

محتسب در قفائے رندان است

غافل از صوفیان شاہد باز

افتخار مرزا: میں کب اس پیشہ کی حمد وثنا کر رہا ہوں کہ تم فریاد میں تیشے پر تیشے لگائے جا رہی ہو۔

انجمن آرا: اجی پیر صاحب اس میں آخر بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ جتنے اعلیٰ درجہ کے عاشق گزرے ہیں وہ یا پیر تھے یا فقیر، مجنوں ذرا احمق قسم کے تھے کہ اپنا سبھی کچھ لٹا کر الف ہو کر۔ صحرا نوردی کرتے رہے۔ ورنہ ویسے دوسروں کو عشق مجازی، عشق حقیقی کا زینہ نظر آیا۔ وہ تصوف کا جامہ پہن کر کھٹ سے زینہ پر چڑھ گیا اور صاحب کرامت بزرگ بن گئے۔ کیا بات ہے ان پیروں کی۔

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

گُل رُخ: معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری کسی پیر کی چوٹ کھائے ہُوئے ہے۔ تب ہی ایسی جلی کٹی باتیں کر رہی ہے۔

انجمن آرا : میں تو نہیں۔ البتہ یہ چوٹ ناہید کو کھانا پڑے گی۔ خدا اس پر اپنا فضل کرے۔ اس کا حُسن، حسن مجازی رہے، اور وہ کسی حسن کا زینہ نہ بنے۔ ورنہ یہی پیر صاحب ایسی ایسی حرکتیں کریں گے کہ وہ بیچاری خودکشی پر آمادہ ہو جائے گی۔

افتخار مرزا : اچھا بہن اب اس پیری فقیری، مریدی کے چکر کو چھوڑ دو اور کام کی بات کرو۔ ہم کو اب فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنا چاہیے۔

ناہید : دیکھیے میرے خیال میں آپ اس چکر میں نہ پڑیے اگر ہم یہاں سے سندھ تک گئے بھی تو ہم کو راستہ میں کم از کم چالیس دن لگ جائیں گے۔ راستے میں ہم کس طرح اپنے آپ کو جمال خاں اور شیر خاں کی فوجوں سے بچا سکیں گے۔ اس لیے فی الحال یہاں سے جانے میں خطرہ ہے۔

انجمن آرا : کیوں نہیں۔ تم کو اللہ میاں نے پیر توت عطا کر دیا اب تم کو دوسروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

ناہید : یہ بات نہیں۔ اگر تم کہو تو میں پیر صاحب سے کنارہ کشی کر سکتی ہوں۔ لیکن تم جیسی وفا پرست سہیلیوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری قسمت میں ہمیشہ سے ٹھوکریں لکھی ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ لوگوں کے ہمراہ جاؤں۔ اگر آپ لوگ کہیں چلے جائیں تو کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا۔ لیکن مجھ بدنصیب کے شامل ہونے سے تمام سلطنت میں ہنگامہ مچ جائے گا۔ اور اگر ہم پکڑے گئے تو اس کی سزا موت ہوگی۔

انجمن آرا : پھر کیا ہوا؟

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

ہم کو موت سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ بلکہ اپنی آزادی کی جد وجہد جاری رکھنا چاہیے۔

افتخار مرزا : نہیں۔ اب ہم یہاں زیادہ عرصہ تک پناہ نہیں لے سکتے۔ فریب ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم یہی مناسب خیال کرتے ہیں کہ یہاں سے جلد از جلد نکل جائیں۔ ہم یہاں سے سیدھے گجرات جائیں گے اور وہاں سے کوئی دوسرا بندوبست کرکے سندھ کی جانب نکل جائیں گے۔ وہاں ہم شہنشاہ ہمایوں سے مل جائیں گے۔

ناہید : میں تو آپ سب لوگوں کی کنیز ہوں، مجھے اپنی فکر نہیں بلکہ یہی خیال ہے کہ کہیں ایک میری وجہ سے آپ تینوں کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائیں۔

انجمن آرا : ناہید۔ تم بڑی خودغرض ہو۔ تم کو ہم بے زبانوں پر کوئی ترس نہیں آتا۔

افتخار مرزا : میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم سب کو کل شام روانہ ہونا ہے۔ ناہید، تمھارا کام صرف یہ ہے کہ تم کل چھ بجے کے قریب یہاں آجاؤ اور کوئی ایسا مضبوط بندوبست کرو۔ کہ گھر والوں کو یہ یقین رہے کہ تم بیمار ہو اور اپنے کمرے سے کہیں باہر نہیں گئی ہو۔ باقی میں سب ٹھیک کر لوں گا۔

ناہید : میں جارہی ہوں اور آپ کی ہدایت کے مطابق کل ٹھیک چھ بجے اس مقام پر پہنچ جاؤں گی۔

اس فیصلہ کے بعد افتخار مرزا نے فوراً ایک آدمی جمال خاں کے پاس بھجوایا۔ اور جب وہ آیا تو اُس کو حکم دیا کہ وہ یہ حکم نامہ جاری کرے کہ شاہ مصطفےٰ شاہ اور ان کی تین لڑکیاں گجرات جارہی ہیں۔ اس لیے ہر چوکی و ہر پہرہ پر اور ہر شہر میں اُن کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور ان کو کسی طرح پریشان نہ کیا جائے۔

جمال خاں، خوش خوش زمیں بوس ہو کر گیا اور اس قسم کا حکم نامہ مہر شاہی کے ساتھ لاکر شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ افتخار مرزا نے اطمینان کا سانس لیا اور آئندہ کا پروگرام مرتب کرنے لگا۔ اُس نے اپنے ایک دوست احمد علی کو اس قافلہ کا قافلہ سالار بنایا اور اس کو پانچ سو سواروں کا حاکم بنا کر بھیجنے پر آمادہ کر دیا اور اسے سمجھا دیا کہ وہ کسی کو پالکیوں کے پاس نہ آنے دے۔ اور یہی کہتا رہے کہ ہمارے پاس شاہی حکم نامہ ہے اس لیے جب تک کوئی دوسرا حکم نہ دکھاؤ گے۔ تم پالکیوں کے قریب نہیں جا سکتے۔ شاہی فرمان کی عدول حکمی کرنے والے کو شیر شاہ سوری کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

ادھر ناہید نے اپنی خادمہ خاص کو بہت سا زیور اور کپڑے وغیرہ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ شام کو چھ بجے سے دروازے پر بیٹھی رہے اور کسی کو رات بھر کمرے میں داخل نہ ہونے دے۔ وہ یہی

کہتی رہے کہ بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے وہ آرام کر رہی ہیں اور صبح کو اس بات پر اڑی رہے کہ بیگم صاحب میرے سامنے کمرے میں گئی تھیں اس کے بعد وہ ایک منٹ کو باہر نہ نکلیں۔ غرضیکہ یہ تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد افتخار مرزا نے ایک قافلہ ترتیب دیا۔ پالکیوں میں انجمن آرا، گُل رُخ اور ناہید کو سوار کیا اور یہ قافلہ اسی دن شام کو آگرہ سے باہر نکل گیا۔

افتخار مرزا نے اپنا تہہ خانہ مضبوطی سے بند کر دیا اور وہ رات بھر کمبل پر اپنی جھونپڑی میں بیٹھا رہا اور آنے والے واقعات کا تیزی سے انتظار کرنے لگا۔ صبح کو جمال خاں کے محل میں ناہید کے اچانک گُم ہو جانے سے کہرام مچ گیا۔ پہلے تو یہی سمجھا گیا کہ ناہید کہیں تفریح کے لیے گئی ہے۔ لیکن جب ملازمہ نے یہی کہا کہ وہ شام سے اپنے کمرے میں بند تھی اور وہ ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں گئی تھی تو ایک ہلچل مچ گئی۔ ہر شخص اپنی عقل و سمجھ کے مطابق اس حادثہ پر تبصرہ کر رہا تھا۔ جمال خاں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ منہ سے کف جاری تھے۔ وہ غصہ میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ اُس نے تمام ملازمین کو گالیاں دینا اور مارنا شروع کر دیا۔ لیکن سب نے یہی کہا کہ انھوں نے ناہید کو کہیں جاتے نہیں دیکھا ملازمۂ خاص کو جمال خاں نے سب سے زیادہ زد و کوب کیا لیکن اس نے ہر بات پر یہی کہا کہ وہ میرے سامنے کمرے میں گئی تھی۔ پھر خدا معلوم کہاں غائب ہو گئی۔ جمال خاں نے پہرہ

کے سپاہیوں کو بہت کچھ ڈرایا دھمکایا۔ مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ جمال خاں نے اپنے بال نوچ لیے۔ سر پھوڑ ڈالا۔ کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اب غصہ نے غم کی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر دیوانوں کی طرح رونے لگا۔ اس عرصہ میں کسی نے اس کی توجہ پیر صاحب کی طرف مبذول کرائی۔ وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ جیسے اندھیرے میں روشنی نظر آگئی۔ وہ سیدھا پیر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ پیر صاحب حسبِ دستورِ عبادت میں مشغول تھے۔ بہت سے لوگ پیر صاحب سے ملاقات کرنے کی امید میں کھڑے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے جمال خاں کو اس عالم میں دیکھا تو سمجھے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہیں شیر خاں۔ بیمار تو نہیں۔ کہیں ہمایوں نے لشکر کشی تو نہیں کر دی۔ لوگ اس قسم کی خیال آرائیاں کرتے رہے۔ لیکن جمال خاں سب سے بے نیاز پیر صاحب کے رُوبرو سجدے میں پڑا تھا۔ جب پیر صاحب عبادت سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا۔

پیر صاحب: جمال اب کیوں آیا ہے؟

جمال: حضور کائنات کے رازوں کے جاننے والے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ میں کس لیے حاضر ہوا ہوں۔

پیر صاحب: ہم کو افسوس ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔

جمال: پیر صاحب۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ اور اُسے کون لے گیا ہے۔

پیر صاحب: کیا کسی انسان کی یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ناہید کو تمھارے محل سے اس طرح نکال کرلے جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

جمال: جی ہاں مُرشد یہی تو تعجب کی بات ہے۔

پیر صاحب: کیا ناہید جیسی بلند کردار خاتون خود تم کو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔

جمال: جی نہیں۔ وہ دو سال سے آزادی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اگر اُسے جانا ہوتا تو وہ بہت پہلے چلی جاتی۔

پیر صاحب: اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ناہید خود محل سے گئی ہے اور نہ کوئی دوسرا انسان اُس کو لے گیا ہے۔

جمال: جی ہاں حضور۔ اسی بات نے مجھے بھی اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ گئی تو کیسے گئی اور کہاں گئی۔ اب میں آپ کے پاس رہنمائی اور امداد کی خاطر حاضر ہوُا ہوں۔ پیر صاحب خدا کے لیے میری ناہید کو مجھ سے ملا دیجیے۔ ورنہ میں شدّتِ غم سے دیوانہ ہو جاؤں گا۔

پیر صاحب: جمال تمھارا خیال غلط ہے۔ نہ ہم کسی کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں نہ کسی کو ملا سکتے ہیں۔ نہ ہم کسی کو حیات کی نعمت عطا کرنے کے قابل ہیں، اور نہ کسی کو نعمت حیات سے محروم کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس پر بھروسہ کرو۔ جو بچھڑوں کو ملانے والا اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مگر اس کی بارگاہ تک بلا وسیلہ پہنچنا ممکن نہیں۔ پیر صاحب، میں نے آپ کا سہارا لیا ہے۔ میں نے آپ

کے دامن کو پکڑا ہے۔ میں اپنی ناہید کو آپ سے لوں گا۔ ایک مرتبہ آپ نے مسیحائی کر کے اسے موت کے منہ سے نکال لیا اب بھی آپ ہی اسے مجھ سے ملا سکتے ہیں۔ خدا کے لیے بتایئے کہ وہ کہاں ہے اگر ناہید پہاڑوں کی بلندیوں پر ہے تو میں اس کی خاطر بڑے سے بڑے پہاڑ کو راستے سے ہٹا دوں گا۔ اگر وہ کسی جنگل میں ہے تو میں تمام جنگل میں آگ لگا دوں گا۔ اگر وہ کسی دشمن کے پاس ہے تو اس کو خاک و خون میں آلودہ کیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا۔

پیر صاحب : تمہاری ناہید ایک ایسی جگہ ہے جہاں تمہاری دولت تمہاری حکومت، تمہارا اقتدار، تمہارا لاؤ لشکر اور تمہاری تمام دنیاوی طاقتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سُنو، وہ انسانوں کے درمیان نہیں۔

جمال : حضور پھر وہ کہاں ہے ؟

پیر صاحب : ہم نے ابھی اپنے موکلوں سے پوچھا تھا، اُنھوں نے بتایا کہ کل ناہید شام کو نہا کر بال کھولے ہوئے بالاخانہ پر گئی تھی اتفاق سے ادھر سے جنوں کا بادشاہ گزر رہا تھا۔ اس نے ناہید کو دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا وہی رات کو ناہید کو بستر پر سے اٹھا کر لے گیا ہے۔ اور اس وقت ناہید اس کے محل میں آرام کر رہی ہے۔

جمال : پیر صاحب اب آپ ہی میری ناہید کو مجھ سے ملا سکتے ہیں خدا کے لیے مجھے بھی وہاں تک پہنچا دیجیے۔ میں اپنی جان دے دوں گا۔ ہائے میں ناہید کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آخر جمال خاں

نے اپنا سر زمین پر دے مارا اور بیہوش ہوگیا۔ پیر صاحب نے اپنے مریدوں کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے اس کو ایک طرف لٹا دیا۔ اور لخلخہ سنگھایا جمال خاں ہوش میں آگیا۔

پیر صاحب : جمال خاں اس طرح عورتوں کی طرح رونے اور بَین کرنے سے کوئی کام نہ چلے گا۔ صبر سے کام لو۔ ہمت کرو، خدا سے دُعا کرو۔ ممکن ہے وہ تم کو ناہید سے ملا دے۔

جمال : نہیں پیر صاحب میں ابھی اپنی جان دے دوں گا۔ ورنہ آپ وعدہ کیجیے کہ آپ مجھ کو میری ناہید سے ملا دیں گے۔

پیر صاحب : جمال ہم وعدہ نہیں کر سکتے کوشش کرنا ہمارا کام ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر کوئی معمولی پری یا جن ہوتا تو ہم اس کو طابع کرکے حُکم دیتے کہ وہ ناہید کو واپس کر دے۔ لیکن وہ جنوں کا بادشاہ ہے۔ اسے طابع کرنے کے لیے ہم کو بڑی مشقت کرنا پڑے گی اور بہت عرصہ تک چلّہ کشی کرنا پڑے گی۔

جمال : پیر صاحب خدا کے لیے ناہید پر اس کی جوانی پر ترس کھائیے۔ اس کو جنوں کے چنگل سے چھڑا دیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا لیکن آپ کا خادم بن کر زندگی گزار دوں گا۔

پیر صاحب : اچھا تو سُنو۔ اس کے لیے ہم کو چالیس دن کا چلّہ کھینچنا پڑے گا۔ اس عرصہ میں اگر کسی انسان کا سایہ ہم پر پڑ گیا تو سارا عمل ختم ہو جائے گا اور ناہید کی جان اور زیادہ خطرہ میں پڑ جائے

گی۔ ہم کو یہاں سے دُور کسی قصبہ یا دیہات میں ایک خاموش تریں مکان جس کے اردگرد۔ چالیس چالیس گز تک کوئی عمارت نہ ہونی چاہیے اور وہاں سامانِ خورد و نوش بھر دیا جاتے۔ ہم کسی نوکر یا کنیز کو بھی اپنے ہمراہ نہیں رکھ سکتے اور ان تمام باتوں کو صیغۂ راز میں رکھا جائے اگر خدا کی مرضی شامل حال رہی تو ہم ناہید کو شادِ جنات سے چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جمال: مجھے آپ کی تمام شرطیں منظور ہیں۔ آپ یہاں سے دُور منتقل ہو جائیں۔ میں پہرہ لگا دوں گا۔ کہ کوئی آپ تک جانے نہ پائے گا۔ اور آپ آج ہی سے اپنا عمل شروع کر دیجیے۔

پیر صاحب: ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی روانہ ہو جائیں گے۔

باب ۲۴

بیرم خاں ہمایوں کے حضور میں

بیرم خاں اور ابوالقاسم جب کشتی میں بیٹھ کر فرار ہوئے تو رات بھر چلتے رہے۔ دوسرے دن وہ ایک گاؤں میں بھوکے پیاسے تھکن سے چور پہنچے۔ انھوں نے کچھ دیر اس گاؤں میں آرام کیا وہاں سے تیز رفتار گھوڑوں کا انتظام کیا اور سرپٹ بھاگنا شروع کیا۔

اتفاق سے وہ ایک دن رات کو ایک سرائے میں جا کر ٹھہرے سرائے کے مالک کا کوئی دوست بیرم خاں سے واقف تھا۔ اُس نے یہ بات سرائے کے مالک کو بتا دی کہ بیرم خاں افغانوں کا بھیس بدلے ہوئے جا رہا ہے۔ اس کی گرفتاری پر شیر شاہ سوری نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ سرائے والا ایک افغان اور لالچی انسان تھا۔ دونوں دوستوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ بیرم خاں کو پکڑ کر انعام و اکرام حاصل کیا جائے۔ ابھی بیرم خاں اور ابوالقاسم کمریں کھول کر لیٹنے بھی نہ پائے تھے کہ دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کچھ افغانی فوج سرائے کو گھیرے ہوئے ہے تو بیرم خاں نے اپنے دوست ابوالقاسم سے کہا :

بیرم خاں : دیکھا ابوالقاسم، میں نہ کہتا تھا کہ ہم موت سے نہیں بھاگ سکتے۔ اب ان سے جنگ کرنا بیکار ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اظہار حقیقت کر دیا جائے۔

ابوالقاسم : ہاں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

انھوں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ کئی سپاہی اندر پہنچے اور کہا۔ تم کون ہو ؟

بیرم خاں : تم کو اس سے مطلب نہیں۔ تم ہم کو اپنے افسر کے پاس لے چلو۔ چنانچہ یہ لوگ بیرم خاں اور ابوالقاسم کو لے کر افسر کے پاس گئے اور اُس نے ان کو شناخت کر کے آگرہ روانہ کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد بیرم خاں اور ابوالقاسم کو شیر شاہ سوری کے دربار میں پیش کیا گیا۔ یہ وہی دربار تھا جہاں بیرم خاں کے حضور میں شیر خاں اور اس جیسے ہزاروں بلکہ اُس سے کہیں بلند مرتبہ لوگ پیش ہوتے تھے لیکن آج وہ باغی کی حیثیت سے شیر شاہ کے سامنے جواب دہ تھا۔ دربار میں اب بھی ایسے امراء موجود تھے جو بیرم خاں کے زیر بار احسان تھے۔ انھوں نے شہنشاہ شیر شاہ سوری سے سفارش کی۔ شیر شاہ خود بھی اس عظیم انسان کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آیا۔ وہ ایسے جاں نثاروں اور زیرک آدمیوں کی قدر کرتا تھا۔ اس نے دونوں سے خوب بے تکلفانہ گفتگو کی۔ دونوں کو بخش دیا۔ جاگیر بھی بحال کر دی۔ اثناء گفتگو میں شیر شاہ سوری نے کہا۔

شیر شاہ سوری : ہر کہ اخلاص وارد بے وفائی نمی کند

بیرم خاں اس چوٹ کو سمجھ گئے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا۔

بیرم خاں : راست است ہر کہ اخلاص دارد بے وفائی نمی کند۔

دربار سے نکلتے ہی بیرم خاں نے ابوالقاسم سے کہا۔ کہ شیر خاں میری جانب سے بدظن ہیں۔ اس لیے ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ جب تک میں ہمایوں کی محبت میں سرشار ہوں میں بھلا کس طرح کسی دوسرے کی محبت کا عہد کرسکتا ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں پھر گجرات کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی مہینے کی مستقل جدوجہد کے بعد یہ گجرات سے کچھ فاصلہ پر تھے کہ وہاں سے شیر شاہ سوری کا ایک ایلچی واپس آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ کئی سو سوار تھے۔ یہ دونوں بڑے اطمینان سے چلے جا رہے تھے۔ شاہِ گجرات بیرم خاں پر مہربان تھا اور اس کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بیرم خاں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ خوش تھے کہ بالآخر دشمنوں کے پنجے سے نکل بھاگنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔

ایلچی کے چند آدمیوں نے بیرم خاں کو پہچان لیا۔ حالانکہ یہ دونوں بھیس بدل کر سفر کر رہے تھے۔ ایلچی کو معلوم ہُوا تو اُس نے فوراً دونوں آدمیوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ بیرم خاں اور ابوالقاسم تیسری مرتبہ قید کرکے ایلچی کے حضور میں پیش ہوئے۔

ایلچی : (ابوالقاسم سے مخاطب ہوکر) بیرم خاں تم افغانوں سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو، تم نے افغانوں پر بڑے ظلم کیے ہیں اب تم کو اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

ابوالقاسم : یہ غلط ہے۔ میں نے افغانوں پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اگر میں چاہتا تو افغانوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتا اور آج تم جیسے انسان زندہ نہ رہتے۔ مگر میں نے افغان قوم پر رحم و کرم کی بارش کی۔ اُن کو بہ حیثیت قوم کے زندہ رکھا۔ ان کو اعلیٰ منصب اور بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا۔

ایلچی : ہم تمہاری بکواس سُننا پسند نہیں کرتے۔ ہم تم کو شہنشاہ شیرشاہ سوری کے پاس لے جائیں گے۔

ابوالقاسم : میں تیار ہوں۔

بیرم خاں : اے بادشاہ کے سفیر تم غلطی کر رہے ہو۔ بیرم خاں میں ہوں، مجھ سے بات کرو، مجھے قید کرو، مجھے شیرشاہ سوری کے پاس لے چلو۔ یہ آدمی بے گناہ ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔

ابوالقاسم : نہیں، یہ شخص میرا بڑے عرصہ سے ملازم ہے اور بے حد وفادار ہے۔ اس کی بات نہ سُنو، مجھے گرفتار کرکے شیرشاہ سوری کے دربار میں پیش کرکے انعام و اکرام حاصل کرو۔

سفیر : بے شک چہرہ سے تم ہی بیرم خاں معلوم ہوتے ہو۔ (بیرم خاں سے مخاطب ہوتے ہوئے) جا او اجل رسیدہ جا، ہم نے تجھے آزاد کیا۔

بیرم خاں نے جتنی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کی کوشش کی اُتنا ہی سب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہ بیرم خاں نہیں ہیں۔ کیونکہ کوئی جان بوجھ کر موت کو دعوت نہیں دیتا ہے۔ آخر میں وہ ابوالقاسم کی یاد دل میں لیے وہاں سے گجرات پہنچے، گجرات کے حاکم کو جب بیرم خاں کی آمد کا علم ہوا

تو اُس نے بیرم خاں کا بہت شان دار استقبال کیا۔ اور بڑے اصرار کے ساتھ اس کو اپنا مہمان بنایا۔ لیکن بیرم خاں تو اپنے ولی نعمت کے فراق میں تڑپ رہا تھا۔ وہ بھلا کیسے رُکتا۔ اسی اثنا۔ میں حج کا زمانہ آگیا۔ بیرم خاں کو موقع مل گیا۔ اُنھوں نے حاکم گجرات سے حج کرنے کی اجازت مانگی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی بات تھی جس کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ حاکم گجرات مجبور ہوگیا۔ راستے میں اُس نے بہت سے ساتھیوں کو جمع کیا اور ایک جمعیت تیار کرکے اپنے شہنشاہ ہمایوں کی مدد کے لیے روانہ ہوگیا۔

شہنشاہ ہمایوں اُس وقت گجرات کے گرد و نواح میں بھٹک رہے تھے اور اُس کی فوج شاہ حسین سے جنگ میں مصروف تھی۔ بیرم خاں نے دُور سے دیکھا کہ دو فوجیں ایک میدان میں لڑ رہی ہیں۔ جس میں ایک کی تعداد بہت کم اور دوسرے کی زیادہ ہے۔ ایک شکست خوردہ اور دوسری تازہ دم ہے۔ بیرم خاں نے فیصلہ کرلیا کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے جانباز سپاہیوں کو لے کر جیتنے والی فوج پر پُشت کی جانب سے پوری شدّت سے ٹوٹ پڑا۔ شاہ حسین کی فوج اس اچانک حملہ سے گھبرا گئی۔ اور سپاہی میدان چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ادھر شہنشاہ ہمایوں بھی حیران تھے کہ یہ غیبی امداد کہاں سے آگئی۔ تھوڑی دیر میں شہنشاہ ہمایوں کی فوجوں نے بڑھ بڑھ کر حملے کیے اور شاہ حسین کی فوجوں کو بھگا دیا۔

اس جنگ میں شہنشاہ ہمایوں کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ فتح شہنشاہ

کے لیے بہت قیمتی تھی۔ کیونکہ شاہ حسین ہمایوں کے سر کا سودا شیر شاہ سوری سے کر چکا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ بادشاہ نے اپنے محسن کا نام پوچھا۔ معلوم ہوا کہ بیرم خاں دو ہزار سرفروشوں کو لے کر شہنشاہ کی قدم بوسی کے لیے آگئے ہیں۔ یہ سُن کر ہمایوں سجدہ شکر بجالایا اور اُس نے کہا:

"خدایا، تونے مجھے وہ چیز عطا
کردی جو میرے لیے حکومت
سے زیادہ عزیز ہے۔ بیرم خاں
کی وجہ سے ممکن ہے میری کھوئی
ہُوئی حکومت مجھے دوبارہ واپس
مل جائے۔"

اس کے بعد شہنشاہ ہمایوں نے حُکم دیا کہ بیرم خاں کے استقبال کو تمام امراء جائیں اور ہر شخص بیرم خاں کی آمد کی خوشی میں جشن منائے۔ چنانچہ جنگل میں منگل ہوگیا۔ بیرم خاں شہنشاہ ہمایوں کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ہمایوں نے بڑھ کر کلیجے سے لگا لیا اور کہا۔

شہنشاہ ہمایوں: بیرم خاں، تم کو نہیں معلوم کہ تمھارے بغیر ہمارے دل پر کیا کیا صدمے گزر گئے۔ بیرم خاں تم نہ تھے۔ ہم کس سے اپنا دردِ دل کہتے، کس کو اپنی داستانِ مصیبت سُناتے۔ بیرم خاں ہم نے تمھارا کہنا نہ مانا اور حکومت کو کھو دیا۔

بیرم خاں : ظلِ سبحانی جس خدا میں یہ طاقت ہے کہ مردے کو زندہ کر دیتا ہے۔ جو ضعیفوں کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ جس میں یہ قوت ہے کہ اس نے بابر کے بارہ ہزار سواروں کو، افغانوں کے لاکھوں کے لشکر پر فتح یاب کیا، جس نے شیر شاہ سوری جیسے گدائے بے نوا کو صاحب تخت و تاج کر دیا۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ رب العزت آپ کا امتحان لے رہا ہو اور آپ کو اس میں ثابت قدم دیکھ کر دریائے رحمتِ الٰہی میں جوش آ جائے اور وہ آپ کو پھر ہندوستان کا فرماں روا بنا دے۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں، ہماری یہی تمنا ہے۔ آؤ بیٹھو دیکھو، تم سے کتنے عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

بیرم خاں : جی ہاں جہاں پناہ، میں بھی آپ کی جدائی میں مضطرب تھا۔ اور جب میں نے یہ سنا کہ جنگ قنوج اور جنگ چونسہ میں قسمتیں بدل گئیں، تو آپ کی تنہائی اور بے بسی کو دیکھ کر میں خون کے آنسو روتا رہا۔ لیکن مجبور تھا۔ یہ تمام وقت قید میں گزرا، بڑی مشکل سے شیر شاہ سوری کے دربار سے نجات ملی۔ اور ابو القاسم کو بھینٹ چڑھا کر حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو سکا ہوں۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں ہم پر بھی بہت صدمے گزر گئے۔ حکومت گئی۔ دولت گئی، عزت گئی، اقبال رخصت ہوا سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ بڑے بڑے وفادار جن کی وفاداری کی قسمیں کھائی جاتی تھیں، وہ

ہم کو مصیبت میں گھرا ہُوا دیکھ کر ہمارے درپئے آزار ہو گئے۔ بھائیوں نے نہ تاج و تخت کے موقعہ پر آرام سے بیٹھنے دیا نہ آوارہ گردی میں اور عالمِ غربت میں اُن کو کچھ ترس آیا۔ بغاوتوں کا سلسلہ، حکومتوں تک نہیں بلکہ جنگلوں اور بیابانوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ بیرم تم نے دیکھا ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ کیا ہم پھر اسی منزل پر پہنچ سکیں گے۔

بیرم خاں : ظلِ سبحانی، خدا میں بڑی قوت و قدرت ہے۔ ابھی یہ دو بچھڑے ہوئے دوست اپنی دردبھری داستانیں ایک دوسرے کو سُنا رہے تھے کہ ایک سپاہی نے آ کر کہا کہ ظلِ سبحانی افتخار مرزا شرف قدم بوسی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں : بھیج دو۔ بیرم خاں سے مخاطب ہو کر۔ دیکھا بیرم یہ سب تمہارے آنے کی برکت ہے۔ صبح ہم نے ایک ہاری ہُوئی بازی جیت لی۔ اور میدانِ جنگ تمہاری اعانت سے ہمارے ہاتھ رہا۔ اس کے بعد ہم اپنے دوست، یعنی تم سے ملے اور اب افتخار مرزا بھی آ گئے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب میرے مقدر کا ستارہ ضرور بلند ہو گا۔ ورنہ تم اس طرح تین مرتبہ موت کے منہ سے نکل کر میرے پاس نہ آتے۔

اتنی دیر میں افتخار مرزا بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔ شہنشاہ ہمایوں اور بیرم خاں دونوں نے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا اور دونوں بڑی

دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔

شہنشاہ ہمایوں: افتخار تم ہم سے بچھڑ کر کہاں کہاں رہے؟

افتخار مرزا: ظلِ سبحانی مونگیر سے مجھے اور بیرم خاں کو خواص خاں پکڑ کر لے گیا۔ وہ ہم دونوں کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے امراء کے کہنے سننے پر وہ ہم کو حاکم سنبھل اور راجہ ترسین کے حوالے کر کے چلا گیا۔ ان دونوں کو خدا نے ہم پر مہربان رکھا۔ لیکن آپ کی وفاداری اور محبت کا چراغ روشن کر کے ہم کب تک دشمنوں کی ایذا رسانیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ شیر خاں کو اس کا علم ہُوا اور اُس نے راجہ ترسین کو حکم دیا کہ ہمیں دربار میں پیش کرے۔ کیونکہ ہم کو یقین کامل تھا کہ اس مرتبہ ہم موت کو دھوکا نہیں دے سکتے اس لیے ہم راستہ ہی سے فرار ہو گئے۔ ابوالقاسم اور بیرم خاں آپ کی قدم بوسی کے خیال سے ملتان کی طرف روانہ ہُوئے۔ میں سیدھا انجمن آراؔ، ناہید اور گل رُخ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آگرہ چلا گیا۔ آگرہ پہنچ کر میں نے ایک باغ کے ایک کونہ سے اپنا کچھ روپیہ کھود کر نکالا اور اس کو لے کر جمنا کے کنارے ایک معقول جگہ کی تلاش میں پھرتا رہا۔ قسمت نے مجھے ایک بہت اچھی جگہ جمنا کے کنارے پر دے دی۔ میں نے وہاں ایک جھونپڑی بنائی اور اس میں رہنے لگا۔ اتفاق سے ایک درویش کامل ادھر سے گزرا۔ میں نے رو رو کر ساری روئیداد اُس کو سُنائی کہ میں ناہید اور دُوسری خواتین سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تم فقیری اختیار کر لو۔ اس

نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ جگہ جہاں میں نے جھونپڑی تعمیر کی ہے۔ پہلے کسی بہت بڑے درویش کا تکیہ تھا۔ اس کے اندر ایک زمین دوز مکان بھی ہے۔ جہاں دُنیا کی تمام آسائشیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے درویش کی بات مان لی۔ اور اپنی فقیری کے پروپیگنڈے کے لیے دوسو ملازم رکھے۔ جن کا صرف یہ کام تھا کہ شہر کے ناکوں پر ہوٹلوں اور پارکوں، دکانوں وغیرہ پر جا کر ایک درویش کامل کے آگرہ میں آنے کی خبر گوگشت کر دیں۔ ایک مہینے میں وہ تمام غیر آباد علاقہ بس گیا۔ لوگوں نے کشتیوں پر بازار لگائے۔ اور دُنیا کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ہزاروں لوگ مجھ سے ملنے اور مرادیں مانگنے لگے۔ دوسرے مہینے میں میں تمام آگرہ میں مشہور ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق مجھے دیکھنے آرہے تھے۔ اسی طرح گل رُخ اور انجمن آرا مجھے دیکھنے کے لیے آئیں۔ میں نے اُن کو اپنی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور اُن کو اپنے پاس بُلا لیا۔ اس عرصہ میں ناہید سخت بیمار ہو گئی۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ جمال خاں ادھر سے مجبور ہو کر میری طرف متوجہ ہُوا اور میں نے ناہید پر یہ راز افشا کر دیا کہ میں فقیر نہیں بلکہ روشن ضمیر ہوں۔ اس کے بعد میں نے بڑی تدبیروں سے ناہید انجمن آرا اور گل رُخ کو شہر پناہ سے نکال دیا اور جمال خاں کو یہ بتایا کہ ناہید کو جنوں کا سردار اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اس کے لیے مجھے چالیس دن چلّہ کھینچنا پڑے گا مجھے معلوم تھا کہ اب نہ کوئی قافلہ کی تلاشی لے گا اور نہ مجھے تلاش کرے گا۔ اس لیے میں جلد از جلد اس قافلہ سے مل گیا۔ اور گجرات ہوتا ہُوا سندھ میں داخل ہوا۔ ابھی حضور کے کیمپ میں داخل

ہوا ہوں۔

شہنشاہ ہمایوں : افتخار تمھاری روداد بڑی دلچسپ ہے۔ ہم نے بھی تاج و تخت کھونے کے بعد عقل و دل و جان کو بھی کھو دیا۔ ہم تمھارا مذاق اُڑاتے تھے۔ لیکن حمیدہ بانو نے ہماری راتوں کی نیند اور دن کا چین ختم کر دیا ہے۔

بیرم خاں : ظلِ سبحانی یہ حمیدہ بانو بیگم کون ہیں ؟

شہنشاہ : یہ مرزا ہندال کے اتالیق کی لڑکی ہے۔

بیرم خاں : وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اُس کو حضور کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

شہنشاہ ہمایوں : کیا تم کو وہ جانتی ہے۔

بیرم خاں : جی ہاں۔ ظلِ سبحانی بلکہ چچا کہہ کر پکارتی ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : اچھا۔

بیرم خاں : جی ہاں ظلِ سبحانی اس کے والد مجھے ہمیشہ بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔

شہنشاہ ہمایوں : بیرم خاں، ہم نے ہزاروں حسین چہرے دیکھے۔ لیکن ہم پر کسی عورت نے اتنی دیر تک اتنا شدید اثر کبھی نہ کیا تھا۔ ہم نے دلدار بیگم سے پیغام دیا تھا۔ مگر جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

بیرم خاں : کیا ہوا ظلِ سبحانی۔

شہنشاہ ہمایوں : یہاں بھی مرزا ہندال بیچ میں کود پڑا اور کہنے لگا کہ

میں کسی اور کو زبان دے چکا ہوں اس لیے وہ کہہ رہا ہے کہ شہنشاہ ہو کر مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ایسی لڑکی پر نظر ڈالوں جس کو کسی دوسرے سے منسوب کیا جا چکا ہے۔ اور تم جانتے ہو، یہ ہماری کتنی رسوائی اور ذلت کی بات ہے۔ اس کی اس دھمکی کی وجہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں حمیدہ بانو سے دست بردار ہو جاؤں۔ ورنہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

بیرم خاں : کیا ظلِّ سبحانی نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں : ہاں، بیرم خاں دلدار بیگم نے ہماری ضیافت کی تھی۔ اور اسی موقع پر اُنھوں نے میرا تعارف حمیدہ بانو سے کرایا۔ وہ حسن و جوانی، خوبصورتی و شادابی کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔ کاش میں اس کو اپنا بنا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں شدّتِ غم سے دیوانہ ہو جاؤں۔

بیرم خاں : ظلِّ سبحانی، آپ کوئی تردّد نہ کریں، میں مرزا ہندال، دلدار بیگم اور خود حمیدہ بانو سے اس سلسلہ میں گفتگو کر کے معاملات کو راہِ راست پر لے آؤں گا۔

شہنشاہ ہمایوں : ہاں یہ مناسب ہے۔ ہم بھی اس مسئلہ میں علیحدہ ہی رہنا چاہتے ہیں۔

افتخار مرزا : اگر اجازت ہو۔!

شہنشاہ ہمایوں : ارے افتخار، معاف کرنا، ہم تم کو ناہید سے ملنے کی مبارکباد پیش کرنا بھول ہی گئے۔

افتخار مرزا: ظلِ سبحانی، یہ سب آپ کی دعاؤں کا کرشمہ ہے۔

شہنشاہ ہمایوں: جی تو نہیں چاہتا۔ مگر چونکہ تم دونوں تھکے ہوئے ہو اس لیے تم کو اجازت دیتے ہیں کہ جا کر آرام کرو۔ دونوں تسلیم بجا لائے اور شاہی خیمے سے باہر آگئے۔ افتخار مرزا نے بیرم خاں سے کہا۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ انجمن آرا آپ کی منتظر ہے۔

بیرم خاں افتخار مرزا کے ساتھ ایک کشادہ اور بڑے خیمے میں گئے۔ ناہید، گُل رُخ، انجمن آرا نے بڑھ کر بیرم خاں کا استقبال کیا۔

بیرم خاں: خدا کا شکر ہے کہ میں آج تم سب کو پھر ایک جگہ دیکھ رہا ہوں۔

گُل رُخ: جائیے بھائی صاحب آپ تو نرے بھگوڑے نکلے۔ اس غریب انجمن آرا کو مجھ پر ڈال کر چل دیے اور پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔

انجمن آرا نے چپکے سے گُل رُخ کی بوٹی نوچ لی اور اوئی کہہ کر خاموش ہوگئی۔

بیرم خاں: گُل رُخ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم تمھاری امانت کو اپنے ہمراہ نہ لا سکے۔ ابوالقاسم ہم سے راستہ میں بچھڑ گئے۔ دعا کرو کہ وہ ہم سے دوبارہ آکر بخیریت ملیں۔

گُل رُخ: خدا کے لیے صاف صاف بتایئے۔ کہیں اُن کی جان خطرے میں تو نہیں؟

بیرم خاں: ہم تمھارے اور تمھارے ابوالقاسم کے بے حد مشکور ہیں کہ اُس نے ہم کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو مصیبت میں گرفتار کرلیا۔

خدا اُن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

گُل رُخ: میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ مجھے ذرا صاف صاف بتایئے۔

بیرم خاں: میں اور ابوالقاسم ایک مرتبہ قید سے نکل کر بھاگے مگر قسمت نے پھر گرفتار کرا دیا۔ ہم دونوں کو شیر خاں کے حضور میں پیش کیا گیا۔ شیر خاں نے مجھ کو معاف کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ انسان یا تو کسی کا ہو جائے یا اس کو اپنا بنائے اور بے وفائی نہ کرے۔

میں شیر خاں کا مفہوم سمجھ گیا اور کہا۔ آپ نے درست فرمایا۔ اخلاص کے یہی معنی ہیں کہ انسان اپنے محسن سے بے وفائی نہ کرے۔ اس کے بعد میں نے ابوالقاسم سے کہا کہ شیر خاں کو ہم پر اعتماد نہیں۔ اس لیے یہ ہم کو کسی بھی وقت قتل کر سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے بھاگ لیا جائے۔ ہم کئی مہینے تک ادھر اُدھر بھاگتے رہے اور گجرات کے بالکل قریب آ گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک ایلچی نے میرے شبہ میں ابوالقاسم کو گرفتار کر لیا۔ میں نے لاکھ سر پٹکا کہ بیرم خاں میں ہوں۔ یہ ابوالقاسم ہیں۔ لیکن ابوالقاسم یہی کہتے رہے کہ میں بیرم خاں ہوں اور یہ میرا غلام ہے۔ میری جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ابوالقاسم کو بیرم خاں سمجھ کر دوبارہ آگرہ لے گئے ہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ اسے میرے دھوکے میں گرفتار کیا گیا اور یہ کہ اُس نے میرے لیے یہ عظیم قربانی دی۔ کاش میں اُس کے کسی کام آ سکتا۔

گُل رُخ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ناہید انجمن آرا بھی

ابوالقاسم کی بدنصیبی پر رو رہی تھیں۔ آخر میں گل رخ نے کہا۔

گُل رُخ : اب کیا ہم کسی طرح ابوالقاسم کی مدد نہیں کر سکتے۔

بیرم خاں : گُل رُخ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے جس نے دو مرتبہ پہلے مجھے اور ابوالقاسم کو موت کے منہ سے بچایا وہ اس مرتبہ بھی ہماری مدد کرے گا۔ تم اپنا دل قوی رکھو۔ بہت ممکن ہے کہ جب شیر خاں یا اس کے کسی آدمی کو معلوم ہو کہ یہ بیرم خاں نہیں ہے تو ان کو چھوڑ دیا جائے اور وہ یہاں آجائیں۔

افتخار مرزا : کاش مجھے یہ پہلے معلوم ہو جاتا، میں تو آدمی کو پھانسی کے تختے سے اُتارنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اب چالیس دن گزر گئے ہیں۔ اس لیے میری قلعی کھل گئی ہوگی۔ افسوس یہ سب ہی بُرا ہُوا۔

بیرم خاں بڑی دیر تک گُل رُخ کے پاس بیٹھا اُس کو تسلی دیتا رہا۔ بالآخر ناہید، گُل رخ اور افتخار مرزا۔ بیرم خاں اور انجمن آرا کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

بیرم خاں : کیوں انجمن کیسی ہو؟

انجمن آرا : آپ کی بلا سے۔

بیرم خاں : کیا کچھ ناراض ہو۔

انجمن آرا : آپ سے ناراض ہو کر بھی کیا کر سکتی ہوں میں تو اچھی رہی آپ بتایئے آپ کیسے رہے؟

بیرم خاں : تمھاری دُعا سے اچھا رہا۔

انجمن آرا : میری دُعا سے یا موت کی کرپا سے۔

بیرم خاں : موت کی کرپا کیسی؟

انجمن آرا : آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ تین مرتبہ موت کو دھوکا دے دے کر نوک دم بھاگے چلے آ رہے ہیں۔

بیرم خاں : مگر میں تمھاری وجہ سے بہت پریشان تھا۔

انجمن آرا : ہماری کیا پریشانی تھی۔ صرف اتنا ہُوا کہ مولانا شیر شاہ سوری نے برسرِ حکومت آتے ہی مکان، زمین جائداد، جاگیر وغیرہ ضبط کرلی۔ میں اور گُل رُخ بڑے اطمینان سے گاؤں میں چلے گئے اور وہاں بڑے آرام سے گاؤں والوں کے کپڑے سی سی کر عیش کرتے رہے کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ہم کون تھے اور کیا ہیں۔ بلکہ ہم کو اپنی اس حالت میں بڑا لطف آتا۔ ہم سمجھتے کہ ہم غربت کی زیارت کرنے کے لیے یہاں آگئے ہیں۔ اور اور ان دنوں کی یاد کرتے جب دولت ہمارے قدم چومتی تھی۔ اقبال ہمارا غلام تھا۔ لیکن جب ہم نے آپ تینوں کی گرفتاری کا حال سُنا تو ہم کو سخت پریشانی ہُوئی۔ لیکن سوائے دُعا کے ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ لیکن جب ہم کو معلوم ہُوا کہ آگرہ میں ایک بڑا خدا رسیدہ درویش آیا ہُوا ہے تو ہم بھی گاؤں سے آپ لوگوں کی خیریت دریافت کرنے آگرہ میں آئے۔ وہ درویش اتفاق سے افتخار مرزا نکلے۔ اس کے بعد کے واقعات آپ کے علم میں آچکے ہیں۔

بیرم خاں : انجمن تم نے واقعی بڑی تکلیفیں اُٹھائیں۔

انجمن آرا : آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں گویا اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ وہ تو ایک انقلاب کا نتیجہ تھا۔ ایک قوم نے دوسری قوم کو شکست دی۔ بہت سی اوپر کی چیزیں نیچے اور نیچے کی چیزیں اوپر آگئیں۔ کیا شہنشاہ ہمایوں نے تکلیفیں نہیں برداشت کیں۔ کیا آپ تینوں نے تکلیفیں نہیں برداشت کیں۔ کیا آپ اب بھی تکلیفیں نہیں اُٹھا رہے ہیں۔ کیا آپ کے بدلے میں شیر خاں، جمال خاں، جلال خاں جیسے ٹکے کے آدمی جھونپڑوں سے محلوں کی زینت بنے ہُوئے نہیں۔

بیرم خاں : انجمن آرا تم سچ کہتی ہو۔ واقعی یہ عظیم انقلاب تھا۔

انجمن آرا : میرے لیے یہی کیا کم خُوشی کی بات ہے کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد آپ میرے سامنے ٹھیک بیٹھے ہیں۔

بیرم خاں : انجمن جب سے تم کو دیکھا ہے دل پارہ پارہ ہو چکا ہے، اس لیے ٹھیک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انجمن آرا : آخر اس درد کی دوا بھی ہے یا نہیں۔

بیرم خاں : ہاں "درد می دارد و درماں نیز ہم"

انجمن آرا اور بیرم خاں بہت دیر تک حسن و عشق کی دل فریب رعنائیوں میں کھوئے رہے۔ آخر بیرم خاں مردانے میں چلے گئے ناہید اور گل رُخ نے انجمن آرا کو پھر گھیر لیا۔

دوسرے دن بیرم خاں نے دلدار بیگم، مرزا ہندال اور خود حمیدہ بانو سے ملاقات کی۔ یہ سب بیرم خاں کا بہت احترام کرتے تھے۔

ان کے جانے سے دلدار بیگم نے حامی بھر لی اور مرزا ہندال بھی خاموش ہو گئے
حمیدہ بانو نے کہا :

"اب تک میں یہ سمجھتی تھی کہ میں
بے باپ کی ہوں لیکن آپ کے
آنے کے بعد میرے بیچ میں بولنے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ
میرے مختار ہیں۔ جو مناسب سمجھیں
کریں"

بیرم خاں نے یہ خوش خبری شہنشاہ ہمایوں کو سنائی کہ دلدار بیگم، حمیدہ بیگم اور مرزا ہندال سب اس رشتہ کے لیے تیار ہو گئے ہیں شہنشاہ اس سے بہت خوش ہوئے۔ اس دن شام کو دلدار بیگم اور مرزا ہندال شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں نے بادشاہ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور ان کی درخواست کو قبول کر لیا۔

حمیدہ بانو جن کی قسمت میں آگے چل کر اکبر اعظم جیسے عظیم انسان کی ماں بننا تھا خود بھی اس رشتہ سے بہت خوش تھیں۔ وہ ابھی اس آنے والے دلچسپ حادثات پر غور کر رہی تھیں کہ گل رخ، انجمن آرا اور ناہید نے اچانک اس حسینہ کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔

گل رخ : انجمن آرا دیکھو، یہ حمیدہ بانو، کتنی بھولی بھالی لڑکی ہے۔

ناہید : بالکل تمھاری طرح۔

انجمن آرا: اتنی بھولی ہے کہ شہنشاہوں پر اپنے تیر چلاتی ہے۔ اُن پر حکومت کرتی ہے۔ وہ کام جو شیر خاں کی فوجیں نہ کر سکیں۔ وہ اس غریب و مسکین کی نگاہیں کرنے میں مشغول ہیں۔ شہنشاہ ہمایوں بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ لیکن اس بھولی بھالی معصوم بچی کو دیکھ کر خود ہی شکست کھا کر بیٹھ گئے۔

یہ سب لڑکیاں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ ہر چہرہ سُرخ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کا سارا حسن و خوبصورتی، ایک مقام پر اکٹھا ہو گئی ہے۔

حمیدہ بانو اپنی نئی سہیلیوں سے مل کر بہت خُوش ہُوئیں۔ خصوصاً انجمن آرا کا ایک ایک فقرہ اس کے دل میں کھب گیا۔ جب حمیدہ بانو پر ہنسی کا دورہ پڑا، تو انجمن آرا نے کہا۔

انجمن آرا: حمیدہ اپنا یہ مسکراہٹوں کا خزانہ ذرا سنبھال کر رکھو۔ اس کو اپنے شہنشاہ پر تصدق کر دینا۔ یہاں کیوں ضائع کر رہی ہو۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہُوا۔ ابھی یہ قہقہے بلند ہو رہے تھے کہ یہ خبر گشت کر گئی کہ رات کو ظلِ سبحانی کے خیمے میں سب امراء اور منصب داروں کی دعوت ہے۔ انجمن آرا نے اس بات پر حمیدہ کو اتنا گُدگدایا اور اتنا چھیڑا کہ اس کے آنسو نکل آئے شام تک یہ لوگ حمیدہ بیگم کو دلہن بناتے بیٹھے رہے۔ رات کو شاہی خیمے سجائے گئے۔ اس میں نئے نئے قالین اور نئی نئی مسندیں لگائی گئیں۔ امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ نئے لباس میں آئیں۔ رات

ہوئی۔ تمام جنگل جگمگا گیا۔ چمکتے ہوئے چہرے، دمکتے ہوئے ہتھیار، خوش نما لباس۔ دیدہ زیب شیشہ آلات۔ جگمگاتا ہوا ہال، پھولوں اور خوشبویات کی کثرت، حسین ناچنے اور گانے والیوں کا اژدھام، خوبصورت کنیزوں، باندیوں کے پہرے، غرض کہ ایک عجیب کیفیت اور عالم نور طاری تھا۔ ہر شخص اس امید میں آرہا تھا کہ شہنشاہ ہمایوں کی شادی ہے۔

اچانک نقارہ پر چوب پڑی۔ شہنشاہ آئے اور مسند پر بیٹھ گئے۔ شہنشاہ نے حکم دیا قاضی کو بلایا جائے۔ قاضی حاضر ہوئے۔

شہنشاہ ہمایوں : دوستو، آپ کو معلوم ہے کہ مجھے بیرم خاں سے اپنے سگے بھائیوں سے زیادہ اُنس و محبت ہے۔ مجھے آج سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ میرے درد کا شریک میرا دوست بیرم خاں عرصہ کی جُدائی کے بعد مجھ سے مل گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس محفل کی مسرت میں کچھ اور اضافہ کروں۔ میں اس سلسلہ میں بیرم خاں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ مسند پر آئیں۔

بیرم خاں مسند پر آکر بیٹھ گئے۔ اسی طرح بادشاہ نے افتخار کو بھی بلا کر مسند پر بٹھایا اور کہا :

ان دونوں نے ہماری محبت میں بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ مسرت پہنچائیں۔ قاضی صاحب افتخار کا نکاح ناہید کے ساتھ پڑھایئے۔ اور بیرم خاں کا نکاح انجمن آرا سے پڑھا دیجیے۔

قاضی نے حسب الحکم نکاح پڑھائے۔ اس کے بعد شہنشاہ کا نکاح حمیدہ بانو بیگم سے ہُوا۔ گو یہ عالم غربت تھا۔ لیکن مسرت افتخار مرزا، بیرم خاں اور ناہید وانجمن آرا کے چہرہ سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد شہنشاہ نے خود انجمن آرا اور ناہید کی جانب سے افتخار مرزا اور بیرم خاں کو جہیز دیا اور اپنی بساط سے زیادہ مسرت منائی۔

آج سب خوش تھے۔ ہر جگہ مسرت وشادمانی تھی لیکن ایک گل رُخ ایسی تھی جو ابوالقاسم کا انتظار کر رہی تھی۔

بیرم خاں نے کچھ دنوں کے بعد شہنشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ایران چلیں اور وہاں سے مدد لے کر وہ دوبارہ ہندوستان کو فتح کریں۔ بیرم خاں نے کہا حضور کب تک اپنے بھائیوں اور امراء کو آزماتے رہیں گے۔ یہ کبھی راہِ راست پر نہ آئیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ایران چلیے۔ یہ وہ زرین مشورہ تھا جس نے تاریخ ہندوستان کو بدل دیا۔ یہی وہ مشورہ تھا جس کی بنا پر ہمایوں دوبارہ ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کا احسان ساری دُنیا پر تھا۔ لیکن جس شخص نے سلطنتِ مغلیہ پر احسان کیا وہ بیرم خاں تھا۔

شہنشاہ ہمایوں نے بیرم خاں کا مشورہ قبول کر لیا۔ اور یہ قافلہ ہندوستان کے ریگ زاروں کو چھوڑ کر ایران کے سبزہ زاروں میں کھو گیا۔